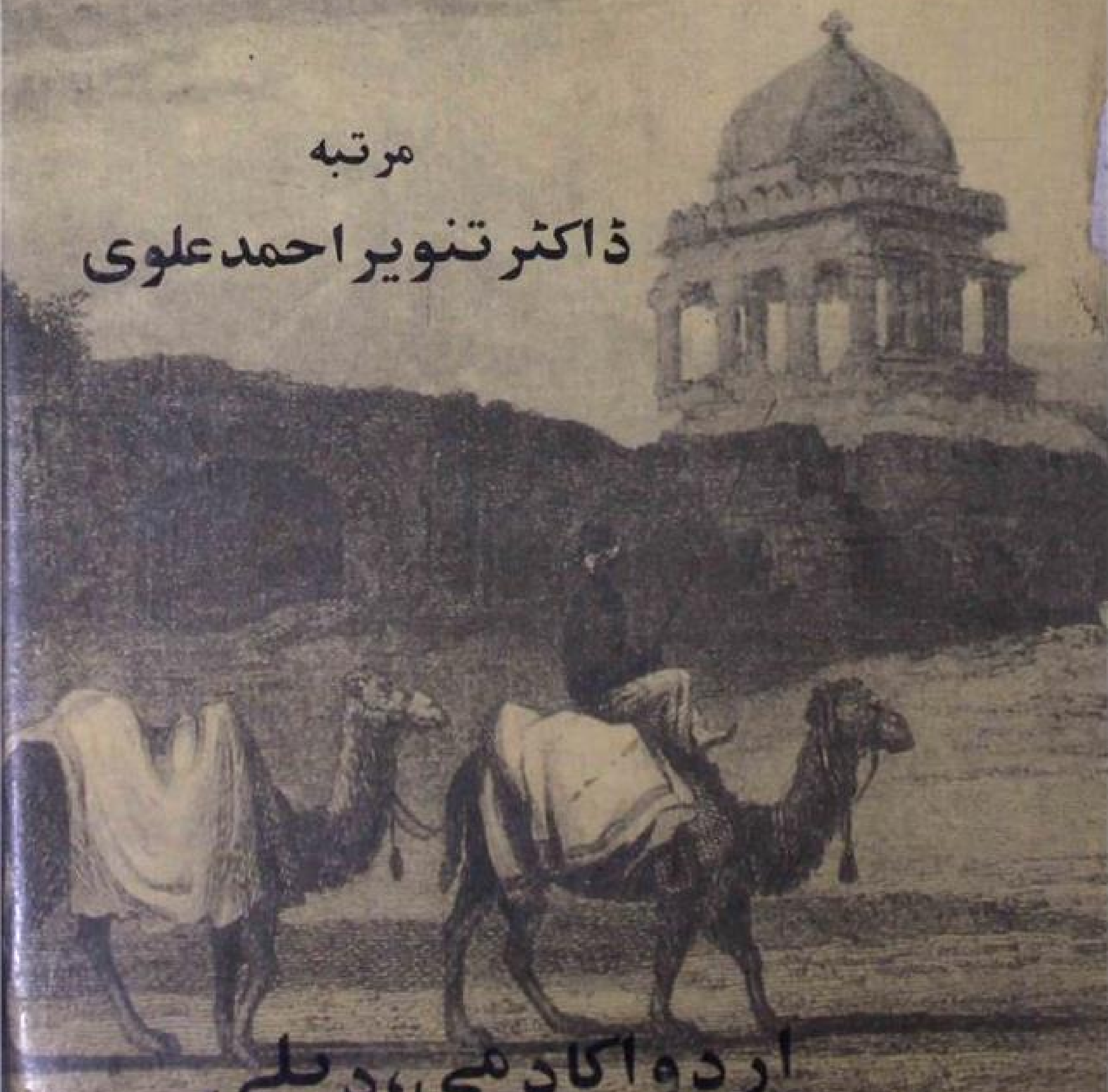
سفرناموں میں دہلی

(جلد اول)

مرتبہ

ڈاکٹر تنویر احمد علوی



اردو اکادمی، دہلی

سفرناموں میں دہلی

جلد اوّل

مرتبہ

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

اردو اکادمی دہلی

سلسلۂ مطبوعات اردو اکادمی دہلی ۔۸

SAFAR NAMON MIEN DELHI
EDITED BY - DR. TANVEER AHMED ALVI
PUBLISHED BY - URDU ACADEMY, DELHI
PRINT - 1994
PRICE - RS. 90.00

سنہ اشاعت : ۱۹۹۴ء
قیمت : ۹۰ روپے مکمل سیٹ (دو جلدوں میں)
طباعت : سیما آفسیٹ پریس، دہلی
ناشر و تقسیم کار : اردو اکادمی، دہلی۔ گھٹا مسجد روڈ۔ دریا گنج۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

ISBN 81-7121-092-9 VOL. I

نگارشات

جلد اوّل

حرفِ آغاز

● ہندوستان کے مختلف صوبوں میں قائم اردو اکادمیوں میں دلی کی اردو اکادمی اسی لیے زیادہ ہی زیرِ بحث رہتی ہے کہ وہ دارالخلافہ دلی میں سرگرمِ عمل ہے اور ایک طرح سے ایک ماڈل کے طور پر کام کرنے کی کوشش میں لگی ہے۔ اس اکادمی کا دائرۂ کار خاصہ متنوع اور وسیع ہے۔ اس کے بنیادی مقاصد میں دلی شہر کی ادبی تاریخ کے احوال کو، اس کی ثقافتی اور سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر میسر اور دستیاب تاریخی اور دستاویزی مواد کو مرتب کرنے اور اسے کتابی صورت میں محفوظ کرنے کی سرگرمی خاص طور سے شامل ہے۔

اردو اکادمی کا اپنا ایک انتظامی ڈھانچہ اور دستور بھی ہے۔ دلی کے لیفٹننٹ گورنر اس کے چیئرمین ہیں جو زبان و ادب میں اعتبار کے درجے کو پہنچے ہوئے اصحاب کو اکادمی کی گورننگ کونسل کے لیے نامزد کرتے ہیں۔ انہی نامزد افراد پر مشتمل اکادمی کی مختلف کمیٹیاں ہیں جو متعلقہ امور کے بارے میں فیصلے کرتی ہیں۔

اکادمی، دلی کی ادبی، ثقافتی اور سماجی زندگی سے اپنی گہری دلچسپی کے ساتھ مُلک گیر زاویے سے بھی کام کرتی ہے اور اپنی مختلف سرگرمیوں میں پُوری اردو دنیا اور تخلیق کاروں سے اپنا قریبی رشتہ اور تعلق قائم رکھتی ہے۔

کُل ہند نوعیت کے مشاعرے، سمینار، انعام واعزاز اور "ایوانِ اردو" اور "امنگ" جیسے مقبول ماہ ناموں اور اہم عصری موضوعات پر کتابوں کی مسلسل اشاعت نے دلی کی اردو اکادمی کو زبان و ادب کی ترویج میں مصروف ایک بے حد فعال اور متحرک اکادمی بنادیا ہے۔

• اَن جانے راستوں پر چلنے اور اَن جانی سمتوں میں جاکر انسانی زندگی کی مختلف جہتوں اور کروٹوں سے آشنائی حاصل کرنے کے لیے، سفر پر نکلنا انسان کا مقدر کل بھی تھا اور آج بھی ہے، پوسے نیئس اگر اپنے سفر کے حوالے سے (۱۷۶-۱۴۳ء) یونان کے کھنڈر دریافت نہ کرتا تو دنیا ایک عجیب غریب انسانی تہذیب کے آثاروں سے محروم رہ جاتی۔ پرانے وقتوں میں نادیدہ جہتوں کی دریافت نہ ہوئی ہوتی تو تاریخ اور جغرافیہ کے اوراق نئی آبادیوں کے نقشوں کا آنے والے انسان کو پتہ نہ دیتے، سفر نہ ہوتے۔ راستوں کی خاک نہ اڑتی، کھلے سمندروں میں کشتیوں کے بادبان نہ کھلتے، جنگلوں اور بیابانوں میں ہاتھی، اونٹ اور گھوڑے نہ دوڑائے جاتے تو ہماری آج کی تاریخ کتنی مختلف ہوتی۔ قدیم زمانے میں انسان مختلف ثقافتی منطقوں میں بٹا ہوا کہاں کس مقام اور کس خطہ ارض میں کیا کچھ تھا اس کا پتہ ہمیں کبھی نہ ملتا اگر بطلیموس نے "رہنمائے جغرافیہ" کتاب نہ لکھی ہوتی، انسان نے ذائقے اور خوشبو کا راستہ SPICE TRADE ROUTE نہ دریافت کیا ہوتا، المسعودی (ابوالحسن علی المسعودی) نے تیس جلدوں میں "اخبار الزمان" اور اس کا خلاصہ "مروج الذہاب و معادن الجواہر (سونے کی تلاش کے راستے اور جواہر کے معدن) نہ لکھا ہوتا، دسویں صدی عیسوی تک کے سفرنامے جسے عربوں نے ملاحی ادب کا نام دیا مہم جوئی، جگر کاوی، حوصلہ مندی اور نڈر اور عزم کے ساتھ نئی دُنیاؤں اور نئے تہذیبی منطقوں کی تلاش کرنے سے عبارت تھے مگر گیارہویں صدی ایک انقلابی صدی تھی کہ اس صدی کو ایک ایسے عہد آفریں سفرنامے کے لکھنے والے سیاح کا انتظار تھا جس کا نام البیرونی تھا۔ البیرونی کا سفرنامہ زمانہ قدیم کا ایک بے حد مستند تاریخی اور تمدنی دستاویز ہے۔ یورپ میں سفر کی پہلی جرأت ہسپانوی علاقے میں پیدا ہونے والے الادریسی نے کی تھی جسے جاپان کے ساحلوں کی بے تاب موجوں کو اپنے اجنبی ہاتھوں سے چھوتے ہوئے ایک عجیب سرخوشی کا احساس ہوا تھا اور پھر مارکوپولو کی آمد ہوئی جس نے ایشیا کی پہنائیوں تک کا سفر کیا یورپ والے اسے اپنے وقت کا سب سے بڑا کذاب سمجھتے رہے لیکن یہ مارکوپولو کا سفرنامہ ہی تھا جس کو سامنے رکھ کر دنیا کے نقشے بنائے گئے اور کولمبس نے ایک نئی دُنیا دریافت کی۔ مارکوپولو کے بعد دوسرا اہم نام ابن بطوطہ کا ہے جس نے پچھتر ہزار میل کا سفر طے کیا اور دنیا کے سیاحتی ادب میں اس کا سفرنامہ بھی مارکوپولو کے سفرنامے کی طرح

ایک سنگِ میل بن گیا۔ ہندوستان کا ماضی اور اس کا جلال وجمال بہت کچھ ابن بطوطہ کے سفرنامے کے حوالے سے ہماری آنکھوں میں مجسم ہو جاتا ہے۔

یہ انکشاف یا اعتراف سفرناموں کے قارئین کے لیے دلچسپ ہے کہ دُنیا کا بہترین سیاحتی ادب جسے عربوں نے ملاحی ادب کا نام دیا ہے وہ زیادہ تر عربوں کے سفرناموں سے مالامال ہے کہ اجنبی سرزمینوں کی طرف کوچ کرنا عربوں کی سائیکی کا حصہ تھا کیوں کہ انھوں نے بار بار یہ ارشادِ ربی سُنا تھا۔

"ہم نے ان کے درمیان اور ان بستیوں کے درمیان جن کو ہم نے برکت دی تھی بہت بستیاں آباد کردی تھیں جو ایک دوسرے کے سامنے اور قریب قریب تھیں اور ہم نے ایک بستی سے دوسری بستی تک کے سفر کو چھوٹا کر دیا تھا اور کہا تھا کہ راتوں کو بھی اور دن کو بھی ان میں امن کے ساتھ سفر کرو۔"

دُنیا کے نقشے پر دلّی ایسی ہی ایک بستی تھی جس کی کھوج کرنے جس کے ثروت مند ثقافتی اور تاریخی ورثے کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا ارمان ہر سیّاح کے دل میں رہا۔ کل کا سفر بھی انسان اسی لیے کرتا تھا کہ وہ اپنے تہذیبی منطقے اور حصار سے نکل کر ایک دوسرے تہذیبی منطقے میں قدم رکھتا تھا اور تب وہ حیران رہ جاتا تھا اور ہر طرف نئے نئے جہانوں کے در باز کرتے ہوئے اپنے سفر کی روداد قلم بند کرتا جاتا تھا یہ سوچ کر کہ جب وہ گھر لوٹے گا' اپنے دیس لوٹے گا تو کسی برگد، الاؤ یا چوپال پر بیٹھ کر اپنے سفر کے حیرت ناک واقعات سُنائے گا۔

سفرناموں میں آنکھ محض سامنے پیش آنے والے واقعات کو دیکھتی اور اُن کا جُوں کا تُوں بیان نہیں کرتی۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر سفرنامے قدیم یا جدید زمانے کے معتبر اور مستند حوالے نہ بنتے۔ سفرنامہ منظر بھی بیان کرتا ہے اور پس منظر بھی اور ان سب کی بشارت بھی جو ابھی ظاہر نہیں ہے صرف مخفی ہے پوشیدہ ہے۔

"سفرناموں میں دلّی" برسوں پرانی دلّی کی کھوج، تلاش اور اس کے دھندلے خدوخال کو اُجاگر کرنے کی بھرپور کوشش ہے کہ ماضی میں سفر معلومات کے حاصل کرنے کے لیے کیا جاتا تھا اور آج سفر کے لیے پہلے سے معلومات حاصل کرلی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے سفرناموں اور اس کتاب کے حوالے سے دلّی کی کوئی مربوط تہذیبی

تاریخ مرتب نہیں کی انھوں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ عہدِ تغلق سے عہدِ ظفر تک دلّی کو سیاحوں نے جس رنگ میں جس حالت میں جس آن بان اور جلال وجمال کے عالم میں دیکھا وہ ہمارے آنکھوں میں بھی عکس بن کر تیرنے لگے دلّی نے پچھلی چھ سات صدیوں میں کیا کیا انقلابات دیکھے کس کروفر اور عروج وزوال کے شب وروز اس پر گذرے وہ کافی کچھ ان دو جلدوں میں سمٹ آیا ہے۔

اُمید ہے اردو اکادمی کی یہ پیش کش پسند کی جائے گی اور دلّی کے سات آٹھ سو برس پُرانے ماضی کا ایک مستند تاریخی حوالہ ثابت ہوگی۔

زبیر رضوی
سکریٹری

حضرتِ دہلی کنشتِ دین و داد
جنّتِ عدنست کو آباد باد

نقشِ نیم رُخ

تہذیبی تاریخ کی داستان بھی کچھ عجیب ہے بلکہ یہ کہیے کہ عجیب تر ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ شہروں کی تاریخ اپنے ادواری فروغ اور توسیعی معنویت کے ساتھ اکثر ملکوں سے بڑی ہوتی ہے اور اسی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو گاہ گاہ افراد کے کارنامے جماعتوں کی کارکردگی پر تفوّق رکھتے ہیں۔

جماعتی قوت عصری تقاضوں کے زیر اثر اور نئی جہتوں کے تعیّن کے ساتھ قومی زندگی کے دھاروں کا بہت کچھ رُخ بدل سکتی ہے لیکن بیشتر ایسی کسی قوت یا قوتوں کا اجتماع قوموں کی تاریخ اور ان کی زندگی کی اجتماعی ہیئت میں عظیم انقلاب کا باعث بن جاتا ہے۔ بعض شہروں نے اپنی حیاتِ عمرانی کے تاریخی سفر اور تدریجی ارتقاء میں نموپذیر عناصر کو زمانہ بہ زمانہ کچھ اس طرح اپنے اندر جذب کیا کہ اُن کے تغیرات اور تاریخی سفر کا منظرنامہ روشنی کے سفر کی کہانی سناتا ہوا نظر آتا ہے۔ شہرِ دہلی مشرق کے ایسے ہی شہروں میں سے ہے۔

دلّی کی تاریخ کئی صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں ایسی بھی کچھ صدیاں شریک ہیں جن کی تاریخ مرتّب نہیں کی جاسکتی۔ اس کی محرابِ زندگی دھنک کے نیم دائرے کی طرح رنگارنگ حلقوں کی کمانیں کھینچتی ہوئی افق تا بہ افق آگے بڑھتی ہیں۔

ایک تمدنی صداقت کو دوسری تہذیبی سچائی سے الگ کرکے دیکھنا مشکل ہوتا ہے اگرچہ دونوں میں رنگ اور فکری آہنگ کا اختلاف ضرور ہوتا ہے۔ اور اسی سے اعتباری دائرے بنتے اور اپنے امتیاز کو قائم کرتے ہیں۔ یہ عمل ان آبی دائروں سے قدرے مختلف ہوتا ہے جو ایک نقطے سے پیدا ہوتے ہیں مگر ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر سفر کرتے ہیں۔ ان میں رفتار اور سمت کا تعین تو ہو سکتا ہے لیکن ہم قدمی کا ان کے عمل کے ساتھ کوئی تصور نہیں ابھرتا۔ جب کہ تہذیبی لہریں ایک دوسرے کے ساتھ بھی سفر کرتی ہیں۔ اور گنگا جمنا کے دھارے کی طرح ایک دوسرے سے الگ بھی بہتی رہتی ہیں۔

دہلی کی تہذیب کے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا یہ تاجروں کا شہر بھی تھا۔ علماء کا مرکز بھی۔ اور صدیوں تک صوفیوں کا مرجع بھی رہا۔ صنعت کار، تجارت پیشہ بھی اس کی شہری زندگی کا ایک حصہ رہے اور انہیں کے ساتھ وہ لوگ بھی جو سپاہی پیشہ تھے اور ان سپاہیوں میں ایک بڑی تعداد تو اہیروں، جاٹوں، گوجروں اور دوسرے ایسے طبقات کی تھی جن کا پیشہ کشا ورزی بھی رہا اور شمشیر زنی بھی۔ دوسری طرف وہ ترک تاتار ایرانی و تورانی امراء اور لشکری تھے جو تلواریں چلاتے اور خنجر آزمائی کرتے ہوئے یہاں آتے تھے اور پھر اسی کی تہذیب اور شہریت کا ایک حصہ بن جاتے تھے۔

صوفیوں کے حوالہ سے دہلی بائیس خواجاؤں کی چوکھٹ کہلاتی ہے اسی نسبت سے دہلی کے قدیم زمانے میں بائیس دروازے بھی تھے جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ دہلی سے ہر سمت بلکہ بہت سی سمتوں میں سفر کیا جا سکتا ہے۔ دہلی ہندوستان کا دل بھی تھا اور دوسرے علاقوں پر دل ہی کی طرح یہاں کے بادشاہ حکومت کرتے تھے۔ جب ہم دہلی کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو بے اختیار غالب کا یہ شعر یاد آجاتا ہے۔

محفلیں درہم کرے ہے۔ گنجفہ بازِ خیال
ہیں ورق گردانی نیرنگِ یک بتخانہ ہم

اندر پرستھا کی صورت میں جو دلّی کبھی جمنا کے کنارے آباد تھی۔ اس کے نقوش

...نار اب بھی خال خال کہیں مل جاتے ہیں۔ لیکن قدیم زمانے کا آہنی ستون اور ...قوت الاسلام کا قدیم تعمیری نقش شمالی ہندوستان کے ماضی سے دلّی کے ناقابلِ شکست رشتوں کی بھیدوں بھری علامت کے طور پر ہنوز موجود ہے۔

قُطب مینار سے لے کر کوٹلہ فروز شاہ کے بالائی حصار پر نصب سنگین لاٹ تک تاریخ کے معلوم و نامعلوم سلسلوں کی طرف اشارہ سنج حقائق ہیں یہ ستون اس کی تاریخی بلندیوں کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں اور ان زندہ حقیقتوں کی طرف بھی، یہ جن کے امین ہیں۔ یہاں کی خانقاہیں، مسجدیں، مدرسے، محلات اور حویلیاں اپنے گنبدوں اپنی محرابوں اپنے ستونوں اور اپنے کتبوں کے ساتھ تاریخ کے منقش اوراق ہیں۔ وہ سنگین اوراق جو تہذیبی سچائیوں کے پھول سے زیادہ نازک پرتوں کی نشاندہی کرتے ہیں — اس خاک کے ذروں میں جو کچھ مدفون ہے اس کو تو صرف خیال کی آنکھیں ہی دیکھ سکتی ہیں۔ حال کی نگاہیں نہیں۔

مولانا الطاف حسین حالیؔ نے دہلی کے لیے کہا تھا ؎

چپہ چپہ پہ ہیں یاں گوہرِ یکتاں تہِ خاک　　دفن ہوگا کہیں ایسا خزانہ ہرگز

یہ دیرینہ بستی کبھی جنگی قلعوں اور شاندار محلات کی صورت میں آباد تھی۔ اس کی دیرینہ 'روایت' آگے بڑھی تو شہر کھنڈر بن گئے اور سنگین حصاروں میں پیدا ہو گئے۔ بلند دیواریں سرنگوں ہو گئیں اور، وہ وقت بھی آیا کہ ادھر سے ادھر تک قدیم دلّی سنگ و خشت کے ڈھیروں میں بدل گئی لیکن اس کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا کہ خزاں کی آمد بہاروں کی آمد کا پیش خیمہ ثابت ہوتی تھی۔ دہلی اجڑتی بھی رہی اور بستی بھی رہی۔ رائے پتھورا کی دلی سے لے کر شاہ جہاں کی دلی تک جس کو جہان آباد بھی کہا جاتا تھا (اور اہلِ دکن جسے "ہندوستان" کہہ کر یاد کیا کرتے تھے) اور پھر شاہِ عالم کی اجڑی ہوئی دہلی سے لے کر انگریزوں کے زمانے کی 'نوآباد' --- دلّی تک اس شہر کی تاریخ اس کی تہذیب و روایت کا ایک طرف صحیفۂ زریں ہے تو دوسری طرف حرف و حکایات کا ایک "دفترِ پارینہ"۔

اس کی خانقاہیں، اس کے روحانی افکار و اقدار کا سرچشمہ رہیں۔ اس کے مدرسے اس کی علمی روایت کے امین بنے رہے تو دوسری طرف اس کے دیوان خانے اس کی حویلیاں اور اس کی تکیہ گاہیں اس کے اربابِ فن کی صحبتوں اور جلسہ گاہوں کی "عہد بہ عہد" یاد تازہ کرتی رہیں۔ حضرت قطب الدین بختیارؒ کاکی کے مزارِ پُرانوار سے لے کر بڑ شاہ بولا تک دہلی عشق و عقیدت کی ایک ریشمی لڑی میں پروئی ہوئی تہذیب و ثقافت کا نمونہ معلوم ہوتی ہے۔ قلعۂ مبارک اجڑتے اجڑتے بھی چراغِ علم و فن کا محافظ بنا رہا۔

شاہِ عالم کی دلی اپنے اثر و اقتدار کے اعتبار سے تو پالم تک ختم ہو جاتی تھی لیکن اس کی پر عظمت روایت کا احترام سندھ سے لکھنوتی اور کشمیر سے کرناٹک تک ہوتا تھا۔ حالیؔ نے "یادگارِ غالب" کے آغاز میں لکھا ہے کہ "تیرھویں صدی ہجری میں جب مسلمانوں کا تنزل اپنی انتہا کو پہنچ رہا تھا جاہ ثروت کے ساتھ ان کی بڑی تہذیبی روایت کے سائے بھی سمٹ رہے تھے تو حسنِ اتفاق سے دہلی میں ایسے صاحبانِ کمال جمع ہو گئے تھے جن کے جلسوں کو دیکھ کر عہدِ اکبری اور شاہجہانی کے جلسے یاد آجاتے تھے۔

دہلی کی تاریخ اس کی ثقافتی روایت اس کے ایسے نقوش و آثار میں بھی موجود ہے جنکا تعلق سنگ و خشت سے ہے۔ پتھروں کے سینوں کے ماسوا جہاں ہم اسے مرتسم و منقوش دیکھتے ہیں۔ وہاں زبان و ادب کے سفینوں میں بھی اس کی تاریخ اپنے اوراقِ مصوّر کے ساتھ آج بھی چشمِ عالم کو آئینہ دکھاتی ہے۔

ان اوراق میں جو اس وقت آپ کے پیشِ نظر ہیں دہلی کی تہذیب اور روایت کی وہ کہانی پیش کی جا رہی ہے جو اس کے سفرناموں اور اس کی سیاحت کے افسانوں میں ملتی ہے۔ یہ سفرنامے بھی چھ سات صدیوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ پہلا سفرنامہ جو ان اوراق میں پیش کیا جا رہا ہے وہ ابن بطوطہ کے سفرنامے سے ماخوذ ہے اور محمد بن تغلق کے زمانے کی یادگار ہے۔

غرض کہ یہ کوئی مربوط تہذیبی تاریخ نہیں ہے لیکن ان پرچھائیوں اور جھلکیوں کے ذریعہ بھی ہم کچھ وقت کے لیے اُس زمانہ زندگی میں سفر کر سکتے ہیں اور اس شہر دہلی کو دیکھ سکتے ہیں جیسے ان مسافران ہند اور مہمانِ دہلی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

یہ دہلی کی کلچرل لائف کے کچھ ایسے مرقعہ MINATURE ہیں جو تاریخ کا ایک قابلِ ذکر اور لائقِ توجہ حصّہ ہے۔

سفرناموں کا یہ سلسلہ ابن بطوطہ سے شروع ہوتا ہے جو مغربِ اقصیٰ سے آنے والا ایک سیّاح تھا۔ مسالک ابصار مصنّف خود کبھی ہندوستان نہیں آیا اس نے ہمارے اس ملک اور شہر دہلی سے متعلق معلومات و تاثرات کو سیّاحوں کی زبان یا پھر ان کے سیر ناموں سے اخذ کیا۔ عہد شاہ جہانی دور اورنگ زیب اور محمد شاہ بادشاہِ دہلی شاہ عالم ثانی اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کے زمانہ سے متعلق کئی سفرنامے ہیں جن میں بر نیر، مَنُوچی، ٹو نیر اور "ٹیونگ" کے سفرناموں کو یہاں پیش کیا گیا ہے۔

"ٹیونگ" کے سفرنامہ سے متعلق ڈاکٹر محمد عمر کا مضمون شامل ہے خود یہ سفرنامہ نہیں۔ بعد کے سفرناموں میں عبدالقادر چیف رامپوری اور محتشم الدولہ نواب عبدالغفور آف جاورا کا سفرنامہ ہے۔ جنھیں قدرے اختصار کے ساتھ ان صفحات میں شامل کیا گیا ہے۔

عہدِ محمد شاہی کا سفرنامہ مرقع دہلی ہے۔ جو نواب درگاہ قلی خاں سالار جنگ اوّل کی تابیف ہے۔ راقم الحروف نے اب سے تقریباً بیس برس پہلے اس کے ایک بڑے حصّے کا ترجمہ کیا تھا۔ جس کے ایک قابلِ لحاظ حصّے کو شاہ جہاں آباد نمبر دہلی کالج اردو میگزین میں چھاپ دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ جامعہ میں بھی چھپا تھا اب اس کا مکمل ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

قدیم دلّی کے حالات بہت سی تاریخوں میں ملتے ہیں لیکن جہاں تک سفرناموں کا تعلق ہے یہ دو سفر نامے اس دور کی دلّی کا ایک جیتا جاگتا عکس اور متحرک تصویر پیش کرتا ہے۔ مغل دور کے سفرناموں میں منوچی برنیرؔ ٹیورنیر مغرب کے سیّاح ہیں آگے چل کر ٹاؤ ننگ یا ٹیونگ کو بھی اسی زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ نواب درگاہ قلی خان عہد محمد شاہ میں آئے جب کہ برنیرؔ منوچی اور ٹیورنیرؔ کے یہاں اورنگ زیب کی دلی کا حال موجود ہے۔ ٹیونگ عہدِ شاہ عالم ثانی میں آیا تھا عبدالقادر جیف رامپوری اور نواب عبدالغفور آف جاورا، اس کے بعد اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کے عہد میں آئے۔

ضمنی طور پر اس میں اس ذکر کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے جو میر شیر علی افسوس پرسی وِل اسپیر اور سی ایف اینڈریوز کی تحریروں میں ملتا ہے۔ کتاب کی ابتدا میں راقم الحروف کا ایک حقیر مضمون دہلی کی تہذیبی تاریخ سے متعلق ہے۔ ایک اور مضمون بھی اس کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ یہ سیّد زاہد علی کے نشانِ قلم کا نتیجہ ہے اس میں منوچی برنیر اور بعض دوسرے مغربی سیاحوں کی تحریروں اور ان کی تاریخی نوعیت پر گفتگو کی گئی ہے، ٹیونگ کے سفرنامے سے متعلق تاثرات ڈاکٹر محمد عمر کے ترتیب دیئے ہوئے ہیں۔ ان مضامین کو شاہ جہاں آباد نمبر دہلی کالج اردو میگزین کے صفحات سے اخذ کیا گیا ہے اسے راقم الحروف نے ہی مرتب کیا تھا۔ اور سیّد ضمیر حسن دہلوی نے اس کی ترتیب میں خصوصی معاونت کی تھی۔

دہلی کے ان سفرناموں میں جو یہاں دو جلدوں میں پیش کیے جا رہے ہیں دہلی کا جو حال درج ہے وہ اس کی مکمل تاریخ نہیں ہے۔ لیکن اس شہر کی شاندار تاریخ کے کچھ ایسے حصّے اور موڑ ضرور ہیں جن کے بغیر اس کی تاریخ کو مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ آخری مضمون ظفر الحسن صاحب کے کتابچہ سے ماخوذ ہے جو قلعہ مبارک کے محلات باغات اور دوسرے سلسلۂ عمارات کے تعارف کے ضمن میں ایک رہنما روشنی کی حیثیت رکھتا ہے۔

شروع کے دو مضمون تعارفی ہیں ایک راقم الحروف کا نوشت نامہ ہے جس میں دہلی کی تہذیب و تاریخ کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے دوسرا مضمون سید زاہد علی کا ہے اس میں منوچی اور برنیر کے سفرناموں سے متعلق تنقیدی تعارف نامہ پیش کیا گیا ہے۔

راقم الحروف نے ان مضامین کو جمع بھی کیا ہے بعض کا ترجمہ یا کسی ترجمے کی تلخیص کا کام بھی انجام دیا ہے اور بعض مضامین کو ایڈٹ کیا ہے ان میں جیسا کہ آپ دیکھیں گے بعض ترجموں کے ساتھ حواشی بھی درج کیے گئے ہیں۔

یہ حاشیے خصوصیت کے ساتھ عبدالقادر چیف رامپوری کے سفرنامے سے متعلق ہیں اور اسی کے ترجمے کے ذیل میں ان کو سپرد قلم کیا گیا ہے۔ علم و عمل کے نام سے یہ ترجمہ کراچی سے شائع ہوا ہے اس میں بہت اخذ و انتخاب سے کام لینا پڑا ہے۔

قارئین کی سہولیت کے پیشِ نظر تاریخی سفرناموں میں دہلی کے ذکر کو دو جلدوں میں پیش کیا جا رہا ہے۔

تنویر احمد علوی

دہلی

تاریخ و تہذیب کی ایک حسین دھنک

شاہجہاں آباد (جس کا نام رفتہ رفتہ جہاں آباد ہوا اور پھر اس کے قدیم نام دہلی یا دہلو کی مناسبت سے اسے دلّی کہا جانے لگا) ایک عظیم تاریخی ارتقا کی یادگار اور ایک بے حد پُرتمول —— تہذیبی ورثہ کا نشانِ ذی شان تھا۔ اس کے پُرشکوہ گنبد، پُرعظمت مینار، شان دار مسجدیں، خوب صورت مندر، حسین حویلیاں، پُررونق بازار، "اوراقِ مصوّر" بنے ہوئے گلی کوچے۔ علم و فن کی روایتوں کے امین مدرسے اور پُرتقدیس خانقاہیں اس تمدنی مزاج اور تہذیبی روایت کا عکس پیش کرتے تھے جس نے اس کی محرابِ زندگی کو قوسِ قزح کے نیم دائرہ کی طرح ہفت رنگ بنا دیا تھا۔

مہذب انسانوں کی طرح ہر تہذیبی شہر کا بھی ایک مزاجِ زندگی بن جاتا ہے جس کا تعلق صدیوں کے بخشے ہوئے تمدنی شعور اور نسلوں کے اپنائے ہوئے ذہنی رویوں سے ہوتا ہے۔ شاہجہاں آباد کو جس قطعہ زمین پر بنایا اور بسایا گیا وہ اس سرزمین ہی کا ایک حصّہ تھا جہاں ہندوستان کے وسطی عہد کی تاریخ میں جنم لینے والے تہذیبی انقلاب نے اپنی نموپذیری اور شگفتگی کے بہت سے مراحل طے کیے تھے۔

مہرولی سے لے کر جمنا کے کنارے بسی ہوئی دلّی تک یہ علاقہ وہ خطہ زمین ہے جہاں ارضیاتی طور پر اگر ایک طرف عظیم ہمالیائی اور اراولی پہاڑیوں کے سلسلے ملتے ہیں تو دوسری طرف تہذیبی اعتبار سے یہاں راجستھانی، میواتی ہریانوی، برج اور کھڑی بولیاں —— باہمی طور پر ملتی اور مختلف اوقات میں ایک دوسرے کو متاثر کرتی نظر آتی ہیں۔

ہندوستان کا کوئی دوسرا شہر اس طرح بولیوں اور ان کے ساتھ تہذیبوں کا ایک فطری

"سنگم" بنا، نظر نہیں آتا شاید تہذیبی سطح پر اشتراک و ہم آہنگی کے ایک بڑے مرکز کے روپ میں فروغ پانا اور ہندوستان کی تمدنی تاریخ کے بڑے نقشے میں دھنک کے سے یہ رنگ بھرنا اسی سرزمین کا مقسوم تھا جس کے لیے، ایک کے بعد دوسرا بستا ہوا شہر، اور دریا کی لہروں کی طرح آگے بڑھتا ہوا سلسلۂ آبادی ایک وسیلہ بن گیا۔

"دہلی سے دلّی تک" مختلف ناموں سے آباد ہونے والے شاہی شہر اپنے تاریخی تناظر اور تہذیبی رشتوں کے اعتبار سے، ایک دوسرے سے گہرے طور پر وابستہ تھے۔ ان کی تمدنی روح اور تہذیبی روایت، ایک تھی [اور ایک ہے]۔ ماضی و موجود کے درمیان ثقافتی رشتوں کو سنگ وخشت سے بنی دیواریں اور دائرے تقسیم کر بھی نہیں سکتے۔ دہلی کی سرزمین سے وابستہ تاریخ کی، سب سے عجیب اور نمایاں نشانی، وہ فولادی ستون ہے جو مسجد قوت الاسلام کے صحن میں ایستادہ ہے اور ہستنا پور کے ...... ایک راجہ نے حضرت مسیح سے تقریباً ایک ہزار سال قبل یہاں نصب کرایا تھا۔[1]

دہلی کی سرزمین پر پانڈوؤں کی راجدھانی "اندر پرستھا" موجود تھی۔ پانڈوؤں نے ہند کی قدیم تاریخ میں اپنے سپاہیانہ کردار، خدمت و خلوص اور قربانی و ایثار کی جو مثال پیش کی ہے اس نے عظیم مہابھارت اور دوسری کتھاؤں اور کہانیوں کے وسیلے سے صدیوں تک ان کی یاد اور اس دیس کی تہذیبی روح کو زندہ رکھا ہے۔ عہد وسطیٰ کے شروع میں "تومر" راجپوت دہلی میں کافی دنوں تک راج کرتے رہے (دہلی) یا "ڈھلو" انہی کا دیا ہوا قدیم نام ہے جو آج تک چلا آتا ہے۔ اس خاندان کا آخری حکمراں پرتھوی راج تھوڑے ہی دنوں حکومت کر سکا مگر تاریخ میں اپنا نام اور دہلی کی سرزمین پر اپنی کچھ انمٹ یادگاریں چھوڑ گیا۔

خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

وسطی عہد میں دہلی کی تاریخ مسلمانوں کے دور حکمرانی کی تاریخ ہے جسے ہم دہلی کی ثقافتی زندگی کا "سنہری دور" کہہ سکتے ہیں۔ اس وقت کی دلّی اپنی شان و شکوہ اور تہذیبی و تمدنی

---

[1] ملاحظہ ہو آثار الصنادید: صفحہ ۱۴۹

امتیازات کی وجہ سے قرطبہ، قیرواں، بغداد قاہرہ، قسطنطنیہ اور سمرقند و بخارا پر بھی فوقیت رکھتی تھی اور بڑے احترام کے ساتھ اسے حضرتِ دہلی کہا جاتا تھا۔

دہلی کے نئے مسلمان حکمراں زیادہ تر آریائی نسلوں سے تعلق رکھتے تھے اور اس طور پر ان کی قافلہ در قافلہ ہندوستان میں آمد اس سرزمین پر آریاؤں کی آمد کی تاریخ اور اس کی تمدنی فتوحات کو دہرا رہی تھی۔ اس کے خوش آئند ثمرات کو آج کی زندگی میں بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ شمالی ہند کی نئی زبانیں MODERN INDIAN LANGUAGES اسی دور میں نشو و نما پاتی ہیں اور ان کے فروغ میں نئے حکمراں طبقہ کی تہذیبی رواداری، فراخدلانہ سرپرستی کے ان تمدنی اثرات کو بیش از بیش دخل ہے جس نے ان بولیوں کو نیا رنگ اور نیا آہنگ دیا۔ ان کی جرأت آزمائی و کشور کشائی، قلعہ شکنی و تیغ زنی کی داستانیں تاریخ کے صفحات میں موجود ہیں۔ لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس متحرک و متحارب گروہ کی حوصلہ مندیوں نے جہاں تاتاریوں کے خوفناک حملوں اور ان کے غارت گرانہ ارادوں سے ہندوستان کی سرزمین کو بچایا وہاں وسط ہند کے پہاڑی سلسلوں، گھنے جنگلوں اور مغربی ہند کے ریگستانی علاقوں سے آگے بڑھ کر شمالی ہند کے لیے جنوبی ہند کے متمول و متمدن علاقے کے دروازے بھی کھول دیے۔ اور تیرہ چودہ سو برس کے بعد یہ ممکن ہو سکا کہ شمال اور جنوب ایک ہو جائیں صدیوں کی قائم کردہ دیواریں گر جائیں اور ایک خطہ کے تاجر، سیاح، صناع دستکار، صوفی عالم اور مبلغ بڑے پیمانہ پر ادھر سے اُدھر آجا سکیں۔ دکن میں بولی جانے والی ہندوستانی زبان یعنی دکھنی اسی دور کی دین ہے۔

شہر دہلی کے مختلف دروازوں سے جو سڑکیں ملک کے دوسرے حصّوں کو جاتی تھیں ان پر سایہ دار درخت لگائے گئے تھے۔ ابن بطوطہ کی روایت کے مطابق محمد بن تغلق کے زمانے میں دہلی سے دیوگیر جانے والی سڑک پر ایسے گنجان اور سایہ دار درخت تھے کہ باغ کا گمان ہوتا تھا۔"

دہلی سلطنت کے ایسے تعمیری و تہذیبی اقدامات نے ایک نئے شہری انقلاب کو جنم دیا۔ جس کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے۔

"راجپوتوں کے زمانے میں، شہری زندگی کی تنظیم میں ذات پات کے تصورات کو بڑا دخل تھا۔ اعلیٰ ذات کے لوگوں کے سوا کسی کو شہر کی چاردیواری کے اندر رہنے کی اجازت نہ تھی۔ نیچے طبقے کے لوگ شہر کے باہر رہتے تھے۔ ترکوں کے تسلط کے بعد شہروں کا نقشہ ایک دم سے بدلنے لگا۔ شہر کے دروازے کھول دیے گئے اور اعلیٰ وادنیٰ ہر طبقہ کے مکانات پہلو بہ پہلو نظر آنے لگے۔ پروفیسر مجیب نے اس تبدیلی کو شہری انقلاب سے تعبیر کیا ہے۔"[1]

اس شہری انقلاب میں ایک اور بڑے عنصر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور وہ ہے تاتاری حملوں اور وسط ایشیا کی عظیم الشان سلطنتوں اور تہذیبی مرکزوں کی تباہی کے باعث، عرب وعجم، خراسان، بخارا اور چین کے بے شمار عالموں، تاجروں، صنعت کاروں کے ساتھ ارباب سیف وقلم کا دہلی میں اجتماع۔ اس زمانے میں ایشیا کا شاید ہی کوئی ایسا شہر ہو جس میں اتنے مختلف ملکوں کی علیحدہ علیحدہ آبادیاں ہوں جیسی دہلی میں تھیں۔ اس کے عظیم حکمرانوں نے ان مختلف عناصر کو شہر اور شہری تہذیب کے فروغ کے لیے کام میں لانے کی سعی کی۔ شمس الدین التمش اور علاؤالدین کا نام اس ضمن میں خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ مگر دربار کے حلقۂ تسخیر سے زیادہ یہ کام مدرسوں اور بالخصوص خانقاہوں کے دائرہ اثر میں ہوا۔ انھوں نے طبقاتی تقسیم اور رنگوں کے اختلافات کو درمیان سے ہٹاتے ہوئے ذہنوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے اور دلوں کو محبت وخلوص کے رشتے میں جوڑنے کی سعی مشکور کی اور یہ حالت ہوئی۔

دلِ شکستہ دراں کوچہ می کنند درست
چنانکہ خود نشناسی کہ از کجا بشکست

حضرت نظام الدین اولیا محبوب الٰہی کی شخصیت اس عہد کے صوفیانہ نظام میں "آفتاب تازہ" کی سی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ تمام انسانوں کو "خدا کا کنبہ" سمجھتے تھے اور یہ چاہتے تھے

---

[1] اوراق مصور: ۱۹

کہ عقائد و نظریات کے اختلافات انسانی برادری کے مشترک رشتے پر اثر انداز نہ ہوں۔ مذہبی معاملات میں حضرت کی رواداری اور حقیقت شناسی کا کچھ اندازہ اس مشہور روایت سے بھی ہوتا ہے کہ ایک روز حضرت والا جماعت خانہ کی چھت پر ٹہل رہے تھے صبح کا وقت تھا اور اہل ہنود اپنے عقیدہ کے مطابق نکلتے ہوئے سورج کی پوجا کر رہے تھے۔ حضرت نے اسے دیکھا تو بے اختیار یہ مصرع زبان حق ترجمان سے ادا ہوا۔

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

حضرت امیر خسرو حاضر خدمت تھے فوراً ہی مصرع ثانی نذر کیا۔

من قبلہ راست کردم برطرف کج کلاہے

یہ دونوں مصرعے اس عہد کی تاریخ میں ایک نئی تہذیب کی نمود اور نئے شعور زندگی کے طلوع کی طرف اشارہ کرتے اور اس تمدنی مزاج کا پتہ دیتے ہیں جو اپنے سے مختلف تہذیبی قدروں اور مذہبی عقیدوں کی قدر شناسی کی اہلیت رکھتا ہے۔ پروفیسر حبیب نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ حضرت کی خانقاہ میں اور اس سے باہر بھی ہندوی بھاشا میں ایسے گیت گائے جاتے تھے جس میں سری کرشن کی عشق آفریں شخصیت کو وجود باری کی علامت قرار دیا گیا تھا اور حضرت نے اپنے ایک مقرب بارگاہ اور مرید خاص کو یہ کام سپرد کیا تھا کہ وہ ہندی بھاشا میں عشق و تصوف کے مضامین پر مشتمل اشعار لکھیں [1]

ممکن ہے یہ مقرب اور ممتاز مرید حضرت امیر خسرو ہوں جن کا تہذیبی شعور اور فنی طریق رسائی تمدنی اشتراک اور شہری ہم آہنگی کا ایک بے مثال مرقع ہے۔ حضرت امیر کو ہندوستان سے، اس کے موسموں سے، اس کی نسلی اور تہذیبی رنگارنگی سے، اس کے پرندوں، پھولوں اور پھلوں سے۔ اس کے عوام اور خواص سے اور سب سے زیادہ دہلوی زبان اور ہندوی بولی ٹھولی سے غیر معمولی عشق تھا۔ وہ ہندوستانی موسیقی میں کئی ایک نئی راگ راگنیوں کے موجد سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے عوامی گیت کہہ مکرنیاں، ڈھکوسلے اور دو سخنے صدیوں کا سفر طے کرتے

---

[1] علی گڑھ تاریخ ادب اردو: ٦٦

ہوئے دلوں کی چاہ اور زبان کی راہ سے ہم تک پہنچے ہیں۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے حضرت امیر کی وسیع المشربی پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

"انھوں نے نہ صرف ہندو مذہب کو سمجھنے کی ہمدردانہ کوشش کی ہے، بلکہ تمام مذہبی تعصبات اور تنگ نظری سے بالاتر ہو کر اسلام اور ہندو مذہب میں مشترک عناصر کی تلاش پر بھی زور دیا ہے۔ حقیقت میں امیر خسرو کے یہ افکار و نظریات معاصر صوفیوں کے طریقہ کار کی صدائے بازگشت ہیں۔"[1]

"ہم دلی" پیدا کرنے کے لیے ہم زبانی ضروری تھی' اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ اس عہد کے مسلمان صوفی اور اہل تدریس بزرگ' مقامی زبانیں سیکھ رہے ہیں اور علاقائی تہذیب اور اس کی ترجمانی کرنے والی لوک کتھاؤں سے اپنا ذہنی رشتہ جوڑ رہے ہیں اور ایک وسیع تر تہذیبی اشتراک کی بنیادوں کو استوار کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ پنجابی، کھڑی، اودھی، برج بھاشا اور دکھنی زبانوں اور بولیوں کی ارتقا میں مسلمان صوفیوں اور ان کے ساتھ میل جول رکھنے والے سنتوں نے جو تاریخی کردار ادا کیا ہے اس مُلک تہذیبی تاریخ کے مطالعہ میں اسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

خانقاہوں کے مقابلے میں' دربار کی حکمت عملی اگرچہ اقتدار پسندانہ تھی اور اس کے پس منظر میں توسیع کی خواہش کارفرما رہتی تھی لیکن انہوں نے مذہب کے محدود تصور کے ساتھ نظام حکومت چلانے کی کوشش نہیں کی اور علاؤالدین نے تو قاضی مغیث الدین کے ساتھ اپنی گفتگو میں مذہب کو نظام ریاست و سیاست سے الگ رکھنے کی بات کھل کر کہہ دی[2]۔ شاہی دارالضرب میں سونے کے سکے عرصے تک اسی طرح بنتے رہے جیسے راجپوتوں کے عہد میں بنتے تھے۔ اس عہد کے ایک سکے "دلّی دال" پر، جو بلبن کے زمانہ تک رائج رہا شیوجی اور ان کے بیل 'نندی' کی خود سلطان شہاب الدین (محمد غوری) کے عہد کے سکوں پر لکشمی کی مورتی منقش ہوتی تھی

---

[1] اوراق مصور : ۴۲-۴۳

[2] ملاحظہ ہو اوراق مصور : ۳۸

یہ ان فاتح حکمرانوں کی زندگی میں رواداری کے عنصر کی ایک نمایاں علامت ہے۔ اس عہد کے بعض حکمراں مسلمانوں کے محلات میں انسانوں اور جانوروں کی تصویروں کی موجودگی جس طرف اہل تاریخ نے اشارہ کیا ہے[1]۔ اس "تہذیبی رویہ" کی نشان دہی کرتی ہے جو فن کی قدر افزائی اور مرتبہ شناسی کو مذہبی جذبات و معتقدات سے الگ رکھنا چاہتا تھا۔

جنگیں ہوئیں اور ہوتی رہیں۔ اس نوع کی سیاسی کش مکش اور عسکری مہمیں شاید اس دور میں ناگزیر تھیں لیکن بات یہیں ختم ہوگئی ہو ایسا نہیں ہے پروفیسر مجیب نے اپنے مضمون QUTAB COMPLEX AS A SOCIAL DOCUMENT میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے[2]۔

WHILE THE WRITTEN RECORD OF HISTORY SHOWS THE ESTABLISHMENT OF AUTHORITY BY FORCE AND BLOODSHED WE HAVE IN THE ARCHITECTURAL RECORD IMPEACHABLE EVIDENCE OF UNDERTANDING AND CO-OPERATION OF TOYFUL PARTICIPATION IN CREATIVE WORK OF THE HIGHEST QUALITY.

اس کی وضاحت پروفیسر نظامی کے ان الفاظ میں بھی موجود ہے۔ "حوضِ شمسی اور قطب مینار محض تعمیری کارنامے نہیں تھے جن میں ہندو اور مسلمان دونوں معماروں نے حصّہ لیا تھا بلکہ یہ ایک نئے سیاسی اور تمدنی دور کے آغاز کا اعلان تھے جن کا مقصد ایک وسیع تہذیبی ڈھانچہ کی بنیادیں استوار کر کے ایک کل ہند نظام کے لیے راستہ تیار کرنا تھا[3]

پروفیسر محمد مجیب نے ایسے کئی تعمیری نقوش کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جو تہذیبی اشتراک کے ساتھ روحانی ارتباط کے بھی مظہر ہیں۔ چنانچہ موصوف نے ان عمارتوں کے

---

[1] اوراقِ مصوّر

[2] ISLAMIC INFLUENCE IN INDIAN SOCIETY

[3] اوراق مصوّر: ۳۸

ہندو معماروں کے ذہنی مطالعہ کو پیش کرتے ہوئے لکھا گیا ہے۔

THE HINDI SCULPTURE DID NOT KNOW ANY THING ABOUT THE DOCTRINE OF REVELATION, HE KNEW ONLY ABOUT THE NATURE AND INSTICTIVELY HE HAS REPRESENTED THE QURAN AS AN UTTERANCE OF NATURE. THE VOICE OF LIVES AND FLOWERS THE WHISPER OF THE WOOD.

مسجد اور مندر میں معبود کا تصور ایک نہیں ہوتا لیکن عبادت کا مقصد بہر حال ایک ہوتا ہے۔ مسجد کی محراب اور مندر کے دروازہ پر سجدہ ریزی کرنے والے کی نگاہ میں ایک ایسا روشن ہالہ ضرور ہوتا ہے جو اسے روحانی مسرتوں کی ایک لامحدود فضا کی طرف لے جاتا ہے۔

چنانچہ مسجد قوت الاسلام کے علاقائی دروازے کی محراب پر گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر مجیب نے لکھا ہے۔

ONE WOULD HAVE LOOK UP THROUGH THE CENTRAL ARCH INTO A SHADOW INTERIOR AND FELT AT PASSING THROUGH IT ONE WOULD ENTER THE WORLD OF THE SPIRIT OF THE CALM QUITE CONTEMPTATION OF THE DIVINE.

اس کے پیچھے معنی بینی اور حق اندیشی کے وہ محرکات کارفرما ہیں جو تمدنی اشتراک کو جنم دیتے ہیں جس کا ثبوت دوسرے تاریخی حقائق سے نمایاں طور پر فراہم ہوتا ہے۔

مسلمان امراء، ہندو امراء کی بیٹیوں سے شادیاں کرتے ہیں اور ہولی دیوالی جیسے ہندو تہوار شاہی محلات میں بھی منائے جاتے ہیں۔

ISLAMIC INFLUENCE IN INDIAN SOCIETY

لے ISLAMIC INFLUENCE OF INDIAN SOCIETY

صوفیوں کی طرح بعض مسلم سلاطین بھی ہندو اور جین سادھوؤں سے مذہبی و تہذیبی مسائل پر آزادانہ گفتگوئیں کرتے تھے۔ پروفیسر خلیق نظامی نے لکھا ہے۔

محمد بن تغلق جوگیوں اور جین عالموں سے گھنٹوں تخلیے میں گفتگو کرتا تھا۔ جینا پربھا سوری سے رات کے بارہ بجے تک بات چیت ہوتی رہتی تھی۔ اس کے دربار میں عربی فارسی اور ہندی کے ایک ہزار شاعر تھے۔[1]

دہلی کے بادشاہوں کی نیکی اور رعایا پروری کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ ان بادشاہوں کے مقابر سے برسوں تک عوام اپنی عقیدت کا اظہار کرتے رہے علاؤالدین کے مزار پر لوگ منت کا دھاگہ باندھنے لگے تھے۔ رضیہ کے مزار کے ساتھ بھی عقیدت کا یہی رنگ تھا اور "سلطان غازی" کے مقبرے پر تو خود راقم الحروف نے عوام کو چڑھاوا چڑھاتے دیکھا ہے۔

صوفیوں کے روحانی طریق کار کا اس سے پیشتر ذکر آچکا ہے ان میں سے بعض حلقے اپنی ظاہری حیثیت کے اعتبار سے بھی ہندوستانی سادھوؤں کے رنگ میں رنگ گئے تھے۔ چنانچہ اس زمانہ میں ایک سلسلہ حیدری صوفیوں کا تھا اس کے بانی سید ابوبکر حیدری قلندری تھے یہ لوگ گردن میں لوہے کی زنجیریں اور ہاتھوں میں لوہے کے کڑے پہنے رہتے تھے۔ ایک اور سلسلہ "اسحاقیہ" تھا جس کے پیرو زرد کپڑے پہنتے تھے اور اسی رنگ کے زرد جھنڈے ہاتھوں میں لے کر چلتے تھے۔

سیدوں اور لودیوں کا عہد ایسے سلاطین کا عہد ہے جو مذہب کے معاملات و مسائل سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں لیکن ان ہی کے عہد میں بھگتی تحریک اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ پھیلتی ہے اور مذہب رسمی حد بندیوں کو توڑتی نظر آتی ہے ان کے دور میں اس تحریک کا فروغ اس امر کا ثبوت ثابت ہے کہ یہ بادشاہ کس حد تک مذہبی رواداری کے قائل تھے، ان نئی مذہبی اور تہذیبی تحریکوں میں ہر طبقہ کے لوگ حصہ لیتے تھے۔

چیتنیہ گرونانک کبیر داس کے نام سے، تعلیم یافتہ ہندوستانی واقف ہے۔ لیکن اس

---

[1] اوراق مصور: ۳۸

دور میں اور بہت سے ایسے مذہبی رہنما ہوئے ہیں جن کے نام زبان زد عام ہیں۔ مثلاً دھنا جاٹ تھا۔ رائے داس چمار تھا۔ حسین ایک نائی تھا اور ایک بنیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کسی فرقہ کا بانی تھا۔ پروفیسر حبیب نے ان سنتوں کی تعلیمات پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ان کے مُرید ہندو اور مسلمان دونوں تھے مگر وہ ان دونوں کے مذہبی شعائر کو نہیں مانتے تھے۔ ان کے نزدیک صرف وہی چیزیں قابل قبول تھیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں میں مشترک تھیں۔ یہ رہنما مسلم صوفیوں کی اصطلاحوں سے خوب واقف تھے اور ان اصطلاحوں کو ان کے سنسکرت کے معنیٰ الفاظ کے ساتھ اپنی شاعری میں آزادی سے استعمال کرتے تھے۔"

پندرھویں اور سولہویں صدی کے ان بزرگوں کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام مذہبی حد بندیاں اور اختلاف ختم کر دیے جائیں۔ مذہب اور ذات پات کے عائد کیے ہوئے سب قید و بند توڑ دیے جائیں۔ سارے ہندوستانیوں بلکہ ساری انسانیت کا خدا ایک ہے۔"[۱]

وحدت الوجود — اس عہد کا ایک اہم روحانی اور تہذیبی مرکزِ فکر ہے۔ حضرت شاہ العالمین شاہ عبدالرزاق علوی القادری اس دور کے ایک مشہور صوفی بزرگ ہیں اور حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور شیخ سلیم چشتی کے معاصر۔ ان کے ملفوظات اور "تصرفات" میں جگہ جگہ اس نقطۂ فکر کی شرح ملتی ہے ایک موقعہ پر حضرت نے اس پر والہانہ انداز میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے۔

آسمان خدا ہے زمین خدا ہے آتش خدا ہے وہی ہے جس نے افراد موجودات میں سے ایک ایک کی شکل میں ظہور فرمایا ہے اور وہی ہے جس کے نورِ ظہور کا یہ عالم ہے کہ وہ کسی شے سے مخفی نہیں — اور اس پر بھی وہ اس طرح چھپا ہوا ہے کہ اس کی ایک بات بھی ظاہر نہیں۔[۲]

---

[۱] حضرت نظام الدین اولیاء

[۲] صحیفۂ ابرار:

حضرت ہمہ " اوست " کے قایل تھے اور ہر شے میں اس کا جلوہ دیکھتے تھے اس کا ایک نہایت دلچسپ پہلو وہ زاویہ نگاہ ہے جس پر ان الفاظ سے روشنی پڑتی ہے۔

بعض ولایتیں ایسی بھی ہیں جہاں وہ مناظر جو یہاں فحشیات کے دائرے میں آتے ہیں اور فسق و فجور سے تعلق رکھتے ہیں، وہاں خدا کی پرستش کے موقعہ پر کام آتے ہیں۔ اور انہیں کلمات عقیدت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔[1]

اس کے یہ معنی ہوئے کہ کوئی بات ایسی نہیں ہے جسے بے حقیقت کہا جا سکے۔ اور کوئی رسم بھی ایسی نہیں جسے اسمائے الٰہی سے جدا کیا جا سکے.....[2]

دہلی سلطنت کی سیاسی کمزوری کے زمانہ میں دوسرے ریاستی مرکزوں اور مقامی حکومتوں میں یہ دہلوی روایت پروان چڑھتی رہی اور ہندوستان گیر ہوتی گئی۔ جون پور، برہان پور، احمد آباد، شادی آباد مانڈو اور دوسری علاقائی راجدھانیوں نے مرکز سے علیحدگی اور سیاسی آزادی کے باوجود خود کو ان رشتوں کا پابند سمجھا۔ اور اس سلسلے میں اپنی بساط کے مطابق بہت کچھ کیا۔ عظیم مغل سلطنت کا بانی تو ظہیر الدین محمد بابر تھا لیکن اسے استحکام، اکبر اعظم کے ہاتھوں نصیب ہوا جو امر کوٹ میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے سیاسی اقتدار کی کہانی ہندوستان کی تاریخ میں جتنی اہم ہے اس سے زیادہ اہمیت اس کی ان مخلصانہ کوششوں کی ہے جو اس نے اپنی سلطنت میں بسنے والوں کے دلوں میں تہذیبی اشتراک اور مذہبی رواداری کے جذبے کو فروغ دینے کے سلسلے میں انجام دیں۔

اکبر نے مختلف مذہبی گروہوں اور تمدنی حلقوں کے مابین ذہنی اشتراک پیدا کرنے کے لیے جو مذہبی پالیسی اختیار کی اور جن عقائد و رسومات کو رواج دیا ان کی اہمیت کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوتا ہے جب ہم اکبر کے مذہبی معتقدات کا مطالعہ اس دور کی صوفیانہ تحریکوں کی روشنی میں کرتے ہیں:۔

---

[1]، [2] صحیفۂ ابرار

وہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو ایک مشترک اخلاقی نصب العین اور تہذیبی زاویہ نگاہ دینا چاہتا تھا۔ لیکن اسے منوانے کے سلسلے میں اس نے تشدد کو پسند نہیں کیا اور اپنے دستورِ حکومت کو اس سے الگ رکھا۔ پروفیسر حبیب نے اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے۔

"اکبر کی حکومت کی بنیاد صلح کل کے اصولوں پر تھی، جس کی رو سے ہر فرقہ کو اپنے روایتی خیالات اور طریق زندگی پر قائم رہنے کی پوری آزادی تھی اور ہر فرد کو حق تھا کہ وہ اپنے فرقہ کے خیالات اور طریقوں کو خود جس طرح چاہے سمجھے اور برتے۔ [1]

اکبر ہندوستان کے مسلمان حکمراں میں سب سے زیادہ مذہبی طور پر رواداری کا حامی اور وحدت ادیان کا قائل نظر آتا ہے مختلف مذاہب کے رسوم وعقائد میں دھنک کے رنگوں جیسا جو اختلاف ملتا ہے وہ ان کو تفہیم وتحسین کی نظر سے دیکھتا ہے اور ان کے پردے میں چھپی ہوئی سچائیوں کو بروئے کار لانا اور انہیں اپنے ملک کے مذہبی فکر و عمل کے دائرے کا جزو بنا دینا چاہتا تھا۔

اس کے اختیار کردہ مسلک کے جزئیاتی پہلوؤں میں کیوں اور کہاں کہاں اہل مذاہب کے لیے گنجائش نکل سکتی ہے یہ ایک الگ سوال ہے۔ لیکن ہندوستان کی تہذیبی تاریخ اس حقیقت کو فراموش نہیں کر سکتی کہ ہندوستان میں مذہبی رسوم کی یکجائی کی کوشش اہل ارادت اور معلمین انسانیت کی طرف سے برابر اور موقع بہ موقع عمل میں آتی رہی۔ کبیر پنتھی نانک پنتھی اور دادو پنتھی فرقوں کے عقائد ورسوم اس کی ایک نمایاں مثال ہیں۔ گجرات کے امام شاہی فرقہ کے لوگوں کے مراسم ومعتقدات کو اس کی ایک نمایاں مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

"...... ان میں ایک خلیفہ ہوتا ہے جسے "کاکا" کہا جاتا ہے یہ لوگ نہ (خالصتاً) مسلمان ہوتے ہیں نہ ہندو بلکہ دونوں مذاہب کے طریقوں پر کاربند رہتے ہیں یہ لوگ

---

[1] ملاحظہ ہو علی گڑھ تاریخ ادب اردو: ۴۷

ہولی، دیوالی بھی مناتے ہیں اور عیدین بھی گوشت اور مچھلی نہیں کھاتے اور روزے بھی رکھتے ہیں ان کے وہاں مردوں کو دفن کیا جاتا ہے مگر اس رسم میں کوئی اسلامی طریقہ نہیں ہوتا دفن کرتے وقت گجراتی میں دعائیں پڑھی جاتی ہیں جن میں خدا اور امام شاہ (بانی فرقہ) کے ناموں کے ساتھ برہما وشنو اور اندر کے نام بھی شامل ہوتے ہیں۔ شادی بیاہ میں اسلامی طریقہ پر عقد خوانی کے بعد برہمن کو بلا کر ہندو کی رسم کے مطابق بھی تمام مراحل طے کیے جاتے ہیں"۔ ؎

اکبر نے مغل راجپوت اور ہند اسلامی عناصر کو جس طرح یکجا کرنے کی کوشش کی اور اس کے لیے جو عملی قدم اٹھائے ان کو اس ملک گیر سماجی عمل اور مذہبی طریق فکر سے الگ کر کے نہیں دیکھا جانا چاہیئے۔ ان کے پر قوت گروہ سے مغل حکومت کے سیاسی استحکام میں مدد ملی بلکہ اس نئے معاشرتی مزاج کی تشکیل میں بھی جو برابر ارتقاپذیر تھا اس کے اثرات بہت کچھ دیر پا ثابت ہوئے۔

مغل حکومت کے درباری آداب و رسوم کے علاوہ اس کے زیر سایہ فروغ پذیر ہونے والے فن مصوری فن موسیقی اور فن تعمیر میں اس کی جھلکیاں آج بھی دیکھی جاسکتی ہیں شعرو شعور پر اس کے دوررس اثرات کو سنسکرت کلاسیکس کے ماسوا فارسی تراجم میں نمایاں طور پر مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے مغل دربار کی مذہبی مفاہمت پسندی کے خلاف جو کچھ کہا اسے تعصب و تنگ نظری کا نتیجہ اور اشتراک کے مقابلہ میں افتراق کی قوتوں کا احیاء نہیں کہا جانا چاہیئے اس نوع کی اصلاح پسندانہ روش مغرب اور مشرق کے بعض دوسرے ملکوں میں بھی اختیار کی گئی اسے ایک طرح کا PURITONISM. قرار دیا جانا چاہیئے۔ یہ بہت کچھ اسی نوع کی احیائی اور زیادہ صحیح الفاظ میں اصلاحی کوشس ہے جیسے عیسائیت میں کیتھولک طبقے کے مقابلہ میں PROTESTMENT تحریک نے کی ہندوستان میں سناتن دھرم کے خلاف آریہ سماج کی طرف سے عمل میں آئی، جہانگیر نے اکبر کے خلاف بغاوت کی اور ابوالفضل کو قتل کرادیا اس کی نوعیت سیاسی ہے۔ تخت نشینی

؎ علی گڑھ تاریخ ادب اردو

کے بعد وہ اکبر ہی کے نقشِ قدم پر چلتا رہا وہ فن مصوری کا بہت بڑا قدر شناس اور سرپرست تھا۔ ہندوستانی موسیقی اور صوفیانہ ہندی شاعری سے اسے گہری دلچسپی تھی اور اکبر ہی کی طرح وہ مباحثے کرتا رہتا تھا۔

شاہجہاں کا دور اپنی تمدنی فتوحات اور شان و شکوہ کے اعتبار سے مغل حکومت کا "عہد زرین" ہے۔ اس عظیم مغل شہنشاہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے دہلی کی مرکزی حیثیت کو پھر بحال کیا اس کے عہد میں "تاج محل" "لال قلعہ" اور "شاہجہانی مسجد" جیسی عظیم اور عجائب روزگار تعمیرات ہوئیں جس کی وجہ سے اسے PRINCE BUILDER کہا جاتا ہے شاہجہانی دور کے تمدنی اوج و عروج کا اندازہ تختِ طاؤس اور "دل بادل" خیمے سے زیادہ اس تہذیبی نقطۂ نگاہ سے ہوتا ہے جس کے لیے ہم شہزادہ داراشکوہ کو ایک "علامت" قرار دے سکتے ہیں۔ خود شاہجہاں کے دربار میں اگر ایک طرف ہم حاجی محمد جان قدسی مشہدی ابوطالب کلیم، شادماں اور سودائے گیلانی جیسے شعراء کو دیکھتے ہیں تو دوسری طرف شمبھوناتھ سندروالی اور چنتامنی جیسے سنسکرت اور ہندی کے اہل علم و ادب بھی موجود ہیں۔

بادشاہ ایک ایسے مذہبی کردار کا مالک ہے کہ کبھی اس کی تکبیر اولیٰ قضا نہیں ہوئی مگر اس کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ صبح ہوتی ہے تو ہندوستان کا بادشاہ شاہجہاں بعد ادائے نماز تسبیح در دست وظیفہ بر لب "جھروکہ درشن" میں رونق افروز ہوتے ہیں، اور درشن کرنے والوں کی سعادت دیدار فیض آثار سے نوازتے ہیں اس کے مقابلہ میں شہزادہ کا رنگ طبیعت کچھ اور بھی گہرا ہے وہ ظاہری رنگا رنگی کو باطنی ہم آہنگی میں بدل دینا چاہتا ہے۔ داراشکوہ کو ابتدا ہی سے تصوف و روحانیت سے دلچسپی تھی چنانچہ عین عالم شباب میں وہ "سفینۃ الاولیا" جیسی کتاب ترتیب دیتا ہے "سرِ اکبر" کے نام سے "اپنشد" کا ترجمہ کرتا ہے اس سے مذہبی میلان اور تہذیبی زاویۂ نگاہ کا پتہ چلتا ہے جس کی بہترین ترجمانی اس کی کتاب "مجمع البحرین" سے ہوتی ہے اپنی اس کتاب میں شہزادے نے دونوں مذہبوں کے رسوم و عقائد کی ایسی توجیہات اور تعبیریں پیش کی ہیں جن سے یہ ظاہر ہو کہ اسلام مذہب اور ہندو مت دونوں اپنے حقیقی مفہوم اور روحِ معنی کے اعتبار سے ایک ہیں۔

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

شہزادہ اپنے وقت کا ایک بڑا حصہ اہلِ تحقیق و تصوف کی خدمت میں گزارتا تھا۔ اور اپنے مرشدوں کے علاوہ ہندو جوگیوں اور سنتوں سے بھی مذہبی مسائل و ویدانت پر گفتگو کرتا تھا جس سے بالآخر اس پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ دونوں سچائیوں میں بس نام ہی کا فرق ہے۔

"بعد از دریافت حقیقت الحقائق و تحقیق رموز و دقائق مذہب برحق صوفیہ و فائز گشتن بایں عطیہ عظمیٰ در پی آں شد کہ درک کُنہہ مشرب موحدان ہند و با بعضے از ایں قوم و کاملان ایشان کہ بہ نہایت ریاضت و ادراک و فہمیدگی و غایت تصوف و خدایابی رسیدہ بودند مکرّر مجتہداشتہ و گفتگو نمودہ جز اختلاف لفظی در دریافت و شناخت حق تضادے ندید"[۱]

اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی پر اہل تاریخ تنقید کرتے آئے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ شہنشاہ نے مذہب سے الگ ہوکر یا مذہب کا سہارا لے کر جو کچھ کیا اس کا تعلق ملکی مصلحت سے تھا جس میں شاہ جہاں کی نظر بندی اور دارا شکوہ اور مراد کا قتل بھی شامل ہے۔ اس روشنی میں بعض غیر مسلموں کے ساتھ اس کے سیاسی سلوک کی توجیہہ بھی ممکن ہے۔ مگر بحیثیت مجموعی بقول پروفیسر حبیب "یہ ساری کارروائی آئین حکمرانی کے مسلّم اصول کے مطابق ہوئی... جنگ تخت نشینی میں کوئی تعصب کا پہلو نہ تھا قریب قریب ہر ہندو راجہ نے (وقت آنے پر) اورنگ زیب کی مدد کی اور کارہائے نمایاں انجام دیئے"[۲]

شیواجی کے خلاف شاہی فوجوں کے اقدام کا منشا بھی وہی تھا جو دکن کی مسلمان سلطنتوں کے خلاف عسکری مہمات میں پیشِ نظر رہا... تخت نشینی کے بعد شیواجی کے خلاف جو پہلی مہم اورنگ زیب نے روانہ کی اس کی سربراہی مرزا راجہ جے سنگھ کو سونپی گئی

---

[۱] مجمع البحرین مرتبہ محفوظ الحق مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۲۹: ۸۰

[۲] علی گڑھ تاریخ ادب اردو ۷۹

اور سلطنت کے سارے لائق افسروں کو اس کی ماتحتی میں دے دیا گیا۔ یہی راجپوت سپہ سالار شیواجی کو مغل دربار میں لایا تھا اور ایک بار صلح صفائی ہو جانے پر خود شیواجی نے دکنی مہمات میں مغل حکمران کی مدد کی تھی۔ ایک اور موقع پر شیواجی کے خلاف جو شاہی فوج روانہ کی گئی اس کی کمان راجہ جسونت سنگھ کو دی گئی۔

خود شیواجی جو زندگی بھر مغل حکومت کے خلاف جنگ آزمار ہا۔ اسلام یا مسلمانوں سے اسے کوئی خاص پرخاش نہ تھی وہ قرآن اور مسجدوں کا بہت احترام کرتا تھا۔ اور یہ بات قابل لحاظ ہے کہ شیواجی کا "قاضی القضاۃ" حیدر بعد میں مغل سلطنت کا قاضی القضاۃ بنا[1]

اورنگ زیب کے زمانے میں جہاں کچھ مندر توڑے جانے کی بات کہی جاتی ہے وہاں مندروں کو جاگیریں بھی دی جاتی ہیں لال قلعہ کے سامنے کا جین مندر جو کبھی "اردو مندر" کہلاتا تھا اس کی ایک بہت نمایاں مثال ہے اگر بادشاہ کو مندروں سے مذہبی اختلاف ہوتا اور اس جذبے کے تحت وہ کسی مندر کو مسمار کرنے کا حکم دیتا تو لال قلعہ کے لاہوری دروازہ کے سامنے یہ مندر کیسے باقی رہتا اور اسے جاگیر کیوں عطا کی جاتی۔

وہ اپنی بیوی اودے پوری بیگم (والدہ شہزادہ کام بخش) سے بہت محبت کرتا تھا اپنی زندگی کے آخری ایام میں شہزادے کو اس نے جو خط لکھا ہے اس میں یہ فقرہ موجود ہے۔

"اودے پوری والدۂ شما از دیر باز با من بیمار بود حالا ہم ارادہ رفاقت دارد۔

شہنشاہ کے کردار کا یہ انسانی پہلو کیا مذہبی رواداری کا آئینہ دار نہیں - - - - -

اورنگ زیب کے جانشینوں کی دلی ڈیڑھ سو برس تک اپنے دور زوال سے گزرتی رہی لیکن اس کے مخصوص نامذہبی کردار میں فرق نہیں آیا۔ محمد شاہ رنگیلے کی بیگم قدسیہ خانم اصلاً ہندو تھی۔ فرخ سیر ایشر سنگھ راجپوت راجہ کا داماد تھا۔ ہندو امرار آخر وقت تک اپنے بادشاہوں کے وفادار رہے۔ غلام قادر روہیلے نے جب لال قلعہ میں شاہ عالم ثانی کی آنکھیں نکال لیں اور تیموری شہزادوں اور شہزادیوں کو بے حرمت کیا تو مجبور بادشاہ نے مہادجی سندھیا

---

[1] علی گڑھ تاریخ ادب اردو

سے مدد طلب کی۔ سندھیا کی فوجوں نے مظلوم بادشاہ کو غلام قادر کی تعدی سے نجات دلائی مگر بادشاہ کو معزول کر کے خود دہلی کے تخت پر نہیں بیٹھا۔ شاہ عالم اگرچہ عملاً مرہٹوں کے وظیفہ خوار تھے لیکن مجال ہے کہ مرہٹوں کی جانب سے آداب شاہی اور رسومات دربار کی پیروی میں کوئی فرق آجائے۔

شاہ عالم ثانی کے دربار سے اس وقت جو اہلِ فن وابستہ تھے ان میں اردو فارسی کے شعراء کے ساتھ بھاکا اور سنسکرت کے شاعر بھی تھے۔ صاحبِ "مجموعہ نغز" نے لکھا ہے۔

"برخے از گزرانِ شبا روزی آں حضرت.... بدیں شغل شریف کہ عبارت از شعرو شاعری ہست فارسی باشد یا ریختہ سنسکرت بود خواہ بھاکا صرف می شود...."[۱]

اس دور ابتلا میں بھی ہندو رعایا اپنے بدنصیب بادشاہوں سے کس قدر ہمدردی اور محبت کرتی تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ عالمگیر ثانی کو اس کے وزیر عماد الملک ثالث نے دھوکہ سے فیروز کوٹلہ میں قتل کرا دیا اور لاش کو جمنا کی ریت پر پھینک دیا۔ منہ اندھیرے ایک ہندو برہمن عورت جمنا جی پر آئی تو دیکھا کہ بادشاہ کی لاش پڑی ہے۔ یہ دیکھ کر بہت روئی اور اس وقت تک لاش کی حفاظت کی جب تک اسے اٹھا کر قلعہ میں لے جانے والے نہ آ گئے۔ شاہ عالم نے اس عورت کو اس طرح اپنے باپ کی لاش کی حفاظت کرنے پر اپنی منہ بولی بہن بنایا۔ ہر سال رکھشا بندھن کے موقع پر وہ آتی بادشاہ کی کلائی پر اپنے ہاتھ سے رکھشا بندھن باندھتی اور بادشاہ اسے انعام واکرام دے کر رخصت کرتا۔ اس موقع پر شاہ عالم کے جد اعلیٰ ہمایوں بادشاہ نے جس طرح راکھی کی لاج رکھی تھی اور اس کے لیے خود اور اپنی سلطنت کو خطرے میں ڈال دیا تھا اس واقعہ کا یاد آجانا ایک فطری بات ہے۔

اس دور میں میلے ٹھیلے تیج تہوار اور جینے مرنے کی رسمیں بھی اس یگانگت کے رشتے کا پتہ دیتی ہیں جو دونوں فرقوں کے دلوں کو پریم کی ایک ڈوری میں باندھے ہوئے تھا۔ اس میں۔۔۔

---

[۱] مجموعۂ نغز حصہ اوّل ۸

راجہ اور رنگ کی کوئی قید نہ تھی بسنت پر جو میلا ہوتا تھا اس میں سبھی شریک ہوتے تھے اس موقع پر اولیاء اللہ کے مزارات پر قوالیاں ہوتیں پھول برستے اور عطر وگلاب چھڑکا جاتا۔

حضرت مرزا جان جاناں اس عہد کے مشہور اولیائے کبار میں سے تھے پروفیسر خلیق احمد نظامی نے مرزا مظہر جان جاناں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"مرزا صاحب کے مذہبی عقائد میں بڑی — وسعت اور توانائی تھی انہوں نے وید کو الہامی کتاب قرار دیا اور اہلِ ہند کو اہلِ کتاب کا مرتبہ دے کر مذہبی کتاب وید کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے اور جس طرح بعض ہندو رسوم کی وضاحت کی ہے اس سے مذہب فکر کا ایک نیا باب کھلتا ہے[1]

حضرت شاہ عبدالعزیز ولی اللّہی مکتب فکر کے بہت ممتاز سربراہ ہیں۔ علم تفسیر، حدیث فقہ سیرت اور تاریخ میں شہرۂ آفاق تھے۔ طبیعات الٰہیات اور منطق وغیرہ میں یکتائے زمانہ بزرگ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اللہ کو پرمیشور کے نام سے یاد کرنے میں کوئی حرج نہیں[2] انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں انہوں نے جس طرح ہندو راؤ کو مشورے دیے اس سے دونوں فرقوں کے ممتاز افراد اور اشخاص کے درمیان ذہنی یگانگت کا ہی نہیں آزادی کے لیے مشترک درد کا بھی پتہ چلتا ہے۔

سرسیّد کے نانا نواب دبیر الدولہ فرید الدین خاں نے اپنے انتقال سے قبل جو جائیداد تقسیم کی تو اپنے ایک قدیم ہندو دیوان لالہ تلوک چند کو برابر کا حصّہ دیا۔ ایک اور واقعہ جو سرسیّد نے سیرت فریدیہ میں بھی لکھا ہے۔ بڑا دلچسپ ہے کہ ایک ہندو تیر انداز "اللہ غنی" کہہ کر تیر چلاتا تھا جس کی وجہ سے اس کا نام ہی "اللہ غنی" پڑ گیا تھا[3]۔ قدیم دلی کالج زمانہ غدر سے پیشتر مشترکہ تہذیبی اقدار اور تعلیم وتربیت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ اس کے طلباء اور اساتذہ

---

[1] اوراق مصوّر: ۸۰

[2] اوراق مصوّر: ۸۱

[3] اوراق مصوّر: ۸۱

میں ہندو اور مسلمان دونوں تھے اور دونوں ہی نے اس کی آغوش تربیت میں پرورش پائی۔ ہندوستان بھر میں اس تاریخی ادارہ کا نام روشن کیا۔

اس ادارہ کے تربیت یافتہ لوگوں میں اگر ایک طرف مولوی ذکاراللہ --- مولانا محمد حسین آزاد اور مولوی نذیر احمد جیسے نابغے ہیں تو دوسری طرف ماسٹر رام چندر ماسٹر بھیروں پرشاد ماسٹر پیارے لال آشوب جیسی علمی ادبی اور تہذیبی شخصیتیں ہیں۔

سی ایف اینڈریوز نے اپنی کتاب ذکاراللہ آف دہلی میں مغلوں کے آخری زمانے کی جو تصویر پیش کی ہے۔ اور جس کے لیے تمام تر معلومات اس نے خود دہلی سے اکٹھی کی تھیں وہ دہلی میں شاہی و شہری تہذیب اور اس کی پیدا کردہ مذہبی رواداری اور تہذیبی ہم آہنگی کے لیے ایک نہایت اہم ثقافتی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں ایک موقع پر اس نے لکھا ہے۔

"ایک ہی شہر میں ہندو مسلمانوں کے پہلو بہ پہلو رہنے کی وجہ سے عوام کے ایک دوسرے کے رسم و رواج میں نمایاں اشتراک پیدا ہو گیا تھا۔ دہلی میں بہ لحاظ تعداد ہندو مسلمانوں کے مقابلہ میں بھی غیر مساوی نہیں رہے۔ ہندوؤں کا اگر خاص طور پر تجارت میں نمایاں حصہ تھا تو مسلمان زیادہ تر نظم و نسق سے متعلق تھے۔

پرانی دلی (شاہ جہاں آباد) کے مابین کسی اور بات کے بجائے اس خصوصی دوستانہ تعلق کی مجھے یقینی اور تصدیقی شہادتیں ملی ہیں[1]

اس سے ہم اس تہذیبی روایت اور تمدنی مزاج کا پتہ چلا سکتے ہیں۔ جو صدیوں تک ہندوستان کی مشترک تہذیب اور ملے جلے کلچر کا آئینہ دار رہا ہے۔

---

[1] ذکاراللہ دہلوی :- (تعلیمی مرکز کراچی)، ۴۳

ابنِ بطوطہ

عبداللہ بن محمد جو ابن بطوطہ کے نام سے مشہور ہے اہم سیاحوں میں سے ہے۔ سیر و سفر سے اسے غیر معمولی دل چسپی تھی، جہاں قیام کرتا تھا وہاں کے حالات و حادثات کو اپنی یادداشتوں میں محفوظ کر لیتا تھا۔

اس نے اپنی زندگی میں بہت سے مقامات کا سفر کیا۔ اور مصر سے ہوتا ہوا عہدِ وسطیٰ کا یہ عظیم سیاح ملتان پہنچا اور ملتان سے دہلی آیا۔ دہلی میں یہ تقریباً سولہ برس قیام پذیر رہا۔ اس کے قیامِ دہلی کا زمانہ محمد بن تغلق کا دورِ حکومت ہے۔ سلطان اس سیاح کی بڑی قدر کرتا تھا اس نے اُسے (ابنِ بطوطہ) کو دہلی کا قاضی بھی بنایا تھا اور سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی کے مَقبرہ کے انتظامات بھی اس کے سپرد کیے تھے۔

انہی انتظامات کے سلسلے میں جو جائداد وقف کی گئی تھی اس سے متعلق خراج یا مالیانہ کو وصول کرنے کے لیے (جو بصورت جنس ہوتا تھا)۔ ابن بطوطہ نے امروہہ کا بھی سفر کیا تھا۔ ابن بطوطہ کے زمانہ میں اور بھی بہت سے دوسرے ممالک امیر زادے یہاں مقیم تھے اور سلطان کی عنایات اور اس کے عطیّات سے بہرہ ور ہوتے تھے سلطان نے اپنے بعض معزز مہمانوں کو قیام کے لیے بڑے بڑے محلات عطا کیے تھے۔ کچھ ایسی ہی صورتِ حال "مسالک الابصار" میں بھی ملتی ہے۔

سلطانی بخشش دینار و درم میں بھی ہوتی تھی جس سے مراد اس زمانہ کے سکّے ہیں اور زیادہ تر آٹا، دال گوشت، سبزی، گھی، شکر وغیرہ اشیائے ضروری کی مقدار معیّن ہو جاتی تھی۔ وقتاً فوقتاً مزید عنایات اور بخشش بھی ہوتی تھیں اور جن اشیاء کی بخشش ہوتی تھی ان میں مختلف چیزوں کے علاوہ باندیاں

اور غلام بھی ہوتے تھے گھوڑے جوڑے بھی اور دوسری قیمتی اشیا بھی۔

سلطان کو بھی اُس کے اہلِ دربار اور باہر سے آنے والوں کی طرف سے نذریں پیش ہوتی تھی۔ ابن بطوطہ کے بیانات میں دو بیان بہت اہم ہیں ایک یہ کہ جب اُس کی بیٹی کا انتقال ہوا تو سوم کی رسم کے دن۔۔ بادشاہی حکم کے مطابق عزاداری کی بعض رسومات ادا کی گئیں ان میں پھول چڑھانے کی رسم خاص طور پر تھی۔ شاید اسی وجہ سے دہلی میں تیجے کی رسم کو پھول کہا جاتا ہے۔ اس موقع پر سلطان کی والدہ نے اس باندی کو بھی بلایا تھا جس کی وہ بچی تھی باندی ایک رات سلطان کی والدہ کی مہمان رہی واپسی میں اس کو جو کچھ دیا گیا وہ ابن بطوطہ نے اپنے قرض خواہوں کو بھیج دیا۔ باندیوں اور غلاموں کا تبادلہ یا پیش کش اس طرح ہوتی تھی جیسا کہ وہ کوئی ایسی جاندار شے ہوں جنھیں بے تکلف بیچا اور خریدا جا سکتا ہے باندیاں اور غلام تحفہ میں بھی دیئے جاتے تھے۔

ایک بار ابنِ بطوطہ کو آٹھ دس لڑکیاں تحفتاً پیش کی گئیں تھیں ان میں سے ایک تو ابنِ بطوطہ نے لانے والے کو ہی بخشش دی تھی۔ دو تین لڑکیاں جن کی عمریں بہت کم تھیں وہ کچھ لوگوں نے پالنے کے لیے لے لیں باقی کو بیچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ ان کی کوئی قیمت اس لیے لگ نہیں سکتی تھی کہ وہ سیدھی سادھی لڑکیاں تھیں نہ اُن کو رقص و موسیقی جیسا کوئی فن آتا تھا اور نہ وہ کسی خاص ہنرمندی سے بہرہ ور تھیں۔

دوسرا اہم واقعہ سلطان کی بہن فیروزہ خانم کی شادی ہے جو امیر سیف الدین غدا سے کی گئی تھی۔ اس موقع پر جو رسم ادا کی گئیں وہ بالکل ہندوستانی تھیں وہ دولہا کو اچھی بھی نہیں لگیں کہ وہ اس کلچر سے واقف ہی نہیں تھا۔

ایک بار سلطان ابنِ بطوطہ سے ناراض ہو گیا تھا یہ بھی ممکن تھا کہ وہ سلطانی قہر و غضب کا شکار ہو جائے اور بے رحمی کے ساتھ قتل کر دیا جائے لیکن اتفاق سے اُس کی جان بچ گئی سلطان نے اسے معاف کر دیا

سفرِ نامۂ ابن بطوطہ

حالِ دہلی

از ملتان تا دہلی

مُلتان سے پایہ تخت دہلی تک چالیس دن کا فاصلہ ہے جس میں بہت سی بستیاں اور آبادیاں ملتی ہیں۔ وہ حاجب اور رفیق جو خداوند زادے کے استقبال کے لیے آئے تھے۔ انھوں نے عام لوازماتِ سفر کو مہیا کر دیا۔ تقریباً بیس آدمیوں نے مُلتان سے خورد و نوش کا سامان اپنے ساتھ لیا۔ اس کے علاوہ حاجب رات کے وقت سفر کرتا اور جہاں ضرورت ہوتی وہاں ٹھہر جاتا اور استراحت کے وسائل اور کھانے پینے کا اہتمام کرتا۔ خداوند زادہ جب کسی جگہ پہنچتا تو پہلے سے کھانے کی اشیاء مہیا ہوتی تھیں۔ دوسرے لوگ بھی جو مہمان ہوتے تھے وہ علیحدہ خیموں میں اترتے تھے اور اکثر اس دسترخوان پر کھانے میں شریک ہوتے تھے جو خداوند زادہ کے لیے بچھایا جاتا تھا لیکن میں صرف ایک بار شریک ہوا۔

کھانے کی ترتیب کچھ اس طرح ہوتی تھی۔ دسترخوان پر جو نان یا روٹیاں چُنی جاتی تھیں وہ بہت پتلی پتلی اور نازک ہوتی تھیں اور بُھنا ہوا گوشت بڑے بڑے ٹکڑوں میں

تقسیم ہوتا تھا۔ چنانچہ بھیڑ یا بکری پوری کی پوری چار یا چھ ٹکڑوں سے زیادہ میں تقسیم نہیں کی جاتی تھی۔ ہر ایک آدمی ایک ٹکڑا لے لیتا تھا۔ اسی طرح سے اُن کی روغنی روٹیاں بہت مخصوص ہوتی تھیں۔ جو ولایت میں بنائے جانے والے نان سے مشابہت رکھتی تھیں۔

اُن کے میدے کو کچھ اس طرح خمیر کیا جاتا تھا کہ اس میں ایک گونا ،، لیس پیدا ہو جاتا تھا اور اس کے اوپر اس شیرینی کے ٹکڑے لگائے جاتے تھے جسے ہم "خشتی" کہتے ہیں یہ لال روٹیاں، میدے، شکر اور روغن سے تیار ہوتی تھیں۔

اس کے بعد کھانے کے لیے ایک ایسا گوشت لایا جاتا جو روغن، پیاز، اور زنجبیلِ سبز کو ملا کر تیار کیا جاتا تھا اور چینی کے برتنوں میں کھانے کے وقت اُتارا جاتا تھا۔ اُس کے بعد ایک اور شے غذا کے طور پر لائی جاتی کہ جس کو سموسک کہتے تھے اور وہ ایک ایسے گوشت سے تیار کیا جاتا ہے۔ جسے خوب کوٹا جاتا ہے۔ ور اُس کے ساتھ مغز، بادام پستہ اور دوسری چیزیں اس کے اندر بھری جاتی ہیں پھر اُس کو گھی میں تلا جاتا ہے اور ہر آدمی کے سامنے چار چار پانچ پانچ کوفتے رکھے جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ چاول لائے جاتے جن کو گھی میں بھون کر تیار کیا جاتا ہے۔۔۔ جسے پُلاؤ کے نام سے یاد کرتے تھے اور اس کے ساتھ چوزہ ہائے مُرغ ہوتے۔ سب کے آخر میں "لقیمات القاضی" یا قاہر یہ کو لایا جاتا۔ اس۔ القاضی کو ہندوستان میں ہاشمی کہا جاتا ہے (جو ایک طرح کی مٹھائی ہے)

حاجب کھانا کھانے سے قبل دستر خوان کے کنارے کھڑا ہوتا ہے اور جس طرف سلطان کا رُخ ہوتا۔۔۔ اُس طرف اپنا رُخ کر کے خدمت بجا لاتا ہے اور تمام حاضرین جلسۂ طعام اسی طرح ادائے خدمت کرتے۔۔۔ خدمت کے یہ معنی ہیں کہ اپنے سر کو رکوع کی حد تک جھکا لیتے۔۔۔ بعد ازاں بیٹھ جاتے ہیں اور سنہری اور روپہلی پیالوں میں یا پھر شیشے کے ظروف میں اُن کو شربت پیش کیا جاتا۔۔۔ اسے کھانے کے بعد نوشِ جان کیا جاتا۔ اُس کے بعد حاجب بسم اللہ کہتا۔۔۔ اور دستر خوان پر بیٹھے ہوئے لوگ کھانا شروع کرتے ہیں۔ کھانے کے بعد ایک خاص طرح کا مشروب کوزوں میں لایا جاتا۔ جسے فقاع کہتے ہیں۔ اس کے بعد پان اور چھالیہ پیش کی جاتیں بعد ازاں پھر حاجب بسم اللہ کہتا لوگ اٹھتے اور اپنی اپنی منزل کی راہ لیتے ہیں۔

ہندوستان کے درخت اور میوے

اب میں یہ چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے میوؤں اور درختوں کے بارے میں بھی کچھ کہوں آم یہاں کا ایک خاص درخت ہے جو نارنج کے مانند ہوتا ہے۔ مگر اُس سے کہیں زیادہ سخت اور بڑا۔ تناور ہوتا ہے آم کا سایہ بہت گھنا ہوتا ہے اور جو آدمی اُس کے نیچے سو جاتا ہے اُس کے پھیپھڑے درد کرتے لگتے ہیں۔ آم کا پھل ایک بڑے گلاب جیسا ہوتا ہے۔ سبز رنگ کے کچے آم جو زمین پر گر پڑتے ہیں اُن کو جمع کر لیتے ہیں اُن کی پھانکیں کر کے ان میں نمک لگاتے ہیں۔ اُسی کے ساتھ کوئی ترش چیز ڈالتے ہیں جیسا کہ ہم لوگوں کے یہاں ولایت میں ہوتا ہے ہم میٹھے لیمو اور ترش لیموسے کام لیتے ہیں۔ اسی طرح زنجبیل اور فلفل کے خوشے اُس میں ڈالتے ہیں اور اچار تیار کرتے ہیں۔ یہ ترش مُربّیٰ وہ خوراک کے ساتھ کھاتے ہیں اور ہر لقمے کے ساتھ ذرا سا اُس میں سے لیتے جاتے ہیں۔ آم کا پھل دگر میوں کے آخر میں، خوب ہوتا ہے اور جب پک جاتا ہے تو اُس کا رنگ زرد ہو جاتا ہے۔ سیب کی طرح اسے چاقو سے پھانکیں کر کے کھاتے ہیں یا پھر چوستے ہیں۔ آم میں ہلکی سی ترشی بھی ہوتی ہے اس کی گٹھلی بڑی ہوتی ہے اور اس کو نارنجی کے بیجوں کی طرح بوتے ہیں جس سے آم کا پودا نکلتا ہے۔

جُھکی اور برگی

یہ ایسے درخت ہیں جن کو گھنساں کہا جاتا ہے۔ ان کے پتے "گردو" کے پتوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کا پھل زیادہ تر درخت کی بڑی شاخوں میں لگتا ہے۔ ان درختوں میں سے جو چھوٹے قد کا ہوتا ہے اور زمین سے متصل رہتا ہے اُس کو برگی کہتے ہیں۔ وہ اپنی شیرنی اور مٹھاس میں بہت خوب ہوتا ہے اور اُن میں سے جو درخت بلند ہوتے ہیں وہ جُھکی کہلاتے ہیں جن کا میوہ کدوئے قلیانی کے مشابہ ہوتا ہے اور اُن کی چھال پوستِ گاؤ جیسی، پکنے کے زمانے میں یہ میوہ زرد ہو جاتا ہے۔ اس کو کاٹ کر پھر شگاف دیتے ہیں اور اُس کے

اندر سے سو، دو سو کے قریب دانے نکلتے ہیں جو موتی جیسے ہوتے ہیں اور ہر ایک دانہ زرد رنگ کے پردے کے باعث دوسرے سے الگ ہوتا ہے اور ہر دانے کی شکل باقلے کے بیج جیسی ہوتی ہے۔ جب اسے پکاتے ہیں یا بھونتے ہیں تو یہ باقلے جیسا مزہ دیتا ہے۔ باقلا ہندوستان میں نہیں ہوتا۔ اس کے بیجوں کو سُرخ مٹی میں سال بہ سال حفاظت سے رکھتے ہیں۔ شکی اور برگی ہندوستان کے بہترین پھلوں میں سے ہیں۔

تندو

تندو ایک آبنوسی رنگ کے درخت کا میوہ ہوتا ہے۔ اس کے بیج زرد آلو جیسے ہوتے ہیں اور اُس کا رنگ بھی کچھ اسی طرح کا ہوتا ہے۔

جون

یہ بھی گھنسال درختوں میں سے ہے۔ اُس کا میوہ زیتون کے پھل سے مشابہ ہوتا ہے اور اس کا بیج بھی زیتون کے بیج جیسا ہوتا ہے۔

نارنج

نارنج شیریں ہندوستان میں بکثرت پیدا ہوتا ہے اور نارنج ترش بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ ہندوستان میں نارنج کی ایک اور قسم بھی ہوتی ہے۔ یہ خوش مزہ ہوتا ہے اور دُرشتی میں لیموں سے مشابہ ہے۔

مہوا

مہوا کا درخت بھی گھنا سایہ دار ہوتا ہے اور اُس کے پتے برگِ گردو سے مشابہ ہوتے ہیں لیکن اُس کے پتوں میں سُرخی اور زردی ملی جلی ہوتی ہے۔ مہوا کا پھل چھوٹے سے گلاب کے مشابہ ہوتا ہے اور بہت ہی میٹھا۔ اس کے ہر دانے میں انگور کے بیج کی طرح

چھوٹا سا بیج ہوتا ہے لیکن اس کا ذائقہ انگور ہی کی طرح ہوتا ہے اور اگر کوئی آدمی زیادہ کھا لیتا ہے تو اُسے سر درد ہو جاتا ہے۔ جب اس کے دانے کو دھوپ میں خشک کر لیتے ہیں تو انجیر کا سا مزہ پیدا کرتا ہے۔ چونکہ انجیر ہندوستان میں پیدا نہیں ہوتا میں اسی کو انجیر کی جگہ کھاتا رہا ہوں۔ اسے ہندوستان کا انگور بھی کہتے ہیں۔ لیکن خود انگور ہندوستان میں نہیں ہوتا یا بہت ہی کم ہوتا ہے اور سوائے دہلی اور چند دوسرے علاقوں کے دیکھنے میں نہیں آتا۔ مہوا سال میں دو بار پھلتا ہے اُس کے دانوں سے روغن بھی نکالا جاتا ہے اور مہوا کا تیل چراغ جلانے کے کام بھی آتا ہے۔

کسیرو

یہاں کی زمینی پیداوار میں سے ہے اور بہت میٹھا ہوتا ہے۔ وہ شاہ بلوط سے مشابہ ہوتا ہے۔ ہماری ولایت میں جو پھل پیدا ہوتے ہیں۔ اُن میں سے انار ایسا ہے جو ہندوستان میں بھی ہوتا ہے۔ میں نے جزائر دیبل میں دیکھا ہے کہ اس پھل دار درخت کے پھل زمین پر گرتے ہیں اسے انار کہتے ہیں اور میرا خیال یہ ہے کہ جلنار کا لفظ بھی اُسی سے نکلا ہے جو دو کلموں سے بنا ہے۔

غذائی اجناس (جو ہندوستان میں پیدا کی جاتی ہیں)

ہندوستان کے لوگ سال بھر میں دو بار فصل پیدا کرتے ہیں۔ موسمِ گرما میں جس کے بعد وہاں بہت بارش ہوتی ہے۔ کاشت کاری کا کام انجام دیتے ہیں۔ یہ خریف کی فصل کہلاتی ہے اور ساٹھ دن کے فاصلے پر اسے کاٹ لیا جاتا ہے۔ ہندوستان کے جملہ محصولات میں سب سے زیادہ چاول کی فصل سے خریف کی آمدنی ہوتی ہے جو گاؤدانہ کی ایک قسم ہے اور ہندوستان میں بیشتر اس کی کاشت کی جاتی ہے۔ دوسرے قسال ؟ (جوار) جو گاؤدانہ سے مشابہہ ہوتی ہے۔ تیسرے شامخ ؟ (باجرہ) جس کا دانہ قسال سے چھوٹا ہوتا ہے۔ شامخ کبھی کبھی بغیر کاشتکاری کے اُگ آتا ہے اور یہ فقیروں، درویشوں، صوفیوں اور مسکینوں کی خوراک

ہے۔ اُس کے دانوں کو جو کہ خود رو طریقے پر اُگ آتے ہیں اور ایسے علاقوں میں ہوتے ہیں۔ جو کسی خاص شخص کی ملکیت نہیں ہوتے۔ اُنھیں جنگل سے اکٹھا کر لیا جاتا ہے۔ جمع آوری کے لیے ایک بڑا سا ٹوکرا اپنے ساتھ لیتے ہیں۔ اُسے شامخ کے پودے کے نیچے رکھتے ہیں اور اوپر سے چھڑی مارتے ہیں جس سے اُس کے دانے ٹوکرے میں گر جاتے ہیں اور اس ترکیب سے بغیر کاشتکاری کے یہ لوگ اپنا سالانہ رزق جمع کر لیتے ہیں۔ شامخ کے دانے بہت چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔ اُن کو جمع آوری کے بعد دھوپ میں سُکھاتے ہیں اور اُس کے بعد اوکھلی میں کوٹتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کا چھلکا اُتر جاتا ہے اور سفید گری نکل آتی ہے اور اُس سے کھیر پکائی جاتی ہے اور اُس میں بھینس کا دودھ ڈالا جاتا ہے جس سے وہ خوش ذائقہ ہو جاتی ہے۔ باجرہ کا یہ حلوہ یا کھیر اُس کی روٹی سے زیادہ مزے دار ہوتی ہے۔ میں ہندوستان میں اکثر اُسے کھاتا تھا اور بہت لُطف آتا تھا۔

چہارم ماش (یعنی اُڑد کی دال) پنجم مونگ

یہ ایک خاص طرح کا دانہ ہوتا ہے اور اُس میں نشاستہ کافی سے زیادہ ہوتا ہے کہ وہ بھی ماش کی ایک قسم ہے اور اُس میں یہ فرق ہوتا ہے کہ اُس کے دانے دراز ہوتے ہیں اور اُس کا رنگ سبز ہوتا ہے۔ مونگ کو چاولوں کے ساتھ بھی پکایا جاتا ہے اور گھی ڈال کر کھایا جاتا ہے۔ اس غذا کو کھچڑی کہتے ہیں اور صبح کی غذا اکثر وہی ہوتی ہے اور ہندوؤں کے یہاں یہ حریرہ کی شکل میں ہوتی ہے اور اس میں پانی زیادہ ہوتا ہے۔

ششم لوبیا

یہ باقلے کی ایک قسم ہے۔

ساتویں موٹ

یہ کرزمرہ ؟ (   ) کی طرح ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ اُس کے دانے

زیادہ چھوٹے ہوتے ہیں۔ موٹ چوپاؤں کو بھی کھلائی جاتی ہے اور حیوانات کو خوب چاق و چوبند رکھتی ہے۔ "جو" ہندوستان میں بہت کم قوت ہے ۔۔۔ اسے موٹ کے ساتھ کوٹتے ہیں اور پانی ملاکر اُس کا خمیر تیار کرتے ہیں اور پھر کھلاتے ہیں۔ اس میں دو بار پانی دیا جاتا ہے اور بجائے قصیل ؟ ( ) کے ماش کے پتوں سے کام لیا جاتا ہے۔ اس ترکیب سے کہ دس دن تک روزانہ تین یا چار رطل روغن چوپایوں کو کھلاتے ہیں اور اس زمانے میں انھیں سواری کے کام میں نہیں لاتے۔ اُس کے بعد ایک ماہ تک اُسے ایردھ کے پتے کھلاتے ہیں۔

جن دالوں یا فصلوں کا ذکر آیا وہ سب کے سب موسمِ خریف کے محصولات میں سے ہیں۔ اس فصل کو کاٹنے کے بعد ربیع کی فصل بوئی جاتی ہے یہ فصلِ بہار میں کی جانے والی کاشت سے مُراد گندم، جو، چنا اور مسور ہے۔ اس کی کاشت خریف کی فصل کی جگہ کی جاتی ہے۔ اس نواح کی مٹی بہت زرخیز ہے۔ چاول کو سال بھر میں تین مرتبہ بویا جاتا ہے چاول کی فصل ہندوستان کی سب سے بڑی فصل ہے۔ تل اور نیشکر کو فصلِ خریف کے ساتھ بویا جاتا ہے۔

وصفِ دہلی

دہلی کا رقبہ زیادہ تر آباد اور بہت معمور ہے شہر دہلی اس وقت چار شہروں سے مل کر تشکیل پاتی ہے جو ایک دوسرے کے قریب واقع ہیں۔ بلکہ بالکل ملے ہوئے ہیں ایک کا تو یہی دہلی نام ہے جو ہندوؤں کے وقت کا قدیم شہر ہے۔ شہر دہلی ۵۸۴ھ میں فتح ہوا۔ دوسرے شہر کا نام سیری ہے جسے دار الخلافہ کہہ کر بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اس کو سلطان غیاث الدین تغلق نے مستنصر باللہ خلیفۂ بغداد کے نواسے کو دیدیا تھا۔ سلطان علاؤ الدین خلجی اور اُس کا بیٹا قطب الدین مبارک شاہ اسی شہر میں رہا کرتے تھے۔ تیسرا تغلق آباد ہے کہ اُس کو سلطان غیاث الدین تغلق نے (موجودہ سلطانِ ہند جس کا بیٹا ہے) بنایا تھا اور اس کا سبب یہ تھا جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز وہ سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے سامنے بیٹھا تھا تب اُس

نے اُس سے کہا کہ اخوندِ عالم کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہاں ایک شہر بسایا جاتا۔ سلطان نے ایک گونہ تند لہجہ میں یہ بات کہی کہ جس وقت تو میری جگہ پر تخت نشیں ہو جائے اُس وقت ایسا کرنا۔ تقدیرِ الٰہی بھی کچھ اسی طرح تھی کہ قطب الدین مبارک شاہ کے بعد سلطنت غیاث الدین تغلق کو مل گئی اور اس شہر کی بھی اُس نے بنیاد قائم کی اور اپنے نام پر ہی اُس کا نام رکھا۔

چوتھی دہلی جہاں پناہ ہے جو کہ مخصوص طور پر محمد بن تغلق سلطانِ ہند کی قیام گاہ ہے۔ ہم جس کے حضور میں پہنچے تھے۔ اس دہلی کو محمد بن تغلق نے خود بنایا۔ سلطان یہ خیال رکھتا تھا کہ چاروں شہروں کو ایک ہی شہر بنا دے اور اُن کے چاروں طرف ایک حصار کھینچ دیے۔ لیکن کیونکہ اس کے اخراجات بہت ہوتے تھے اس لیے اس کو مکمل کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

حصارِ دہلی

جو شہر پناہ دہلی کے گرداگرد واقع ہے اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ اس دیوار کی چوڑائی گیارہ گز ہے اور اُس میں ایسے اُطاق بنے ہوئے ہیں جو قراولوں اور دروازے کے محافظ سپاہیوں کے کام آتے ہیں اور اسی کے ساتھ اُس میں ایسے ذخیرہ گاہیں (مخازن) بنے ہوئے ہیں جن میں اسلحہ وغیرہ رکھے جاتے ہیں۔ شہر پناہ کی حفاظت کے لیے منجنیق اور اسی طرح سے آگ برسانے والے کچھ ہتھیار بنائے گئے ہیں۔ یہاں انبار کے نام سے کچھ ایسے مخازن بھی ہیں (کھیتوں کی قسم کی چیزیں)، جن میں ایک لمبی مدت تک غلہ کو محفوظ رکھا جاتا ہے اور وہ خراب نہیں ہوتا۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ ان انباروں میں سے چاول باہر نکالے گئے۔ اُن کا رنگ تو بدل گیا تھا اور سیاہ ہو گیا تھا لیکن ذائقہ اسی طرح کا تھا اور اسی طریقے سے ایک دوسرے انبار سے مکئی نکالی گئی۔ یہ تمام ذخیرے سلطان بلبن کے زمانے سے چلے آ رہے ہیں یعنی اب سے تقریباً نوے سال پہلے اُن کو ذخیرہ کیا گیا تھا۔ شہر پناہ اندر سے کچھ اس طور پر بنائی گئی ہے کہ سوار اور پیادے اوّلِ شہر سے انتہائے شہر تک اُس کے ساتھ ساتھ جا سکتے ہیں۔ اس میں ایسی جالی دار کھڑکیاں لگی ہوئی ہیں جو شہر کی طرف کھلتی ہیں

اور اُن سے روشنی شہر پناہ کے طاقوں اور حجروں میں پہنچتی ہے۔ شہر پناہ کا زیرین حصہ پتھر سے اور اُس کا بالائی حصہ چونے اور گنج سے بنا ہوا ہے۔ اُس کے برج ایک دوسرے سے نزدیک بنے ہوئے ہیں اور اچھی بڑی تعداد میں ہیں۔

شہر دہلی کے اٹھائیس در ہیں کہ اُن کو دروازہ کہا جاتا ہے۔ ان میں سب سے بڑا دروازہ بدایوں دروازہ اور منڈی دروازہ ہے۔ منڈی اس لیے کہ مختلف اناجوں کی خرید و فروخت وہیں ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک در "دروازۂ گل" کہلاتا ہے کہ جس میں بہت سے باغات ہیں۔ اسی طرح ایک در "دروازۂ شاہ" کہلاتا ہے کسی شاہ کے نام پر ہے۔ دروازۂ پالم (ایک قریہ کا نام ہے) اسی طرح دروازۂ نجیب کہ یہ بھی کسی کے نام پر ہے اور دروازۂ کمال کمال نامی کسی شخص سے نسبت رکھتا ہے اور اسی طرح "دروازۂ غزنہ" جو شہر غزنی سے منسوب ہے کہ اطرافِ خراسان واقع ہے۔ عیدگاہ اور بعض مقبرے اسی دروازے کے سامنے ہیں۔

ایک اور دروازے کا نام بجالسہ (کذا) دہلی کے قبرستان اسی دروازے کے باہر واقع ہیں۔ یہ گورستان بڑی خوبی سے بنائے گئے ہیں۔ یہاں کے معمول کے مطابق قبروں پر گنبد بنائے جاتے ہیں۔ اگر کسی قبر پر گنبد نہیں ہوتا تو محراب ضرور ہوتی ہے۔ گلِ شبو، رائے بیل جوہی اور دوسرے طرح طرح کے پھول یہاں کے گورستانوں میں بوئے جاتے ہیں۔ یوں بھی پھول ہندوستان میں بہت پیدا ہوتا ہے۔ ور کسی فصل میں بھی ایسا نہیں ہوتا کہ پھول دستیاب نہ ہوں۔

مسجد جامع دہلی

دہلی کی جامع مسجد بہت وسیع ہے۔ اُس کی دیواریں اُس کے سقف و ستون اور فرش و فروش سفید پتھر سے تراشے گئے ہیں اور سنگ تراشی کا بہت اچھا نمونہ ہیں۔ جو بڑی مہارت کے ساتھ مسالے کی مدد سے ایک دوسرے سے جوڑے گئے ہیں لکڑی اس کی تعمیری ساخت میں کہیں استعمال نہیں ہوئی۔ یہ مسجد، تیرہ سنگین گنبد اور چار صحن

(دالان) رکھتی ہے۔ اُس کا منبر بھی پتھر ہی سے بنایا گیا ہے۔ مسجد کے وسط میں ایک بہت بڑا پُر ہیبت ستون ہے جس کے لیے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کونسی کھان سے نکلا ہے۔

ہندوستان کے حکما میں سے ایک شخص نے مجھ سے یہ کہا کہ یہ دھات "ہفت جوش" کہلاتی ہے اور اس لفظ کا مفہوم یہ ہے کہ اُس کو سات مختلف دھاتوں سے ترکیب دیتے ہیں۔ اس ستون میں ایک ایسی جگہ بھی ہے جسے ایک انگشت سبابہ کے بقدر تراشا گیا ہے اور وہاں سے بجلی کی طرح کوئی چیز چمکتی ہے۔ لوہا اس ستون میں کارگر نہیں ہوتا اس کی لمبائی تیس گز ہے اور اس کی گولائی یا قطر کو میں نے اپنے عمامے کو اس کے گرد لپیٹ کے ناپا تو مجھے پتہ چلا کہ وہ سات گز ہے۔

مسجد کے شرقی دروازے کے قریب دو بہت بڑے پتھر پڑے ہوئے ہیں اور دونوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا گیا ہے جو شخص کہ یہ چاہتا ہے کہ وہ مسجد میں داخل ہو تو اُس کے قدم ان پتھروں پر پڑتے ہیں۔ یہ مسجد پہلے کسی بت خانے کی شکل میں تھی کہ فتح دہلی کے بعد اُس کو مسجد بنا دیا گیا۔ مسجد کے شمالی صحن میں ایک ایسا مینار موجود ہے کہ جس کی نظیر تمام بلاد اسلامیہ میں بھی نہیں ہے۔

اس مینار کو سنگِ سُرخ سے بنایا گیا ہے۔ جبکہ مسجد کے باقی دوسرے حصے سنگِ سفید سے بنے ہیں جو پتھر اس مینار میں استعمال ہوا ہے۔ وہ بڑی بڑی سلوں کی شکل میں ہے اور یہ منقوش ہیں۔ اُس کا فرش مرمرِ سفید سے بنا ہے جو بہت ہی روشن اور پاکیزہ ہے اور اس کے گلدستے سنہرے کام سے آراستہ ہیں۔

(ورود ابن بطوطہ بہ دہلی)

شہرِ دہلی میں ورود کے بعد ہم دربارِ سلطانی کی طرف روانہ ہوئے اور یکے بعد دیگرے چلے، دوسرے اور تیسرے دروازے سے گذرے ہم نے وہاں نقیبوں کو پایا اور انہوں نے ایک وسیع و عریض ہال کی طرف ہماری رہنمونی کی۔ خواجہ جہاں کہ وزیرِ سلطان تھا اس سے یہاں ملاقات ہوئی وہ ہمارا منتظر تھا۔ ضیاء الدین خداوندزادہ سب سے آگے تھا، اس کے پیچھے اس کے بھائی قوام الدین اور عماد الدین تھے۔ ان کے عقب میں خود میں تھا اور میرے بعد خداوند زادے کے بھائی برہان الدین، پھر امیر مبارک سمرقندی، ترک امیر نیز خداوند زادے کے بھانجے اور بدر الدین فصمال ترتیب کے ساتھ وارد ہوئے۔

درِ سوم سے گذر کر ہم اس بڑے دربار ہال میں پہنچے جس کو "قصرِ ہزار ستون" کہا جاتا ہے یہ عوام کی پزیرائی کا محل (دیوانِ عام تھا) وزیر یہاں پہنچ کر کورنش بجالایا۔ اور اس نے اس طرح اپنے سر کو جھکایا کہ قریب تھا کہ وہ زمین سے جا لگے۔ ہم نے بھی جھک کر اپنی انگلیوں سے "زمینِ خدمت" کو چوما اور جس جانب کہ سلطان گردن کو خم کیے بیٹھا تھا اسی سمت اپنا سر جھکا دیا۔ میرے ہمراہیوں نے بھی یہی رسمِ سلام ادا کی۔ بعد ازاں نقیبوں نے بلند آواز میں "بسم اللہ" کہا اور ہم باہر آگئے۔

مادرِ سلطان سے ملاقات

سلطان کی والدہ مخدومۂ جہاں دنیا کی بہترین عورتوں میں سے ہے جو صدقات و خیرات میں بہت پیش دستی کرتی ہے اور غریب غربا، لوگوں اور مسافروں کے واسطے اس نے بہت سی قیام گاہیں بنوائی ہیں جہاں فقراء اور مساکین کو کھانا کھلایا جاتا ہے لیکن اب وہ بینائی سے محروم ہے اور اس کی کہانی یہ ہے۔

کہ جب اس کا بیٹا سریر آرائے سلطنت ہوا تو شاہی خاندان کی تمام محترم خواتین شہزادگان والا نماد، شہزادیاں اور امراء کی بیٹیاں بہترین لباس زیب تن کر کے وہاں آئیں

کہ بادشاہ کا دیدار کریں۔ سلطان کی والدہ ایک جواہر نگار و مرصع کار تخت پر رونق افروز تھیں اس وقت کچھ ایسی چکا چوند دیکھنے میں آئی کہ مخدومۂ جہاں کی بینائی جاتی رہی —— بہت علاج معالجہ کیا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔

سلطان انھیں بہت عزیز رکھتا ہے اور ان کا احترام بجالاتا ہے ایک بار موکب سلطانی کسی منزل کی طرف عازم سفر تھا، سلطان اثنائے راہ میں اپنا گھوڑا دوڑاتے ہوئے آگے بڑھ گیا کہ وہ مخدومۂ جہاں سے آگے پہنچ کر ان کا استقبال کرے اور جب مخدومۂ جہاں کی سواری پہنچی تو سلطان گھوڑے سے اتر کر پاپیادہ ہو گیا اور سب ارکان دولت کے سامنے محل سے باہر آئے ہوئے ان کے قدموں کو بوسہ دیا۔

جب ہم دولت سرائے سلطانی سے باہر آئے وزیر بھی ہمارے ساتھ آیا اور ہم کو حریم سلطانی کی طرف لے گیا، یہاں مخدومۂ جہاں کی اقامت گاہ تھی دروازہ کے قریب آ کر ہم گھوڑوں سے اتر پڑے اور پیدل چلنے لگے۔ ہم میں سے ہر ایک اپنی حیثیت کے مطابق ہدیہ لایا تھا۔ قاضی القضاۃ ممالک کمال الدین بن برہان (الدین) بھی ہمارے ساتھ تھے۔ قاضی اور وزیر نے زمین خدمت کو چوما، ہم بھی جائے ادب پہنچ کر حسب دستور تسلیم و آداب بجالائے۔

جو وزیر حرم سرا کے دروازے پر تھا، وہ ہمارے پیش کردہ ہدیوں پر مہر ثبت کر رہا تھا۔ اس وقت پیش خدمتوں کی ایک جماعت باہر آئی اور ان میں جو سب سے محترم تھا اس نے وزیر کے کان میں، سرگوشی کے انداز سے کچھ کہا اور محل سے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں دوبارہ اس طرف آیا اور اسی رازدارانہ انداز سے کوئی بات کی اور مراجعت اختیار کی۔

اس آمد و شد کے دوران ہم برابر کھڑے رہے، بالآخر وہ وقت آیا کہ ہمیں بیٹھنے کی اجازت دی گئی۔ جن پر تکلف ظروف میں کھانا لایا گیا ان میں ایک بڑے سے برتن کا نام "سینی" تھا یہ دیگ سے بہت کچھ مشابہ تھا، اس پر ایک سنہری کام کا سرپوش ڈھکا ہوا تھا، اسے "سبک" کہتے تھے۔

ان کے علاوہ زرنگار مراجیاں، طلائی کام سے آراستہ طشت اور بلوریں جام لائے گئے اور کھانے کے لیے دسترخوان چنے گئے۔ ہر دسترخوان کے ساتھ دو صفیں تھیں جو مہمان بڑے درجے کے تھے

ان کو دسترخوان کے صدر میں بٹھایا گیا۔
جب ہم سب اپنے اپنے مرتبے کے مطابق سفرۂ طعام پر بیٹھ گئے تو نقیبوں اور حاجبوں نے نذرانۂ سلام پیش کیا اس کے جواب میں ہم بھی آداب بجالائے۔ اس وقت شربت لایا گیا اور ہم سب نے اُسے نوش جان کیا اور حاجبوں نے "بسم اللہ" کہا اور ہم نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا کھانے کے خاتمہ پر الائچی اور پان پیش کیا گیا جس کے بعد حاجبوں نے باآوازِ بلند "بسم اللہ" کہا اور ہم سب نے بھی اس کے جواب میں نذرانۂ سلام پیش کیا۔
بعد ازاں ہم کو ایک اطاق میں لایا گیا اور زربفت اور ریشمیں پارچوں کے رومال دیے گئے اس کے بعد ہمیں محل کے دروازہ پر لایا گیا اور ہم کورنش بجالائے حاجبوں نے بسم اللہ کہا وزیر ایستادہ ہو گیا ہم نے بھی توقف کیا اندرون قصر سے بغیر سلے ہوئے کپڑے جو از قسم حریر و ناں اور کتان و نخ وغیرہ تھے، ہر شخص کو اس کے حصّے کے مطابق دیے گئے۔ اس کے بعد ایک سنہرے برتن میں خشک میوے اور ایک ایسے ہی دوسرے ظرف میں، کہ وہ بھی طلاکاری سے مزین تھا، شربت پیش کیا گیا اسی کے ساتھ ظرف آب بھی تھا۔
یہاں کا طریق اور درباری دستور کچھ اس طرح پر تھا کہ جس شخص کی اس طور پر رسم پزیرائی ادا کی جائے اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس ظرف کو ایک ہاتھ میں لے اور اپنے دوش پر رکھے اور دوسرے ہاتھ سے زمین خدمت کو چھو کر سلام پیش کرے وزیر نے وہ ظرف اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مقصد یہ تھا کہ مجھے وہ یاد دلائے کہ اس موقعہ پر مجھے کیا کرنا ہے اور یہ بھی اس کی خوبی اور تواضع پیشگی تھی۔
جب میں یہ حسب دستور ادا کر چکا تو ایک ایسی حویلی میں ہمیں پہنچا دیا گیا جو دروازۂ پالم سے قریب تھی اور جہاں ہم کو ٹھہرانا مقصود تھا، بعد ازاں ہمارے لیے تورۂ ضیافت آیا۔
جب ہم مہمان خانے میں پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ وہاں فرش فروش اور راحت و استراحت کے دوسرے لوازمات پہلے ہی سے مہیا تھے۔ ہندوستان میں خواب راحت کے لیے بنائے جانے والے تخت، پلنگ یا مسہری، بہت ہلکے ہوتے ہیں اور ایک آدمی یکتا و تنہا اُٹھا کر لے جا سکتا ہے اور جو آدمی مسافرت اختیار کرتا ہے وہ اپنے سونے کے پلنگ

کو بھی بہ آسانی اُٹھا کر لے جاتا ہے یا پھر اس کا غلام یا ملازم جو اس کے ساتھ چل رہا ہو۔
یہاں کے یہ تخت لکڑی کے چار پایوں اور چوبی پٹیوں سے نیم مخروطی شکل کے بنائے جاتے ہیں۔ اور ان کو ریشم یا روئی وغیرہ کے بانوں سے بُنا جاتا ہے جو انسان ان پر سوتا ہے تو یہ ضروری نہیں ہوتا کہ سونے والا ہلکی سی نمی کا اہتمام کرے کہ یہ تو پلنگوں میں خود بخود موجود ہوتی ہے اسے ان ہلکی ہلکی مسہریوں کے ساتھ دو تکیے اور ان کے ساتھ بستر اور لحاف بھی لائے گئے کہ ان کے ابرے غلاف اور چادریں حریر سے تیار کی گئی تھیں۔
یہاں کے لوگوں کی عادت یہ ہے کہ ان چیزوں کو روئی یا کرپاس کے تہہ پوشوں میں رکھتے ہیں کہ جب وہ میلے ہو جاتے ہیں تو ان کو دھو لیتے ہیں کہ اس کے باعث یہ سب چیزیں صاف ستھری رہتی ہیں۔ اسی رات کو دو آدمی اور بھی وہاں لائے گئے کہ ان میں سے ایک آسیابان (چکی پیسنے والا) اور دوسرا قصاب تھا اور ہم سے کہا گیا کہ ایک سے ہر روز اتنا آٹا اور دوسرے سے اتنا گوشت لے لیا کریں۔ مجھے ان کا پیمانۂ وزن تو یاد نہیں رہا لیکن رسم یہ ہے کہ گوشت اور آٹے کی مقدار برابر رہتی ہے۔
جو کچھ یہاں بیان کیا گیا وہ مادرِ سلطان کی طرف سے رسم ضیافت کے طور پر تھا سلطان کی طرف سے ہماری ضیافت جس طور پر ہوئی اس کا تذکرہ بعد میں کیا جائے گا۔
اگلے روز ہم سرائے سلطانی میں گئے ہم نے وزیر کو سلام کیا اس نے دو تھیلیاں مجھے دیں جن میں ایک ہزار دینار تھے اور کہا یہ "سرشتی" کے طور پر ہے۔ جس سے مراد سرشوئی یا حمام کا خرچ ہے اور اسی کے ساتھ "مرغزی خلعت" بھی مجھے مرحمت کیا اور میرے تمام ساتھیوں خادموں اور غلاموں کے نام لکھ لیے اور ان کو چار گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ گروہ اول کو دو سو دینار فی کس گروہِ دوم کو یک صد پنجاہ دینار گروہِ سوم کو سو دینار اور گروہ چہارم کو پچھتر دینار دیے گئے۔ میرے آدمی کل ملا کر چالیس کے قریب تھے اور جو کچھ ان کو دیا گیا وہ چار ہزار اور کچھ دینار تھے۔
بعد ازاں، ضیافت سلطانی متعین ہوئی کہ وہ ہزار رطل ہندی کے برابر آٹے کی مقدار تھی ان میں ایک ثلث سفید آٹا تھا اور دو ثلث دوسری طرح کا آٹا، سفید آٹے کو "میدا" کہا جاتا ہے اور دوسری طرح کے آٹے کو "خوش کار" اسی طرح ہزار رطل گوشت اور اسی

نسبت سے شکر، روغن اور نمک فلفل وغیرہ کی مقدار معین ہوئی (جن کی صحیح مقدار اب میرے حافظے میں نہیں)، نیز ہزار برگِ تنبول (پان) — ہندی رطل بیس رطل مغربی (مراکشی)، اور پچیس رطل مصری کے ہم وزن ہوتا ہے۔ خداوند زادہ کے واسطے جو سامان ضیافت معین ہوا وہ چہار ہزار رطل آٹا اور اسی قدر دوسری اشیاء۔

ابن بطوطہ کی بیٹی کی وفات اور ہندوستان کی تعزیتی رسمیں

ورود دہلی کے بعد ہم پر ایک ڈیڑھ سال گزر رہا تھا کہ میری چھوٹی بیٹی کہ جس کی عمر ایک سال سے بھی کم تھی وفات پاگئی وزیر کو جب اس بات کی اطلاع ہوئی اس نے اجازت دی کہ اُسے دروازۂ پالم کے ایک گوشہ میں جہاں شیخ ابراہیم قونوی کا مقبرہ تعمیر کیا گیا ہے دفن کریں مراسم تعزیت کی بجا آوری کے لیے اجرائے فرمان کی غرض سے سلطان کو اس سانحہ سے مطلع کیا گیا اور حکم نامہ کی اجرا کے لیے التماس شبِ دوم سلطان کی طرف سے جواب آگیا اس صورت میں کہ سلطان اپنی شکارگاہ میں تھا جو دہلی سے دس روز کی پاپیادہ مسافت کی دوری پر تھی۔

ہندوستان کی رسم یہ ہے کہ میت کو سپردِ خاک کرنے کے تیسرے روز صبح کے وقت اس کی قبر پر حاضری دیتے ہیں اور قبر کے چاروں طرف فرش فروش بچھاتے ہیں جو ریشمی کپڑوں کے بنے ہوتے ہیں اور پھولوں کے گل دستے قبر پر بطور نذر چڑھاتے ہیں۔ ہندوستان میں پھول ہر فصل میں کھلتے ہیں اور کبھی بھی ان کا سلسلہ منقطع نہیں ہوتا اور برگ ریز کا موسم نہیں آتا۔ چنبلی اور گل شبو کہ زرد رنگ کا ہوتا ہے نیز "بہول" کہ وہ سفید ہوتا ہے۔ ان کے ماسوا نسرین و نسترن کے پھول ہیں کہ وہ بھی سفید اور زرد رنگ کے ہوتے ہیں۔

لیمو اور نارنج کی شاخیں کہ وہ پھل دار ہوتی ہیں اور اگر شاخ میوہ دار نہیں ہوتی تو لیمو یا نارنج یا ترنج کے چند دانے ان کی شاخوں میں لٹکا دیے جاتے ہیں اور انھیں قبر پر چڑھایا جاتا ہے اسی طرح خشک میوے جیسے ناریل وغیرہ قبر پر رکھتے ہیں۔ جمع ہونے والے لوگ اپنے ساتھ قرآن پاک لے کر آتے ہیں اور پارہ ہائے قرآن کی قرأت میں مشغول ہوتے ہیں۔ اس

کے بعد لوگوں پر عرق گلاب چھڑکا جاتا ہے ان کی شربت سے تواضع کی جاتی ہے اور برگ تنبول پیش کیا جاتا ہے۔ ان رسوم کی ادائیگی کے بعد یہ مجمع واپس ہو جاتا ہے۔

سوم کی رسم کے دن جو میت کو دفن کے بعد کا تیسرا دن ہوتا ہے ہم لوگ بوقت صبح مرنے والی کی قبر پر گئے میں نے اپنی حیثیت کے مطابق سب چیزوں کو فراہم بھی کیا لیکن وہاں جاکر یہ دیکھا کہ وزیر مجھ سے پہلے تمام ضروری سامان کے ساتھ وہاں پہنچ چکا ہے۔ اس کے ایما پر بالائے قبر ایک چھوٹا سا شامیانہ لگا دیا گیا تھا ہم نے حاجب شمس الدین پشنگی کہ وہ ہم سے پہلے سندھ آیا تھا، قاضی نظام الدین گروانی اور بزرگان شہر میں سے ایک سربرآوردہ شخص کو وہاں موجود پایا۔

میرے جانے سے پہلے یہ لوگ وہاں پہنچ چکے تھے اور حاجب نے ان سے بھی سبقت کی تھی، یہ لوگ قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے۔ میں اپنے ہمراہیوں کے ساتھ قبر کے قریب جاکر بیٹھا ـــ جب لوگ قرآن پڑھ چکے تو اب قاریوں کی باری تھی کہ وہ خوش الحانی اور بلند آہنگی کے ساتھ ختم پڑھنے کا آغاز کریں۔ بعد میں قاضی اٹھا اور اس نے وفات پانے والی لڑکی کے تئیں مرثیہ پڑھا نیز سلطان کی تعریف میں انشا کیے گئے اشعار پڑھے جب سلطان کا نام آیا تو تمام حاضرین کھڑے ہو گئے ـــ قاضی نے دعائے خیر کی۔

حاجب اور اس کے مامور کردہ سوگواران نے، گلاب دان ہاتھوں میں لیے اور لوگوں پر گلاب و بید مشک چھڑکا۔ شربت قند کے گلاسوں میں سب کو مشروب پیش کیا گیا بعد ازاں برگِ تنبول نذر کیے۔ ان رسوم کی ادائیگی کے ساتھ میرے اور میرے متعلقین کے لیے گیارہ خلعت مرحمت کیے گئے۔

تعزیت کی ان رسموں کی ادائیگی کے بعد سلطان کے محل کی طرف گئے اور ہم نے سریر سلطانی کی طرف رخ کر کے زمین خدمت کو چوما، بعد ازاں مع اپنے احباب کے میں اپنی رہائش گاہ کی طرف واپس لوٹا میں ابھی اپنے گھر پہنچا بھی نہیں تھا کہ مخدومہ جہاں کے مطبخ سے ہمارے لیے کھانا آگیا اتنا کہ وہ ہم سب نے سیر ہو کر کھایا۔ فقرا و مساکین کو بھی تقسیم کیا گیا اور نان و حلوہ و نیات اتنی وافر مقدار میں آیا تھا کہ اس دن کے بعد بھی کئی روز تک

باقی رہا، یہ سب کام بادشاہ کے حکم سے انجام دیا گیا۔

چند روز کے بعد مخدومۂ جہاں کے غلام دولت (ڈولی) لیے ہوئے میری رہائش گاہ پر آئے ڈولا ایک خاص طرح کا کجاوا ہوتا ہے جو عورتوں کے لیے مخصوص ہے مرد بھی اُس میں سوار ہوتے ہیں، یہ ایک تخت کی طرح ہوتا ہے کہ جو ریشم ونخ کی طرح کی اشیاء سے بنایا جاتا ہے اور ہمارے ہاں رائج "بوچہ" کی طرح چھوٹی چھوٹی لکڑیاں جو ہندوستانی بانسوں کی ہوتی ہیں اُن پر لگادی جاتی ہیں اور آپس میں اُن کے سرے باندھ دیے جاتے ہیں۔ ان تخت ہائے رواں کو آٹھ آدمی باری باری کھینچتے ہیں اور ایک وقت میں چار آدمی اُسے اُٹھانے کے کام میں مشغول ہوتے ہیں اور چار آدمی آرام کرتے ہیں۔

ہندوستان میں یہ تخت رواں دراز گوش کے مشابہ ہوتے ہیں مصر میں جہاں بیشتر آمدورفت انہی کے ذریعہ ہوتی ہے چونکہ غلام بہت ہوتے ہیں اس لیے ایسے تخت ہائے رواں کو یہی غلام اٹھاتے ہیں۔ جن لوگوں کے پاس غلام نہیں ہوتے وہ اس کام کی انجام دہی کے لیے دوسرے لوگوں کو رکھتے ہیں اور اس طرح کا گروہ ہمیشہ بازاروں میں سلطان کے محل کے قریب اور دوسرے محلوں میں موجود رہتا ہے جو معاوضہ لے کر یہ کارگذاری قبول کرتا ہے۔

جو تختِ رواں عورتوں سے مخصوص ہے اس کا پردہ ریشم سے تیار ہوتا ہے بہر نوع اس تخت کو بادشاہ کی ماں کے ہاں سے لایا گیا اور میری اس کنیز کو جو اس مرنے والی بچی کی ماں تھی اس میں سوار کیا گیا اور میں نے ایک ترک کنیز کو اُس باندی کے ساتھ بطور ہدیہ مادرِ سلطان مخدومۂ جہاں کی خدمت میں روانہ کیا ۔ وہ کنیز (مادرِ دختر) ایک شب وہاں رہی۔ دوسرا دن جو اُس کی بازگشت کا دن تھا، اُسے ایک ہزار دینار، طلائی دست بند ایک جڑاؤ گلوبند علاوہ اس کے کپڑے کا ایک ملبوس اور سنہرے کام کا ایک ریشمی خلعت اور چند دوسری طرح کے کپڑے اسے مرحمت کیے گئے۔

میں نے ان کو اپنے ان ساتھیوں اور ان تاجروں کے درمیان تقسیم کر دیا جن کا میں مقروض تھا، مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ جو کچھ میں کرتا ہوں پرچہ نویس اس کی خبر سلطان کو دیتے

رہتے ہیں اس لیے میں اس بات پر مجبور تھا کہ اپنی جان کی امان اور اپنی آبرو کے تحفظ کا خیال رکھوں۔

وہ عطیات جو بادشاہ کے غیاب میں مجھ تک پہنچے

اس اثنا میں سلطان نے یہ فرمان جاری کیا کہ چند قریے جن کی سالانہ آمدنی پانچ ہزار دینار ہوتی تھی میری تحویل میں دیدیے جائیں۔ وزیر اور صیغۂ مالیات کے کارپردازوں نے اس سے متعلق ضروری کارروائی مکمل کی اور میں اس ملکیت پر قابض و متصرف ہوا۔ ان جملہ قریہ جات میں سے ایک قریہ کا نام "بادلی" تھا، دوسرے کا "بسئی" اور اسی طرح ایک آدھا گاؤں "پالم" تھا۔

یہ قریے میری جائے قیام سے پندرہ سولہ کوس کے فاصلے پر واقع تھے اور ان کو صدی "ہندپت" کہتے تھے صدی سو قریوں کے مجموعہ کو کہتے ہیں شہر کے مضافات میں بسے ہوئے قریہ جات کو "صدی" میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر صدی پر ایک چودھری ہوتا ہے بیشتر اس چودھری کے لمبی سفید ڈاڑھی ہوتی ہے یہ شخص اہل ہنود سے ہوتا ہے اس کے ماسوا جس افسر مالی کی تقرری "متصرف" کے نام سے ہوتی ہے وہ دراصل متصدی ہوتا ہے صدی سے وابستہ قریہ جات کے محاصل کی جمع آوری اور حساب داری اسی سے متعلق ہوتی ہے۔

اسی زمانے میں اہل ہند کے سربرآوردہ لوگوں میں سے ایک کو گرفتار کر کے لایا گیا تھا۔ وزیر نے اس کی بیٹیوں میں سے دس لڑکیوں کو میرے پاس بطور باندیوں کے بھیج دیا میں نے ان میں سے ایک باندی تو اسی شخص کو بخشدی جو انھیں میرے پاس لایا تھا وہ اس پر راضی نہ ہوا۔ تین خوردسال لڑکیوں کو میرے اپنے آدمیوں نے لے لیا باقی کے بارے میں کوئی فیصلہ میں نہ کر سکا کہ کیا کیا جائے۔

قیدی ہندوستان میں بہت ہی کم قیمت پر خرید و فروخت ہوتے ہیں۔ ہندوستان کی لڑکیوں کی قیمت اور بھی کم لگتی ہے کہ وہ ادب و تمیز سے بے بہرہ ہوتی ہیں جو کنیزیں تعلیم یافتہ ہوتی ہیں وہ بھی معمولی قیمت کی ہوتی ہیں اس لیے کوئی ان اسیروں کو خریدتا نہیں۔

ملاقات ابن بطوطہ با سلطان ہند

دوسرے روز جمعہ کے دن سلطان کے ورودِ دہلی کے موقع پر ہم دربارِ سلطانی کے سامنے پہنچے اور وہاں کے مخصوص سقیفوں میں سے ہم تیسرے دریے میں جاکر بیٹھ گئے چونکہ ابھی تک ہماری حاضری و ورود کا اجازت نامہ صادر نہیں ہوا تھا۔ حاجب دربار شمس الدین پوشنگی آیا اور اس کا حکم دیا کہ دبیر ہمارے نام لکھے اور اجازت دی کہ میں اپنے چند ہمراہیوں کے ساتھ حاضری کے لیے آگے آؤں۔ ترتیب یہ مقرر ہوئی کہ آٹھ آدمی میرے ساتھ داخل ہوں اس وقت اشرفیوں سے بھری تھیلیاں ایک عدد طشت میں رکھی ہوئی وہاں لائی گئیں۔ قاضی القضاۃ اور دبیروں نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو بلایا اور ہر آدمی کو اُن تھیلیوں میں سے ایک تھیلی اس کے حصّے کے طور پر مرحمت کی ان میں سے پانچ ہزار دینار میرے حصّے میں آئے۔ یہ رقم اُن ایک لاکھ دیناروں میں سے تھی جنھیں سلطان کی ماں مخدومہ جہاں اپنے بیٹے کے ورودِ دہلی کے موقع پر بطور شکرانہ و بعنوانِ صدقہ تقسیم کرنا چاہتی تھی۔ اس کے بعد سلطان ہمیں کھانے پر بلاتا تھا اور ہمارے حال احوال کی پرسش کرتا رہتا تھا اور بڑی خوشنودی کے ساتھ ہم سے گفتگو کرتا تھا۔

ایک دن اس نے کہا تم نے اپنے ورود سے ہمیں مشرّف کیا۔ میں اس کا کوئی بدلہ نہیں دے سکتا تمہارے بزرگ میرے باپ کی جگہ پر ہیں اور تمہارے جوان الغ عزیز میرے بھائیوں کا سا درجہ رکھتے ہیں اور اسی طرح تمہارے بچّے میرے بچّے ہیں۔ میرے تمام ملک میں کوئی شہر دہلی سے بڑا شہر نہیں ہے اور یہ میں تمھیں بخشتا ہوں۔ ہم نے اظہار تشکّر کیا اور سلطان کی تعریف کی۔ سلطان نے ہمارے لیے وظائف مقرر کر دیے چنانچہ بارہ ہزار دینار سالانہ میرے لیے مقرر کیا گیا نیز دو قریے ان تین قریوں پر جو پہلے مجھے عطا کیے گئے تھے اور اضافہ کیے اُن میں سے ایک کا نام جوجہ تھا اور دوسرے کا نام ملک پور۔

ایک دن خداوند زادہ غیاث الدین اور قطب الملک حاکم سندھ ہمارے پاس آئے اخون زادہ نے فرمایا تم میں سے جو آدمی اپنے اندر جس ذمہ داری کو سنبھالنے کی صلاحیت رکھتا ہو وہ بتلائے تاکہ اُسے وزارت، منشی گیری یا امارت یا عہدہ یا قضا یا درس و تدریس یا پھر شیخِ طریقت

سے متعلق اس کے حسبِ خواہش کوئی ذمہ داری اُسے سونپی جائے۔ سب خاموش رہے اس لیے کہ کہنے والے کا مقصد یہ تھا کہ ہم روپیہ جمع کریں اور اپنے وطن کی طرف واپس چلے جائیں۔

امیر بخت سید تاج الدین کے بیٹے نے جس کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے کہا کہ وزارت میری میراث ہے اور دبیری میرا شغل ہے۔ اس کے علاوہ میں اور کوئی اور بات نہیں جانتا عبداللہ فلکی تبریزی کے پسر نے بھی کچھ ایسی ہی باتیں کہیں۔ خداوند زادے نے عربی زبان میں مجھے مخاطب کیا۔ سیدی تم کیا کہتے ہو (اہل ہند عربوں کو سید کہتے ہیں) میں نے کہا کہ وزارت یا دبیری میرا کام نہیں ہے۔ ہاں قاضی کے عہدہ کی ذمہ داریاں سنبھالنا اور کار مشیخت اختیار کرنا باپ دادا سے میرے خاندان میں چلا آرہا ہے۔ جہاں تک امیری کا سوال ہے یہ جاننا چاہیے کہ اہل عجم اہل عرب کے سامنے بزورِ شمشیر اسلام لائے۔ سلطان کو یہ بات اچھی لگی۔ جب یہ اُس کے گوشۂ سماعت تک پہنچی۔

اس وقت سلطان قصرِ ہزار ستون میں خاصہ تناول کر رہا تھا۔ اس نے ایک آدمی ہمارے پاس بھیجا اور ہم وہاں گئے اور کھانے میں اُس کے ساتھ شریک ہوئے بعد ازاں ہزار ستون سے ہم لوگ باہر آئے۔ میرے ساتھی وہاں بیٹھ گئے لیکن میں نے انتظار نہیں کیا اور اپنے گھر واپس آگیا۔ میرے ایک پھوڑا نکل رہا تھا جسکی وجہ سے میں بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ سلطان نے مجھے دو مرتبہ بلایا تھا اور میرے ساتھیوں نے یہ بات اُس تک پہنچادی تھی کہ میں چلنے پھرنے سے معذور ہوں۔

بعد نماز عصر میں محل میں آیا اور مغرب و عشاء کی نماز وہاں ادا کی اس وقت حاجبِ دربار آیا اور یہ کہا کہ ہم اندر آسکتے ہیں۔ خداوند زادہ ضیاء الدین نے کہ وہ سلطان کے رشتے کے بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اور سلطان نے اُسے "امیر داد" بنایا تھا۔ جو ایک اونچا عہدہ ہے امیر داد وہ شخص ہوتا ہے جو قاضی القضاۃ کی مجلس میں حاضر ہو کر وہ شکایات جو امراء اور ارکانِ دولت سے پہنچتی ہیں ان کو پیش کرتا ہے (امیر داد سے متعلق کام وہی ہوتے ہیں جو مصر و شام اور دوسرے بلاد اسلامیہ میں اس عہدے سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کا مقصد مختلف فریادوں اور شکایتوں کو پہنچانا ہوتا ہے)۔

سلطان نے اپنے پچاس ہزار دینار نقد اور پچاس ہزار دینار کی قیمت کے بقدر مختلف جنس کی اشیاء ایک جامعۂ حریر کے ساتھ جس پر سونے کا کام بنایا گیا تھا اور جسے صورتِ مشیر کہتے تھے۔ اس کے لیے حقِ خدمت کے طور پر متعین کیا تھا۔ اس ملبوس کے آگے اور پیچھے ایک جانور کی صورت نقش تھی اور اس کے اندر سنہرے تاروں کی نقاشی کے ساتھ اُس قیمت کو اُس میں لکھ دیا گیا تھا جو اُس ملبوس کی تیاری میں صرف ہوئی تھی۔ سلطان نے اوّل درجے کا ایک گھوڑا بھی اُسے بخشا تھا گھوڑوں کے ہندوستان میں چار درجات مقرر کیے گئے ہیں اور اُن کی زین کو زین سازی کے اُس اصول کے مطابق جو مصریوں میں رائج ہے بنایا جاتا ہے۔ اُن میں سے دو قسمیں وہ ہیں جن کا ساز چاندی اور سونے کا ہوتا ہے۔

ضیاء الدین کے بعد امیر بخت وارد ہوا۔ سلطان نے حکم دیا کہ وہ وزیر کے ساتھ تخت پر بیٹھے اور مختلف افسرانِ دیوانی کی طرف سے جو حسابات آتے ہیں۔ اُن کی عیار گیری کا عہدہ قبول کرے چالیس ہزار دینار سالانہ بہ سلسلۂ جنس اور چالیس ہزار دینار نقد اُس کے لیے معین کیے اور اُسے "شرف الملک" کا خطاب دیا نیز ایک سنہری ساز کا گھوڑا اُسے عنایت ہوا اور اُسی نوع کا ایک خلعت اُسے مرحمت فرمایا جس کا ذکر اس سے پیشتر کیا جا چکا ہے۔

اس کے بعد عبداللہ تبریزی وارد ہوا۔ جسے سلطان نے خط و کتابت یا مراسلات کی وصول یابی یا روانگی کے لیے مامور کیا اور چوبیس ہزار دینار نقد اور چالیس ہزار دینار کے برابر جنس کا دیا جانا اس کے خرچ سالانہ کے طور پر معین کیا۔ اُس کو بھی ایک خلعت اور ایک طلائی ساز سے آراستہ ایک گھوڑا عنایت ہوا۔

اُس وقت میں حاضر ہوا۔ سلطان اپنے قصر کی بالائی منزل جہاں نما میں تخت پر تکیہ لگائے بیٹھا تھا۔ خواجہ جہاں اور ملکِ کبیر اس کے جلو میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے سلام کیا۔ ملکِ کبیر نے کہا زمینِ خدمت کو بوسہ دو کورنش بجالاؤ، کہ سلطانِ عالم نے تمھیں دہلی کا قاضی بنایا اور سالانہ بارہ ہزار دینار نقد اور بارہ ہزار دینار بصورت جنس تمھارے لیے معین فرمائے ہیں۔ نقد روپیہ تم کل خزانۂ شاہی سے لے سکتے ہو اسی کے ساتھ تمھیں ایک اسپ زین اور لگام کے ساتھ اور ایک خلعت جس کو محرابین کہا جاتا ہے اور جس کے سینے اور پشت پر محراب کی سی شکل بنی

ہوتی ہے جو اس کی بناوٹ میں شامل ہوتی ہے۔

میں نے زمینِ خدمت کو چوما اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے سلطان کے سامنے لے گیا۔ سلطان نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا یہ خیال مت کرنا کہ دہلی کا عہدہ قضا کوئی چھوٹا کام ہے۔ ہماری نظر میں یہ کام نہایت اہم ہے میں اُس کی بات کو سمجھ رہا تھا لیکن میں یہ نہیں کر سکتا تھا کہ اس وقت اس کو جواب دوں۔ سلطان کو عربی آتی تھی۔ لیکن وہ اس میں بات چیت نہیں کر سکتا تھا۔ بہرصورت میں نے کہا کہ میں امام مالک کے مسلک کا تابع ہوں اور اہلِ دہلی حنفی مذہب رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں یہاں کی زبان بھی نہیں جانتا فرمایا میں نے بہاؤالدین ملتانی اور کمال الدین بجنوری کو تیری نیابت کے لیے مامور کر دیا کہ وہ تیرے مشیر کے طور پر رہیں اور تیرا کام یہ ہوگا کہ تو تمام اسناد کو منظم و مرتب کرے اور اُن پر مُہر لگائے۔

سلطان نے بڑی مہربانی سے کہا کہ تو ہمارے لیے ہمارے بیٹے کی جگہ ہے میں نے کہا کہ میں سلطان کا فرماں بردار ہوں اور اُس کی چاکری میرے لیے باعثِ فخر ہے۔ اس کے بعد سلطان نے زبانِ عربی میں یہ جواب دیا کہ نہیں تم تو ہمارے آقا اور مخدوم ہو یہ فقرہ سلطان نے میری دلدہی اور بطور تواضع فرمایا تھا۔

اُس کے بعد سلطان نے امیر بخت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اس کے اخراجات زیادہ ہیں۔ اگر اس کے لیے ..... جو حقوق معین کیے گئے ہیں کافی نہ ہوں یہ بالکل ممکن ہے اگر وہ ان ذمہ داریوں کو پورا کر جائے۔ میں ایک خانقاہ کا انتظام بھی اُس کے سپرد کروں گا کہ وہ وہاں کے فقرا اور صُلحا کی خبرگیری اور نگہداشت کرتا رہے۔ سلطان نے یہ بھی فرمایا کہ اس بات کو عربی زبان میں امیر بخت مجھ تک پہنچائے۔ سلطان کا خیال تھا کہ امیر بخت کو عربی بخوبی آتی ہے جبکہ یہ صورت نہیں تھی۔ اور جب اُس کے مطلب کو دریافت کیا تو فارسی میں اُس سے کہا:

"بروی ..... جانشیبی وان حکایت براو بگوئی و تفہیم کنی تا فردا انشاءاللہ پیش من بیائی و جواب او بگوئی"۔

ابن بطوطہ کی عربی عبارت میں یہ فارسی جملے آئے ہیں جن کا مطلب کچھ اس طرح ہے۔ "تم جاؤ اور ایک جگہ آرام کرو اور یہ حکایت اس سے کہو اور اُسے سمجھاؤ تاکہ کل انشاءاللہ جب تم میرے

پاس آؤ تو اُس کا جواب مجھ تک پہنچاؤ۔"

اس کے بعد ہم نے دربار سے مراجعت کی۔ اس وقت ایک پہر رات جا چکی تھی اور نوبت بج رہی تھی۔ اس ملک کا قاعدہ یہ ہے کہ جب نوبت بج جائے تو پھر کوئی شخص اپنے گھر سے باہر نہ نکلے۔ اسی وجہ سے ہم وزیر کے منتظر رہے تاکہ وہ بھی باہر آجائے اور ہم اس کے ہمراہ جائیں۔ دہلی کے دروازے بند ہو گئے تھے۔ ہم سراپور خان کے کوچہ میں سید ابوالحسن عراقی کے گھر پہنچے اور وہاں ہم نے رات بسر کی۔ یہ آدمی ایک دولتمند شخص تھا اور سلطان کے لیے عراق اور خراسان سے عمدہ زرہیں۔ اسلحہ اور پوشاکیں نیز دوسرا سامان منگواتا تھا اور تجارت کرتا تھا۔

اگلے دن ہم لوگوں کو پھر بلایا گیا اور ہمیں گھوڑے خلعت اور دوسرا مال و اسباب عنایت کیا گیا۔ دیناروں سے بھری تھیلیوں کو ہم نے کندھوں پر اُٹھایا اور سلطان کے سامنے گئے اور اُسے پیش کیا۔ جب گھوڑوں کو سامنے لایا گیا تو ہم نے اُن کے سُموں کے نشانات کو بوسہ دیا۔ اُس وقت ان کی لگام اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر ہم سرائے سلطانی کے دروازے تک انھیں لے گئے وہاں سے سوار ہوئے اور واپس لوٹے یہ شاہی دربار کی رسم ہے جو اسی طرح ادا کی جاتی ہے۔ سلطان نے میرے ساتھیوں کو دس ہزار دینار نقد اور دس خلعت دیے۔ ایسا کوئی سلوک دوسرے لوگوں کے آدمیوں کے ساتھ نہیں ہوا۔ بظاہر میرے آدمی زیادہ گیرائی کے پہلو اپنے اندر رکھتے تھے اور یہی سلطان کے لیے دلچسپی کا باعث ہوا۔ انھوں نے ان عطیوں کو لینے کے بعد زمینِ خدمت کو چوما اور سلطان کی تعریف کی۔

دوسرا عطیہ جو مجھے ملا

قاضئ دہلی کے منصب کو قبول کرنے کے بعد میں ایک دن اُس محل کے سامنے جو مقدمات لانے والوں کے لیے مخصوص تھا۔ ایک درخت کے نیچے بیٹھا تھا اور مولانا ناصر الدین ترمزی کے ایک دانشمند آدمی تھا اور بہت اچھا وعظ کہتا تھا۔ میرے برابر کی نشست پر تھا۔ ایک حاجب ہمارے پاس آیا اور مولانا کو بُلایا وہ سلطان کے سامنے گئے اور سلطان نے ایک خلعت اور اُسی

کے ساتھ قرآن پاک کی ایک جلد جو سنہرے کام سے آراستہ تھی ان کو عنایت کی۔ اس وقت حاجبوں میں سے ایک اور شخص میرے پاس آیا اور کہا کہ مجھے کوئی چیز دے تاکہ میں ایک "تحریر خورد" تیرے لیے حاصل کروں کہ سلطانِ عالم نے تجھے بارہ ہزار دینار مرحمت فرمائے ہیں۔ میں نے خیال کیا کہ وہ حیلہ سازی کر رہا ہے اور اس کی بات کا یقین نہیں کیا۔ لیکن جب اُس نے اپنی بات کو باصرار کہا تو میرے آدمیوں میں سے ایک شخص کہنے لگا کہ میں اسے کچھ دیدیتا ہوں اور اس میں سے دو تین دینار نکال کر اُسے دیئے۔ حاجب نے اس چھوٹی تحریر خط خرد کو باہر نکالا۔

"خط خرد" وہ مختصر تحریر ہے جس کا یہ مضمون ہوتا ہے۔ سلطانِ عالم نے حکم دیا ہے کہ خزانۂ موفورہ سے فلاں شخص کو اتنے دینار یا تنکے دے دیئے جائیں۔ اس تحریر کو امراء میں سے تین آدمی اپنے دستخط اور مُہر سے آراستہ کرتے ہیں ـــ خان اعظم قطلوخاں جو سلطان کا معلّم رہ چکا ہے نیز خریطہ دار اور امیر دولت دار اُن تین امراء میں شامل ہوتے ہیں۔ وہاں سے پھر اُس کو دیوان وزارت میں بھیج دیا جاتا ہے۔ اس دیوان وزارت کے دبیر اس تحریر کی روشنی میں اپنے یہاں اندراج کرتے ہیں۔ اس کے بعد اُسے دیوان اشراف بھیجا جاتا ہے کہ وہاں بھی اس پر مُہر ثبت کی جاتی ہے۔ آخر میں وہ دیوان نظر پہنچتا ہے اور یہاں سے پروانہ یعنی وزیر کی طرف سے اجازت نامہ خزینہ دار کو بھیجا جاتا ہے کہ وہ اتنا روپیہ متعلق شخص کو دیدے۔ دفتر کا خزینہ دار بھی اسے اپنی یادداشتوں میں نقل کرتا ہے اور روزانہ ایسے احکامات کا خلاصہ شامل دفتر کرتا ہے۔ اُس سے متعلق دستاویز وزیر کو بھیجتا ہے۔ وزیر اس کے لیے پھر حکم صادر کرتا ہے کہ آیا رقم کی تحویل فوراً کی جائے یا پھر اس میں توقف کیا جائے۔

بہر حال یہ حوالے قابلِ برداخت ہیں یا فوری خیال کیے جاتے ہیں۔ اگرچہ اس میں وقت زیادہ صرف ہوتا ہے۔ یہ بارہ ہزار روپیہ مجھے چھ ماہ توقف کے بعد ملا اور آخر کار میں نے ایک دوسرے شخص سے مدد لی میں اس کا حال آگے چل کر بیان کروں گا۔ یہاں کا قاعدہ کچھ ایسا ہے کہ اس طرح کے حوالوں میں سے دسواں حصّہ کم کر دیا جاتا ہے اور تب اس کی تفویض عمل میں آتی ہے مثلاً اگر سو ہزار دینار ہوں تو اُس میں سے نوے ہزار دینار ملتے ہیں اور اسی

طرح اگر دس ہزار ہوں تو نو ہزار دینار دیے جاتے ہیں جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ میں نے تاجروں سے ایک رقم بطور قرض لی تھی کہ اُسے سفر کے اخراجات اور سلطان کے لیے تحایف کی خریداری میں صرف کر سکوں۔ یہاں قیام کے زمانے میں بھی آخر مجھے اپنے ضروری اخراجات کے لیے روپیہ کی ضرورت تھی۔ جو تجّار اپنے وطن کی طرف واپسی کے منصوبے بنا رہے تھے۔ اُنھوں نے اپنے مطالبات کی وصولی کے لیے مجھ پر بہت دباؤ دیا۔ میں نے اس سلسلے میں سلطان کی بارگاہ میں ایک قصیدہ پیش کیا اور اُس میں قدرِ تفصیل سے اپنا حال بھی لکھا۔ "قصیدہ ابن بطوطہ در مدح سلطان ہند"

سلطان کی مدح میں لکھا جانے والا ابن بطوطہ کا قصیدہ

ترجمہ:۔ اے تو امیر المومنین ہے اور خداوند بزرگ و برتر نے تجھے بڑا درجہ دیا ہے میں بہت جدوجہد کرتا اور دشت و کوہ سے گزرتا ہوا تیری بارگاہ تک پہنچا ہوں۔

یہ تیرا نشیمنِ جلال جس کی طرف میں اُفتاں و خیزاں آیا ہوں یعنی سلطان کی بارگاہ میری امید گاہ اور جائے پناہ ہے جس کی زیارت کرنا بھی ہزار سعادتوں کا ایک نظر میں حاصل کرنا ہے۔

اگر تیری جائے گاہ خوشی سے بلند ہو تو ہر طرح اس کے لایق ہے کہ تو وہاں بھی سب کا امام اور پیشوا ہو کہ تیری بزرگی و شرف اسی کا مقتضی ہے تو وہ امام فرزانہ اور پیشوائے یگانہ ہے کہ تیری گفتگو تیری طبیعت کے تقاضے کے زیرِ اثر تیرے نیک عمل سے ہم آہنگ رہتی ہے۔

میں ایک ضرورت سے تیری بارگاہ میں حاضر ہوا ہوں اور تیرے فیض و بخشش سے یہ اُمید رکھتا ہوں کہ میری یہ آرزو پوری ہوگی جو تیری بخششوں کے سامنے کوئی درجہ ہی نہیں رکھتی میں اپنی حاجت کو تیرے سامنے بیان کروں اس میں مجھے شرم آتی ہے اور تیری عظمت و جلال کا تصور میرے لبِ اظہار پر مُہر لگا دیتا ہے۔ اے میرے آقا تو جلدی کر کہ جو شخص تیری بارگاہ میں حاضر ہوا ہے۔ قرض خواہوں نے اُسے فشار میں مُبتلا کر رکھا ہے۔

جب یہ قصیدہ بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ وہ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے عرضداشت کا ایک سرا اپنے زانو پر رکھ لیا اور اُس کے ایک گوشہ کو اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ دوسرے گوشہ کو میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا جو بھی شعر میں پڑھتا تھا قاضی القضاۃ کو سناتا تھا اور یہ خواہش

کرتا تھا کہ اُس کے معنی سلطانِ عالم سے بیان کرے قاضی القضاۃ کی زبان سے اُس کے معنی سُن کر بادشاہ اُسے پسند کرتا تھا۔ اس لیے کہ کشورِ ہندوستان میں عربی زبان میں کی جانے والی شاعری کو بہت پسند کیا جاتا ہے۔ جب میں اُن شعروں تک پہنچا جو اوپر پیش کیے گئے ہیں۔ شاہ نے فرمایا میں نے تمھیں مرحمت کیا۔ حاجبوں نے اس وقت وہ میرے ہاتھ سے لے لیا تاکہ وہ مجھے میری جائے گاہ تک واپس پہنچا دیں

میں دربار کی رسم کے مطابق زمیں خدمت کو بوسہ دیا سلطان نے فرمایا اسے مُہلت دو تاکہ پورا قصیدہ پڑھ کر سنائے میں نے اس کا ایک کونہ اپنے ہاتھ میں لیا اور کورنش بجالایا۔ سب نے مجھے مبارک باد دی۔ میں نے تھوڑا توقت کیا۔ بعد ازاں ایک التماس نامہ (جسے عرضداشت کہا جاتا ہے) لکھ کر قطب المُلک کو دیا۔۔ وہ اُس نے سلطان کی نظرگاہ میں پیش کیا۔ فرمایا کہ جاؤ اُسے خواجۂ جہاں کو دیدو اور کہو کہ فلاں شخص کا قرضہ چُکا دے وہ وہاں گیا اور سلطان کا فرمان اُس تک پہنچایا۔ خواجۂ جہاں نے بھی اُس کو قبول کیا۔ اس اثنا میں سلطان نے اس کو یہ حکم دے دیا تھا کہ وہ دولت آباد کی طرف سفر اختیار کرے اور خود سلطان شکار میں نکل گیا میرے ہاتھ کچھ بھی نہ آیا۔ تاخیر کا سبب یہ تھا کہ میں نے طلب گاروں سے یہ بات کہہ دی تھی جب میں سلطان کے محل میں جاؤں اس ملک کی رسم کے مطابق مجھ کو "دروھی" بنالو۔

اس صورت میں سلطان اُن کے قرضے کی رقم کو ادا کر دے گا۔ رسم یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی دوسرے شخص سے کسی چیز کا طلبگار ہوتا ہے اور اُس کو وصول نہیں کر سکتا تو وہ سلطان کے دروازے تک جاتا ہے اور جب وہ شخص جسے روپیہ دینا ہوتا ہے اندر داخل ہونا چاہتا ہے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ میں سلطان کے دروھی کو اُس کے دروازے تک نہیں پہنچنے دوں گا جب تک کہ میرا قرضہ ادا نہ کر دیا جائے اور اس وقت تک قرض خواہ اپنے دین دار کا گریبان پکڑے رہتا ہے اور کہتا ہے جب تک تم میرا قرض ادا نہیں کرو گے میں تمھارا گریبان نہیں چھوڑوں گا۔ اب یا تو وہ شخص اُس کا قرض ادا کرتا ہے یا کوئی دوسرا آدمی اُس کو اپنے ذمہ لیتا ہے ورنہ اُس کی رہائی نہیں ہوتی۔

جس دن کے سلطان اپنے والد کے مزار کی زیارت کے لیے گیا ہوا تھا اور وہاں اُس نے

ایک محل میں قیام کیا تھا۔ میں نے اپنے قرضداروں سے یہ بات کی کہ یہ مناسب موقع ہے کہ تم دروازۂ سلطانی کے قریب رہو اور جب میں اندر داخل ہونا چاہوں تو یہ کہوا ے بادشاہ کے "دروھی" جب تک تم ہمارے واجبات قرض ادا نہ کروگے ہم تمھیں نہ چھوڑیں گے کہ تم قصر سلطانی میں داخل ہو۔ اس وقت میں قرض خواہ جو اپنے قرض دار کا گریبان پکڑا ہوتا ہے۔ جب تک کہ وہ قرض کی رقم وصول نہیں کرتا یا پھر کوئی دوسرا شخص اس کا مددگار یا ذمہ دار نہیں بنتا وہ اس شخص کو نہیں چھوڑتا جس پر قرض واجب الادا ہوتا ہے۔

جو دبیر کے قصر سلطانی کے دروازے پر تھے۔ اُنھوں نے جاکر سلطان کو ہمارے قضیہ کی اطلاع دی۔ شمس الدین کے مرد بزرگ اور علم فقہہ کا ماہر تھا اور بادشاہ کی طرف سے وہ شکایات کی تحقیق پر مامور تھا باہر آیا اُس نے اُن لوگوں سے کہا کہ آخر تم اس شخص کو اندر کیوں نہیں آتے دیتے جواب دیا کہ یہ ہمارا مقروض ہے۔ شمس الدین بادشاہ کے پاس گیا اور ہمارے مابین جو نزاع تھا اس کی اطلاع دی۔ سلطان نے فرمایا یہ معلوم کرو کہ اُس پر کتنا قرض ہے۔ وہ واپس آیا تو اُسے بتلایا گیا کو پچپن ہزار دینار اس پر وہ دوبارہ ہماری طرف آیا اور کہا کہ سلطان عالم یہ فرماتے ہیں کہ تمھارا روپیہ میرے ذمہ ہے دوبارہ تم اُس سے طلب نہ کرنا۔

بعد ازاں سلطان نے حکم دیا کہ عماد الدین سمنانی اور غیاث الدین خداوندزادہ قصر ہزار ستون میں ٹھہریں اور مجھ پر جو قرض ہے اُس سے متعلق ضروری باتوں کی مناسب تحقیق کریں۔ انھوں نے اسناد کی درستی اور صحت کے بارے میں تحقیق کر کے اُس کی تصدیق کی اور سلطان کو اطلاع دی۔ سلطان ہنسا اور اُس نے پُر مزہ انداز میں کہا کہ وہ قاضی ہے اور اپنے فن کو اُس نے اسناد کی تنظیم میں خوبی سے استعمال کیا ہے اس کے بعد خداوندزادہ کو اجازت دی کہ یہ رقم خزانۂ شاہی سے لے کر میرے سُپرد کر دے۔ خداوندزادہ نے رشوت کی امید پر حوالہ لکھنے میں تاخیر کی۔ میں نے دو سو ٹکے (سکّے یا تنگہ) اسے بھیج دیئے۔ لیکن اس نے اسے قبول نہیں کیا اور اپنے نوکروں سے کہا کہ جاکر اُس سے کہہ دو کہ وہ پانچسو تنگے دے۔ میں نے ایسا نہیں کیا اور اپنا واقعہ عمید الملک پسر عماد الدین سمنانی سے بیان کیا۔ اس نے اس واقعہ کو وزیر تک پہنچایا۔

وزیر کی خداوندزادہ کے ساتھ کچھ شکر رنجی (اختلاف کی صورت) چل رہی تھی۔ اس نے واقعہ

کو کچھ اس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کیا کہ سلطان ناراض ہو گیا اور فرمایا کہ اسے قید خانے میں بند کر دو ——— آخر فلاں شخص کیوں اتنا روپیہ خداوندزادہ کو سپرد کرے۔ کیا وہ یہ بات نہیں جانتا کہ اگر میں نہ دوں تو خداوندزادہ کسی کو کچھ دے سکتا ہے؟ یا میں دے دوں تو وہ اُس کی مخالفت کر سکتا ہے۔ میرے حوالے کے معاملے میں تاخیر ہو جانے کی کہانی یہ تھی۔

بشکار رفتنِ سُلطان

جب سلطان شکار کے خیال سے باہر آیا میں نے بھی بے تامل اس کی ملازمت اختیار کی اور اُس کے ساتھ روانہ ہوا اور اس روانگی کے سلسلے میں جن چیزوں کی ضرورت تھی اُن کو مہیا کیا۔ میں نے ایک چھوٹا سا خیمہ خریدا کہ جسے اس ملک میں بڑے لوگوں کے ساتھ مخصوص سمجھا جاتا ہے۔ بادشاہ کے سراپچے کا رنگ سُرخ ہوتا ہے اور دوسروں کے خیمے اسی نسبت سے سفید ہوتے ہیں اور اُن پر نیلے رنگ سے کچھ نقش بنائے جاتے ہیں اور "شیوانی" خریدی یہ ایک ایسے خیمے سے عبارت ہے۔ جو سراپچے کے اندر سائبان کے طور پر لگایا جاتا ہے۔ اسے دو ستونوں پر ٹنگا دیا جاتا ہے اور اُس کو دو ملازم اپنے کندھوں پر اُٹھائے رکھتے ہیں۔ ان ملازمین کو "یکوانی" کہتے ہیں۔

قاعدہ کچھ ایسا ہے کہ ہر مسافر اُن لوگوں کو کرایہ پر حاصل کرتا ہے جو یکوانی کہلاتے ہیں۔ اسی طرح کچھ لوگ اس خشک چارہ کے لیے ملازم رکھے جاتے ہیں۔ جو ساتھ چلنے والے چوپائیوں کے لیے ہوتا ہے۔ یعنی گھوڑوں اور خچروں وغیرہ کے لیے۔ ہندوستان میں چوپائیوں کو ہرا گھاس نہیں کھلاتے اسی لیے خشک گھاس ساتھ رہتا ہے۔ اسی طرح ہر مسافر کچھ کہار اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ جو اس کے باورچی خانے کے سامان کو لے کر چلتے ہیں۔ کچھ کہار اُس کے تختِ رواں کو کاندھے پر اٹھانے کے لیے ہوتے ہیں۔ اسی طرح کچھ لوگ ڈیرے اور تمبو وغیرہ کو نصب کرنے کے لیے روانگی کے وقت پھر ان کو اکھاڑ کر طے کرنے اور سواریوں پر لادنے کے لیے ہوتے ہیں یہ سامان گدھوں، خچروں اور اونٹوں پر لادا جاتا ہے۔ اسی طرح کچھ لوگ اس مقصد سے اُجرت پر رکھے جاتے ہیں کہ وہ ڈیرے میں فرش بچھائیں۔ کچھ سپاہیوں کی طرح پیدل ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور

راتوں کو مشعل جلائے رکھتے ہیں۔ میں نے بھی یہ سب سامان فراہم کیا اور اس کے خرچ اخراجات کی ہمت کی۔ چنانچہ جس روز سے سلطان نے شکارگاہ کی طرف حرکت کی میں بھی اُسی دن عازم سفر ہوا۔ کچھ لوگ دو تین دن کے بعد روانہ ہوئے ..... غروب آفتاب کے وقت سلطان ہاتھی پر سوار ہوا اور اس نے اِدھر اُدھر کی سیر کی۔ اُس کا مقصد یہ تھا کہ وہ دیکھے کہ کون لوگ اُس کے ساتھ آرہے ہیں اور کون تاخیر کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اُس کے بعد اس نے شاہی خیمے سے باہر ایک کرسی پر نشست اختیار کی۔ میں سلطان کے سامنے گیا اور سلام کیا اور اپنی جگہ پر بائیں ہاتھ کی سمت کھڑا ہو گیا۔

سلطان نے ملک مقبول کو (جو سرِ جامہ دار کہلاتا تھا اور اس پر مامور تھا کہ جب بادشاہ بیٹھا ہو تو وہ اُس کے پیچھے کھڑا ہو اور مورچھل جھلتا ہے) میرے پاس بھیجا اور اجازت دی کہ میں بیٹھ جاؤں۔ اُس دن بجز میرے کسی اور شخص کو بیٹھنے کی اجازت نہیں ملی۔ اس کے بعد ایک ہاتھی لایا گیا اور اُس کی کمر کے سہارے سے ایک سیڑھی لگا دی گئی تاکہ سلطان ہاتھی پر سوار ہو جائے۔ اُس کے سر پر چترِ شاہی سایہ کیے ہوئے تھا۔ سلطان نے اپنے خواص کے ساتھ کچھ دیر اِدھر اُدھر سیاحت کی اور اُس کے بعد سراپچۂ سلطانی کی طرف چلا گیا۔

یہاں معمول کچھ اس طور پر ہے کہ جب سلطان سوار ہوتا ہے تو امیروں میں سے ہر ایک اپنی فوج اپنے نشانات اپنے طبل و نقارے اور اپنی شہنائیوں اور نفیریوں کے ساتھ سلطان کے ساتھ چلتا ہے۔ حاجب، مُطرب اور طبل بجانے والے (وہ لوگ جن کے پاس بڑے بڑے ڈھول ہوتے ہیں) اور اسی نسبت سے تاشے والے کہ اُن کے گلوں میں چھوٹے چھوٹے ڈھول آویزاں ہوتے ہیں اور شہنائی نواز آگے آگے چلتے ہیں نیز پندرہ آدمی داہنی طرف ہوتے ہیں اور پندرہ بائیں طرف ان لوگوں میں قاضی القضاۃ، وزیر بعض امراء اور کچھ بادشاہ کے عزیز ہوتے ہیں۔ میں بھی سلطان کے داہنی طرف چل رہا تھا۔ پیادے اور رہنما پیچھے پیچھے رواں تھے۔ شاہی نشانوں کو جو حریر و دیبا سے تیار ہوتے ہیں اور ان ہی ساتھ ساتھ نقارے اور طبل اونٹوں پر آراستہ کر کے لاتے ہیں۔ یہ پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ اُن کے عقب میں بادشاہ کے غلام، خواص، اُمراء اور دوسرے ہمسفر اسی ترتیب سے حرکت کرتے ہیں۔ جہاں سلطان پسند کرتا ہے۔ وہاں وہ قیام کرتے ہیں اور جب سلطان کسی دریا کے کنارے یا درختوں کے

سائے میں بیٹھ جاتا ہے تو بکرے، مرغ اور ہر طرح کے شکار کا گوشت اُس کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور شہزادے بھی ایک ایک سیخ اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ آگ سلگائی جاتی ہے اس پر گوشت کے ٹکڑوں کو کباب کر کے کھاتے ہیں۔ سلطان کے لیے ایک چھوٹا سا سرا نچہ نصب کیا جاتا ہے وہ وہاں بیٹھتا ہے اور اُس کے خواص اُس سے باہر رہتے ہیں جب وہ سلطان کے لیے کھانا لایا جاتا ہے تو وہ جس کو چاہتا ہے اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دیتا ہے۔

ایک روز سلطان جب اپنے سرا نچے میں بیٹھا ہوا تھا اُس نے پوچھا کہ وہ باہر کا آدمی اب کہاں ہے۔ ناصر الدین مُطاہر نے (کہ بادشاہ کے ندیموں میں سے تھا) کہا کہ فلاں شخص باہر ہے اور اس کے اوقات بہت تلخ گذر رہے ہیں۔ بادشاہ نے پوچھا کیوں؟ اس نے کہا کہ وہ قرضدار ہے اور اُس کے قرض خواہ اُسے پریشان کیے ہوئے ہیں۔ سلطان عالم نے وزیر سے یہ فرمادیا تھا کہ اُس کے قرض کی رقم ادا کر دے لیکن وہ اس عمل کی انجام دہی سے پہلے سفر پر روانہ ہو گیا۔ اب یہی بہتر ہے کہ بادشاہ حکم دے کہ اُس کے طلبگار وزیر کی بازگشت تک انتظار کریں یا پھر اس کے مطالبات اب ادا کر دیئے جائیں۔ ملک دولت شاہ نے کہ سلطان اُسے اپنا چچا کہتا تھا سامنے آ کر کہا سلطانِ عالم وہ ہر روز عربی زبان میں اپنے مطلب کی بات کہتا ہے اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

تب سلطان نے ناصر الدین کی طرف رُخ کرتے ہوئے پوچھا کہ آیا وہ کیا چاہتا ہے۔ دولت شاہ کے بیان کو سننے کے بعد بادشاہ کا مقصد یہ تھا کہ ناصر الدین دوبارہ اپنا مطلب بیان کرے۔ اس نے جواب دیا کہ اس کا موضوع تو قرضداری ہے کہ جس کی مصیبت سے وہ گزر رہا ہے۔ سلطان نے کہا کہ اے میرے چچا جیسے ہی ہم پایۂ تخت کی طرف واپس لوٹیں تم شاہی خزانے سے اس کا یہ روپیہ ادا کر دو۔ خداوند زادہ اس وقت وہاں موجود تھا اس نے کہا کہ وہ شخص خرچ بہت رکھتا ہے اور میں نے اُسے اپنی ولایت میں سلطان ترمشِ تزین کے یہاں دیکھا تھا۔

اس گفتگو کے بعد سلطان نے مجھے کھانے میں شرکت کے لیے سرا نچے میں بُلوایا۔ مجھے اس واقعہ کی خبر نہ تھی۔ جب میں باہر آیا تو ناصر الدین نے مجھ سے کہا کہ ملک دولت شاہ کا تمہیں شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ دولت شاہ نے پھر یہ کہا کہ خداوند زادہ کا شکریہ ادا کرو۔ ایک دن کہ سلطان اپنے

لاؤلشکر کے ساتھ شکار میں جا رہا تھا میں اُس کے پیچھے چل رہا تھا اور دائیں جانب تھا میرے اصحاب بھی سلطانی لشکر کے عقب میں رواں تھے۔ میں نے سرانچے کے قریب ایک چادر تان رکھی تھی میرے ساتھی چادر کے پاس ٹھہر گئے اور سلطان کو سلام کیا۔ سلطان نے عماد الملک اور دولت شاہ کو اس بات پر مامور کیا کہ یہ معلوم کریں کہ یہ چادریں اور یہ سرانچہ کس کا ہے انھوں نے جواب میں کہا کہ فلاں شخص کا ہے سلطان ہنسنے لگا اور اگلے دن اجازت دی کہ میں ناصر الدین مُظاہر قاضی مصر کے بیٹے اور ملک صبیح کے ساتھ شہر کی طرف مراجعت کروں اور ہمیں خلعت بخشی۔

سلطان کو پیش کیے جانے والے اونٹ کی داستان

ان ہی ایام میں ایک روز سلطان نے مجھ سے پوچھا کہ آیا الملک الناصر شُتر سوار ہوتا ہے میں نے کہا کہ ہاں حج کے ایام میں مصر سے لے کر مکہ تک کا فاصلہ دس روز میں اونٹ پر سوار ہو کر طے کرتا ہے لیکن وہ اونٹ یہاں پیدا ہونے والے اونٹوں کے مقابلے میں بہت کچھ مختلف ہوتے ہیں اور اُس نوع کا ایک اونٹ میرے پاس بھی تھا جب میں پایۂ تخت میں واپس لوٹا۔ میں نے مصری عربوں میں سے ایک کو بُلایا اور اُسے حکم دیا کہ کالے رنگ کا جو محمل اونٹ پر باندھے رہتے ہیں وہ میرے لیے بنا دے۔ اور اُسے ایک نجار کو دیا کہ اُس جیسا ایک محمل مجھے بنا دے اُسے پارچے سے ڈھک دیا اور اسی کے مطابق ایک رکاب بنائی اور ایک عمدہ سی عبا اس اونٹ پر ڈالی اور ریشمی مُہار اس کے لیے مہیا کی۔

میرے پاس ایک یمنی ملازم تھا جو بہت اچھی مٹھائیاں بناتا تھا۔ اس سے میں نے کھجوریں تیار کرائیں۔ میں نے اس شیرینی کے ساتھ اس شتر کو سلطان کے پاس بھیجا اور اپنے آدمیوں سے کہا کہ اسے دولت شاہ کے وسیلے سے سلطان تک پہنچا دو۔ دو اونٹ اور ایک گھوڑا خود دولت شاہ کے لیے بطور پیش کش روانہ کیے۔ چونکہ میرا پیش کیا ہوا اونٹ پہلے دولت شاہ کے پاس پہنچا تھا اس لیے دولت شاہ سلطان کے پاس گیا اور کہا سلطان عالم میں نے آج ایک عجیب و غریب چیز دیکھی ہے۔ سلطان نے اُس سے پوچھا کہ وہ کیا اس نے جواب دیا کہ فلاں شخص نے ایک ایسا اونٹ بھیجا ہے جس پر زین کسی ہوئی ہے۔ شُتر کو شاہی محل میں پہنچایا گیا اور سلطان اسے دیکھ کر

بہت خوش ہوا اور میرے ملمور کیے ہوئے آدمی سے کہا کہ وہ شُتر سوار ہو اور سلطان کے جلُو میں چلے۔ سلطان نے دو سو دینار ایک خلعت کے ساتھ اُسے بخشے۔ جب مجھے اس صورت حال کی اطلاع ہوئی تو میں بہت خوش وقت ہوا۔

شیرینی کے ساتھ دو اور اونٹوں کی مزید پیش کش

اس واقعہ کے بعد پھر میں نے حکم دیا کہ دو عدد پھر دوسری زینیں تیار کریں اور ان کے سامنے اور پیچھے کے حصّوں کو چاندی اور سونے کے پتروں سے آراستہ کریں۔ ان زینوں یا محافوں پر خوبصورت کپڑا چڑھا یا گیا اسی کے ساتھ سنہری روپہلی تاروں اور ریشم سے رسیاں بنائی گئیں۔ اسی کے ساتھ دو جھولیں ریشم و کمخاب کے کپڑوں سے تیار کی گئیں اور اونٹوں کے پیروں میں سونے چاندی کی گھنٹیاں بطور خلخال باندھی گئیں۔ گیارہ طبق مٹھائی کے جن پر ریشمی خوان پوش ڈھکے ہوئے تھے، میں نے فراہم کیے۔ دوسرے روز کہ سلطان شکار گاہ سے واپس آرہا تھا اور مجلس عوام میں رونق افروز تھا۔ اس کی خدمت میں پیش کیا۔ سلطان نے حکم دیا کہ اونٹوں کو اس کے جلو میں دوڑایا جائے۔ ان میں سے ایک کے پیر میں سے خلخال ٹوٹ گیا اس کے بعد اس نے ان سینیوں پر نظر ڈالی۔ اور پوچھا ان طبقوں میں کیا ہے۔ میں نے کہا کہ مٹھائی ہے۔ پھر ناصر الدین ترمیزی کی طرف رُخ کرتے ہوئے کہا۔ جو مٹھائی فلاں شخص نے بھیجی تھی میں نے اُس جیسی مٹھائی نہ کھائی نہ دیکھی۔ اس کے بعد فرمایا کہ شیرینی کے ان ظروف کو محلِ پذیرائی میں لیجایا جائے جو ایک خاص جگہ تھی۔

بعد ازاں سلطان خود بھی اُٹھ گیا اور مجھے کھانے پر مدعو کیا اور صرفِ غذا کے بعد مجھ سے پوچھا کہ تو نے جو شیرنی پیش کش کی ہے وہ کس طرح کی ہے میں نے کہا کہ سلطان عالم شیرنی تو ہزار طرح کی ہوتی ہے اور میں نہیں جانتا کہ آپ کا سوال کس طرح کی مٹھائی سے ہے۔ سلطان نے کہا کہ مٹھائی کے طبق لائے جائیں اور خوان پوشوں کو اٹھایا جائے۔ جب ایسا کیا گیا تو ایک مٹھائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ میں اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ میں نے کہا اسے "مقرمہ" کہتے ہیں۔

اس کے بعد ایک دوسری مٹھائی کو اُس نے اٹھایا اور کہا کہ اس کا کیا نام ہے میں نے

کہا کہ اُسے "لقیمات القاضی" کہتے ہیں۔ بغداد کے شیوخ میں سے ایک تاجر جو سامری کے نام سے منسوب تھا اور خاندانِ عباسیہ سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ ایک مالدار شخص تھا اور اس وقت حضورِ سلطانی میں موجود تھا۔ سلطان اسے اپنے باپ کا درجہ دیتا تھا۔

اس شخص نے از روئے حسد یہ چاہا کہ مجھے سلطان کے سامنے شرمندہ کرے اور اس نے کہا کہ اس شیرینی کا نام لقیمات القاضی نہیں ہے ایک دوسری طرح کی شیرینی اٹھائی جس کا نام جلد الفرس تھا اور کہا کہ لقیمات القاضی یہ ہے۔

ملک الندما ناصر الدین کافی ہروی اُس کے سامنے بیٹھا تھا۔ یہ بادشاہ کے ساتھ اس معاملے میں ایک گونہ مزاح سے پیش آیا اور اُس نے کہا کہ اے سُلطان تیرا خواجہ جھوٹ بولتا ہے اور تیرا قاضی سچ کہتا ہے۔ بادشاہ نے پوچھا وہ کیسے اس نے جواب دیا سلطان عالم وہ تو خود ہی قاضی ہے اور اپنے لقمے کو خوب پہچانتا ہے۔ اس بات کو سُن کر سلطان ہنسنے لگا اور کہا تم سچ کہتے ہو۔ کھانے کے بعد شیرنی کھائی اور قہوے کی کوئی چیز پی اُس کے بعد ہم نے پان لیا اور ہم واپس لوٹ گئے۔

تھوڑی دیر بھی نہیں ہوئی تھی کہ خزینہ دار میرے پاس آیا اور کہا کہ اپنے آدمیوں کو میرے ساتھ بھیج دیں تاکہ وہ روپیہ لے لیں میں غروب آفتاب کے بعد اپنے گھر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ تین تھیلیاں رکھی ہوئی ہیں اور اس میں چھ ہزار دو سو ۶۲۰۰ ٹنکے موجود ہیں اور یہ مقدار پچپن ہزار دیناروں کے برابر تھی جن کا میں نقوض تھا اور دو ہزار دینار اُس میں اور زیادہ تھے جو بادشاہ نے مجھے اس سے پہلے بخشے تھے اور جس میں سے دسواں حصہ کم کر لیا گیا تھا۔ ہر تنکے کی قیمت ڈھائی دینار درم مغربی کے برابر ہوتی ہے۔

سلطان کے سفرِ مَعبر کی داستان

جمادی الاوّل کی نویں تاریخ کو سلطان نے بلادِ معبر کی طرف سفر کے خیال سے پایۂ تخت کو خدا حافظ کہا۔ اس زمانے میں میں نے قرض خواہوں کے چنگل سے نجات پالی تھی اور سفر کا ارادہ کر لیا تھا اور چھ مہینے کے اخراجات کہاروں، فراشوں اور دوسرے ملازموں کو دیدیئے تھے لیکن اسی درمیان میں فرمان پہنچا کہ میں باقی کچھ آدمیوں کے ساتھ پایۂ تخت میں ٹھہروں۔ حاجب نے

اس بارے میں مجھ سے تحریر بھی لے لی تاکہ میں آئندہ انکار نہ کردوں۔ یہ ہندوستان کی رسم ہے اور اس خیال سے ہے کہ آئندہ کوئی شخص انکار نہ کرے اور یہ کہے کہ فرمان مجھ تک نہیں پہنچا۔

سلطان نے مجھے چھ ہزار دینار دیئے اور دس ہزار دینار قاضی مصر کے بیٹے کو عطا کیے اور اسی طرح اُن عزیزوں کو روپیہ بھجوایا۔ جن کے لیے یہ کہا گیا تھا کہ وہ پایۂ تخت میں ٹھہریں۔ لیکن اہلِ محل کو کچھ نہ دیا۔ نیز یہ فرمان بھیجا کہ سلطان قطب الدین کے مقبرے کا حساب کتاب میرے پاس رہے۔ سلطان اس مقبرے کا بہت احترام کرتا تھا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جب وہ اس مقبرے کی زیارت کے لیے آتا تھا تو سلطان کے جوتوں کو جو ہندوستان کی رسم کے مطابق اس کی قبر کے پاس سرہانے کی طرف رکھے ہوتے ہیں، اٹھاتا تھا اُن کو بوسہ دیتا تھا اور سر پر رکھتا تھا اور اس کے قبر کے برابر میں رسمِ خدمت بجالاتا تھا بالکل اُسی طرح جیسا وہ اس کی زندگی میں کرتا رہا تھا۔ اور قطب الدین کی بیوی کی بہت عزت کرتا تھا۔

سلطان قطب الدین کی بیگم کو وہ اپنی بہن کہتا تھا اور اُس کو اپنے حرم میں بڑی حرمت اور حفاظت کے ساتھ رکھتا تھا۔ آخر سلطان نے اُسے قاضی مصر کے بیٹے کے حبالۂ نکاح میں دیدیا اور اس کی خاطرداری کی وجہ سے اس کے شوہر پر بھی بڑی عنایتیں کرتا تھا اور ہر جمعہ کو اس خاتون سے ملنے جاتا تھا۔ سلطان نے دہلی سے روانگی کے وقت ہم کو خدا حافظ کہنے کے لیے بُلایا۔ قاضی کا بیٹا کھڑا ہو گیا اور اُس نے کہا نہیں میں سلطان عالم کو خدا حافظ نہیں کہتا اور اُس سے جدا ہونا نہیں چاہتا۔ اس کا فائدہ بھی ہوا اور سلطان نے کہا اچھا تم ہمارے ساتھ چلو۔

میں سلطان کے سامنے گیا اور چونکہ میرا دل یہ چاہتا تھا کہ میں دہلی میں ٹھہروں اس لیے میں نے خدا حافظ کہہ دیا۔ لیکن اس کا انجام کچھ اچھا نہیں تھا۔ سلطان نے پوچھا کہ تم کیا چاہتے ہو۔ میں نے ایک رُقعہ نکالا جس میں چھ باتیں بطور یادداشت لکھی ہوئی تھیں۔ سلطان نے کہا کہ تم منہ زبانی کہہ دو۔ میں نے کہا کہ سلطان عالم نے مجھے قاضی کا عہدہ سپرد کر دیا۔ اور میں نے اس فریضہ کی انجام دہی میں کوئی کوتاہی نہیں کی لیکن اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے میرا مقصد صرف فرمانِ سلطانی کو بجالانا تھا۔ اور شاہی حکم کا احترام کرنا۔ سلطان نے فرمایا کہ میں نے دو نائب بھی تو تیری خدمت کے لیے دہلی میں مقرر کر دیئے تھے اور اس کے بعد کہا کہ اب تم کہو۔ میں نے عرض کیا کہ سلطان

قطب الدین کے مقبرے کے بارے میں اب کیا کرنا ہے۔ میں نے چار سو ساٹھ آدمی اس مقبرے کی دیکھ بھال وغیرہ کے لیے مستقل طور پر متعین کیے ہیں لیکن اوقاف کی آمدنی ان کی مستقل کفالت کے لیے کافی نہیں ہے۔ اور فقراء کو کھانا کھلانے کے اخراجات الگ ہیں۔ سلطان نے وزیر سے کہا کہ پچاس ہزار میں نے اور اضافہ کر دیا ہے کہ صد ہزار من غلہ اور چاول۔۔ دیا جائے تاکہ اوقاف کی آمدنی کے ہاتھ میں آنے تک مقبرے کے اخراجات اس سے چلیں اور ہندوستان کا ایک من بیس رطل مغربی کے برابر ہوتا ہے۔

اس کے بعد اُس نے پھر میری طرف رخ کیا اور کہا کہ اب اور کیا ہے۔ میں نے کہا کہ میرے آدمیوں کو قرض خواہوں نے پکڑ لیا ہے اور انھیں قید خانے میں ڈال دیا ہے۔ میں نے اُن سے کچھ اور بھی اقرار کیا تھا۔ اب محکمۂ دیوانی سے وابستہ لوگ ان عوائد کو جو اس سے قبل میرے ہاتھ آئے تھے چاہتے ہیں کہ انھیں واپس کیا جائے۔ میں خداوندِ عالم سے یہ درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ یہ حکم دیا جائے کہ یہ مطالبہ مجھ سے نہ ہو۔ سلطان نے پوچھا کہ اس سلسلے میں تجھے اور کیا ملا ہے میں نے کہا پانچ ہزار دینار۔ کہنے لگے چلو ہم اسے تمھارے انعام میں محسوب کر لیتے ہیں۔

بعد ازاں میں نے کہا کہ ایک اور مسئلہ بھی ہے۔ وہ گھر کا معاملہ ہے جو آپ نے مجھے سپرد فرمایا ہے۔ یہ گھر تو مرمت طلب ہے اور نئی تعمیر چاہتا ہے۔ سلطان نے وزیر سے کہا۔ عمارت کیند یعنی اس کو لکھ دو۔ اور اُس پر اضافہ کیا کہ آئندہ نہ رہے۔ میں نے کہا نہیں۔ سلطان نے کہا پھر دوسری وصیت ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ تو قرض نہ کرے۔ اس لیے کہ بہت ممکن ہے کہ قرض طلب کرنے والے پھر تیرے اوپر زور ڈالیں اور کوئی ایسا بھی نہ ہو کہ تیرے حال احوال کے بارے میں مجھے اطلاع دے۔ جتنا تجھے آمدنی ہو اتنا ہی خرچ کر کہ اللہ پاک نے یہ فرمایا ہے کہ اس طرح کے اخراجات نہ رکھو جو تمھارے گلے کا ہار بن جائیں۔ کھاؤ پیو لیکن اسراف بیجا نہ کرو۔

میں یہ چاہتا تھا کہ بادشاہ کے قدم کو بوسہ دوں لیکن وہ مانع ہوا۔ اور اُس نے میرے سر کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ لہٰذا میں نے اُس کے دونوں ہاتھوں کو بوسہ دیا اور واپس لوٹ گیا اور اپنے گھر کی تعمیر میں لگ گیا اور چار ہزار دینار اس کام پر خرچ کیے کہ اس میں سے چھ سو دینار مجھے شاہی خزانے سے ملے اور باقی کو میں نے اپنے پاس سے صرف کیا۔

ایک مسجد بھی بنائی اور مقبرے کی عمارت کو بھی درست کیا۔ سلطان نے فرمایا تھا کہ مقبرے کے اوپر ایک گنبد بنایا جائے جس کی اونچائی سو گز ہو یعنی اس قبہ سے بیس ذرع زیادہ ہو جو فازان خاں کے مقبرے (واقع عراق) کا ہے اسی کے ساتھ اس نے یہ حکم دیا تھا کہ تیس باب قریہ کے موقوفات مقبرے کے عنوان سے خرید کیے جائیں اور یہ تمام موقوفات میرے ہاتھ میں ہوں کہ اُن کا ایک معمول کے مطابق میں اپنے کام میں لا سکتا ہوں۔

میں نے مقبرے کے لیے ضروری تشریفات درست کیں یعنی ایسی چیزیں جن سے مقبرے کی شان اور اس کے شرف میں اضافہ ہو۔ ہندوستان میں کچھ ایسی رسم ہے کہ مُردوں کے لیے بھی وہی سب تشریفات اختیار کی جاتی ہیں جو زندگی میں ان کے معمولات ہوتے ہیں اور مقبرے کے دروازے پر ہاتھی گھوڑے باندھے جاتے ہیں اور مقبرے کو زیب و زینت بخشی جاتی ہے۔ میں نے بھی سلطان قطب الدین کے مقبرے کے لیے اسی اصول کو اختیار کیا۔ ڈیڑھ سو قاری مقرر کیے جنھیں ہندوستان میں ختمی کہا جاتا ہے۔ اسی طلبا اور آٹھ قیصر جنھیں مکرر کہتے ہیں۔ ان کی خدمات حاصل کیں اور میں نے مقبرے میں ایک مدرس بھی مقرر کیا۔ اسی طرح اسی آدمی موقیوں میں سے نیز ایک امام جماعت اور اسی طرح خوش آواز قاریوں میں سے کچھ افراد اسی طرح مداح، دفتر دار اور معتزف لوگ خدمت پر مامور کیے جو اس ملک میں اسباب کہلاتے ہیں۔

ایک اور طرح کے لوگوں کو بھی میں نے مقبرے کے خدمت گزاروں میں شامل کیا جن کو حاشیہ کہہ کر یاد کیا جاتا ہے۔ اُن میں آشینر، چارپایہ، آب دار، شربت دار، تنبول دار، سلاح دار، نیزہ دار، چتر دار، طشت دار، حاجب اور نقیب وغیرہ سب کو قاعدہ کے مطابق رکھا گیا اس طور پر کہ اُن کی کل تعداد چار سو ساٹھ تک پہنچ گئی جو سلطان کی طرف سے مقرر تھے کہ روزانہ بارہ من گوشت اور بارہ من آٹا مقبرے کے مصارف کے لیے دیا گیا تھا جو روزانہ خرچ ہوتا تھا۔

میں نے دیکھا کہ اتنے لوگوں کے لیے یہ مقدار کم ہے اور مقبرے کو زراعت سے جو آمدنی ہوتی ہے اس میں گنجائش ہے۔ بس میں نے حکم دیا کہ روزانہ پینتیس من آٹا اور اتنا ہی گوشت دوسری چیزوں کے ساتھ جیسے شکر، گڑ، روغن اور تنبول وغیرہ معین کیا جائے۔ مقبرے میں جو لوگ کام کرتے تھے اور اُن کے ملازمین تھے اُن کے علاوہ بہت مہمانوں اور مسافروں کو بھی کھانا کھلایا

جاتا تھا۔ اُس سال بہت شدید قحط پڑا اور مقبرے کی طرف سے جو کھانا تقسیم کیا جاتا تھا اُس نے لوگوں کے لیے بڑی گنجائش پیدا کر دی کہ وہ اس کے وسیلے سے بھوک کے مرنے سے محفوظ رہے اور اُس کی بڑی شہرت ہوئی۔

ملک صبیح جو دولت آباد میں اس وقت سلطان کے ساتھ تھا اس نے سلطان کے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ اگر فلاں شخص یعنی ابن بطوطہ جیسے دو آدمی بھی دہلی میں ہوتے تو لوگ قحط کی شدت کی شکایت نہ کرتے۔ سلطان نے اس پر تعجب کیا اور میرے لیے اپنے لباس خاص میں سے ایک خلعت بھیجا۔

خاص خاص دنوں میں جیسے عید الفطر، عید قربان اور اسی طرح پیغمبرؐ کے یومِ وفات اور ماہِ شعبان کی چودھویں تاریخ اور سلطان قطب الدین کے وفات کے دن خرچ کا پیمانہ بہت بڑھ جاتا تھا اور میں سو من آٹا اور سو من گوشت پکواتا تھا۔ فقراء اور مساکین کو کھانا کھلاتا تھا۔ لیکن خدمت گذاروں کے لیے وہی مقرر تھا جو معمولاً اُن کو دیا جاتا تھا۔

ابن بطوطہ کی مسافرتِ امروہہ

وزیر نے غلّہ کی اُس مقدار میں سے جو مقبرے کے مصارف کے لیے مقرر کی گئی تھی کہ وہ مجھے دیتا رہے۔ اُس میں سے دس ہزار من تو اس نے میری تحویل میں دیدیا اور باقی کے لیے یہ کہا کہ میں وہ ہزار امروہا سے لوں۔ وہاں کا والی خراج یا رئیسِ دار ایسی ایک شخص تھا۔ جس کو عزیز خمار کہتے تھے یعنی (مے فروش)، اور وہاں کا امیر شمس الدین بدخشانی تھا میں نے

اپنے ملازموں کو غلّہ کی وصول یابی کی غرض سے بھیجا۔ میرے مامور کردہ لوگوں نے غلّہ کی ایک مقدار اپنی تحویل میں لے لی لیکن عزیز خُمار کی سخت گیری کی شکایت کی۔ مجبوراً میں نے باقی حصّہ کی وصول یابی کے ارادے سے وہاں کا سفر کیا۔

دہلی سے لے کر امروہا تک تین دن کا فاصلہ ہے اور یہ دن موسم باراں کی آمد کے دن تھے۔ میں نے اپنے آدمیوں میں سے تین لوگوں کو اپنے ساتھ لیا اور دو اچھے گانے والے بھی میرے ہمراہ تھے کہ وہ بہت اچھے موسیقار تھے۔ وہ راستے کے طے کرنے کے دوران مجھے اشعار گا گا کر سُناتے تھے۔ میں پہلے شہر بجنور میں پہنچا۔ وہاں تین بھائی اور ایسے ملے جو خوش آواز تھے اُن کو بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ یہ تین آدمی اور دو وہ جو پہلے سے میرے ساتھ تھے۔ یہ سب میرے لیے گاتے تھے اور میں اس سے خوش وقت ہوتا تھا۔ ہم امروہے پہنچے۔۔۔ وہ ایک چھوٹا سا اچھا شہر ہے۔

دیوانی سے متعلق مامور کیے جانے والے لوگ جو اُس شہر میں تھے۔ میری ملاقات کے لیے آئے۔ اس کے علاوہ قاضئ شہر شریف امیر علی اور شیخ علاقہ نے مجھ سے ملاقات کی۔ ان دونوں نے میری خاطر داری کے لیے ایک اچھی ضیافت کا بھی اہتمام کیا۔ عزیز خُمار اس وقت افغان پور میں تھا کہ نہر کے دوسرے کنارے پر واقع ہے اور نہر ہمارے اور اُس شہر کے درمیان حائل تھی۔ ہمارے پاس اُس کو عبور کرنے کے لیے کوئی وسیلہ نہیں تھا۔۔۔۔ ایک کشتی تختوں اور گھانس کے پولوں کی مدد سے بنائی اور اپنا سامان اُس میں رکھ دیا۔ اگلے دن ہم اُس ندی سے گزرے۔ نجیب جو عزیز خُمار کا بھائی تھا ایک جماعت کے ساتھ (جو اس کی ہمراہی تھی) مجھ سے ملنے آیا۔ اس نے وہاں ایک خیمہ بھی نصب کیا۔ اُس کے بعد خود عزیز خمار آیا جو اپنے جور و ستم میں مشہور تھا۔ ہزار اور پانچو قریے اُس کے زیر انتظام تھے جن کی سالانہ آمدنی ساٹھ لاکھ روپیہ تھی اور اُس کا پانچواں حصّہ اُسے ملتا تھا۔

جو ندی وہاں سے گذرتی ہے اُس کے عجائبات میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی یا جانور کوئی بھی اُس کا پانی نہیں پیتا۔ ہم تین روز اس کے کنارے پر اقامت پذیر رہے اور ہم نے ایک جرعہ گھونٹ بھی اُس کے پانی کا نہیں لیا۔ بلکہ اُس کے قریب بھی نہیں گئے۔ یہ ندی

ہمالیائی سلسلۂ کوہ سے نکلتی ہے اور ایک سرچشمہ کی صورت میں وہاں سے آگے بڑھتی ہے اس پہاڑی سلسلہ میں ایسے کوہسار بھی ہیں جن میں سونے کی کانیں ہیں۔ یہ ندی راستہ طے کرتی ہوئی جب آگے بڑھتی ہے تو ایسی سرزمینوں سے بھی اس کا گزر ہوتا ہے جہاں زہریلی جھاڑیاں ہوتی ہیں یا دوسری اشیاء، لہٰذا اس کا پانی مسموم ہو جاتا ہے اور اُس کو پینے والا اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال دیتا ہے۔

یہ کوہستانی سلسلہ کچھ اس طرح ہے کہ یہاں پہاڑ ایک دوسرے سے وابستہ اور تے وستہ ہے اور اتنی دُور تک چلے گئے ہیں کہ یہ فاصلہ تین ماہ میں طے ہو سکتا ہے۔ یہ سلسلۂ کوہ بلادِ تبت سے جا کے مل جاتا ہے کہ مُشک نافہ والے ہرن وہاں بہت پیدا ہوتے ہیں۔ (میں نے اس سے پیشتر اُن نقصانات کا ذکر کیا ہے جو اس کوہستان میں مسلمانوں کے لشکر کو اُٹھانا پڑے تھے۔)

یہاں حیدری درویشوں میں سے ایک جمعیت میرے پاس آئی اور سماع میں مشغول ہو گئی۔ انھوں نے آگ روشن کی اور اُس میں بے تکلف آئے گئے آگ نے اُن پر کوئی اثر نہیں کیا۔

دادرسی ابن بطوطہ

شمس الدین بدخشاں جو اس علاقے کا امیر ہے۔ اُس کے اور عزیز خمار کے درمیان ایک جھگڑا تھا۔ عزیز شمس الدین کی دست بُرد سے بچنے کے لیے اپنے گھر میں پناہ گزیں تھا۔ ان دونوں کے تنازعہ کی شکایت دہلی پہنچی اور اُس نے میرے پاس کسی آدمی کو بھیجا۔ نیز ملکِ شاہ کو جو یہاں غلاموں کا امیر تھا اور چار ہزار سلطانی غلام جو اس شہر میں رہتے ہیں وہ ان کا نگرانِ اعلیٰ تھا اور اسی طرح شہاب الدین رومی کو اُس نے حکم نامہ بھیجا کہ تین شخص مل کر اس قضیہ و اختلاف کے بارے میں معلومات فراہم کرے۔ اور جس شخص کو بھی ہم قصوروار پائیں اُسے گرفتار کر کے پایۂ تخت روانہ کریں۔ سب میرے گھر میں جمع ہوئے۔ عزیز نے شمس الدین کے بارے میں چند باتیں بطور دعوے داری کے کہلوائیں۔ اُن میں سے ایک

وجہ یہ تھی کہ شمس الدین کے خادموں میں سے ایک شخص رضی ملتانی کا نام لے کر عزیز کے خزانہ دار کے گھر پہنچا۔

اُس نے وہاں جاکر شراب پی اور پانچ ہزار دینار اُس رقم میں سے جو خزانہ دار کے اختیار میں تھی چرا لیے۔ میں نے رضی کو اس معاملے میں بُلایا اور اُس سے استفسار کیا۔ اُس نے کہا کہ میں جب سے ملتان سے آیا ہوں میں نے شراب نہیں پی اور اب تو مجھے آئے ہوئے بھی آٹھ سال ہو گئے۔ میں نے کہا کہ ملتان میں رہتے ہوئے شراب پی تھی اُس نے کہا ہاں۔ میں نے حکم دیا کہ اُس کے اسّی کوڑے مارے جائیں۔ اور چوری کے الزام میں کہ جس کے حق میں قرائین موجود تھے۔ اُسے قید خانے میں ڈال دیا۔ دو ماہ کے بعد جبکہ میری مسافرت کا زمانہ بہت طویل ہو چکا تھا۔ میں امروہا سے واپس آگیا۔ میں نے اپنے ہمراہیوں کے لیے قیام کا بندوبست کیا اور انھیں امروہے میں چھوڑ دیا تاکہ وہ عزیز سے غلّہ کی وصول یابی کر کے دہلی لے آئیں۔ عزیز نے تیس ہزار من غلّہ قریے کے رہنے والوں سے جو اُس کی نگاہ میں تھا حاصل کیا اور یہ بات قرار پائی کہ اُس مقدار کو تین ہزار بیلوں پر لاد کر دہلی لایا جائے۔ ہندوستان کے لوگ نقل و حمل کے کام کو بیلوں کے ذریعے انجام دیتے ہیں اور مسافرت میں اپنے مال و اسباب وغیرہ کو اسی جانور کی پشت پر لادتے ہیں۔

گدھے کی سواری ہندوستان میں بہت عیب کی بات سمجھی جاتی ہے۔ یوں بھی ہندوستان کے گدھے بہت چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں اور اُن کو "لاشہ" کہا جاتا ہے۔ جب یہ چاہتے ہیں کہ کسی مجرم کو عام لوگوں کی نظر میں رسوا کریں تو اُس کو تازیانہ مارتے ہیں گدھے پر بٹھلاتے ہیں اور شہر میں چکّر لگواتے ہیں۔

میرے ایک محترم دوست کی داستان

ناصر الدین اودھری ایک وقت مسافرت پر روانہ ہو رہا تھا اُس نے ایک ہزار ساٹھ تنکے میرے پاس امانت رکھے۔ میں نے اُس رقم کو خرچ کر دیا جب میں نے دہلی

مراجعت اختیار کی تو میں نے دیکھا کہ اُس نے میرے معاملے سے متعلق قوام الدین خداوندزادے جو کہ نائب وزیر کی حیثیت سے دہلی آیا تھا۔ اُس رقم کا قبالہ حوالے کر دیا۔ مجھے اس بات پر بہت شرم آئی کہ میں نے وہ روپیہ خرچ کر لیا تھا۔ اس کا تیسرا حصہ میں نے اس کو دیدیا اور میں چند روز اپنے گھر میں خانہ نشین رہا۔ میرے بارے میں یہ مشہور ہو گیا کہ میں بیمار ہوں۔ ناصر الدین میرے دیدار کے لیے آیا جب اس نے مجھے دیکھا تو یہ کہا کہ میں تو کہیں سے تمھیں بیمار نہیں پاتا۔ میں نے کہا کہ میں دل کی بیماری میں مبتلا ہوں وہ کچھ نہ سمجھا اور کہا کہ کھول کر بتلاؤ۔ میں نے کہا کہ اپنے نائب شیخ الاسلام کو میرے پاس بھیج دو تاکہ میں اُس سے پوری بات کہہ دوں۔

جب شیخ الاسلام مجھ سے ملنے آیا تو میں نے سارا واقعہ اُس سے بیان کر دیا۔ وہ واپس چلا گیا اور صدرِ جہاں کو اطلاع دی۔ اُس نے ایک ہزار دینار میرے لیے بھیج دیئے اس سے پیشتر بھی ایک ہزار دینار کے لیے میں اُس کا مقروض تھا۔ اُس کے بعد باقی تحویل کا مجھ سے مطالبہ کیا گیا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ اب صدرِ جہاں ہی مجھے اس مصیبت سے نجات دلا سکتا ہے۔ اس لیے کہ وہ دولت مند آدمی تھا۔ میں نے ایک ایسا گھوڑا جس کی زین اور دوسرا ساز آٹھ سو دینار قیمت کے برابر تھا۔ اسی طرح سے ایک دوسرا اسپ کہ جس کی قیمت بھی اُس کے ساز کے ساتھ آٹھ سو روپے تھی نیز دو اشتر جو ہزار بارہ سو قیمت کے تھے۔ اسی طرح ایک ترکش نقرئی مزید دو تلواریں کہ ان کے نیام بھی چاندی کے تھے میں نے صدرِ جہاں کے پاس بھیج دیے۔

اس کے بدلے میں میں نے اُس سے درخواست کی کہ وہ ان کی قیمت کا تعین کرے اور روپیہ مجھے دے۔ اُس نے اُن کو اپنی تحویل میں رکھا اور تین ہزار دیناروں کے بدلے میں ایک ہزار دینار نقد مجھے بھیج دیئے اور دو ہزار دینار اس گاؤں کے حسابات میں شامل کر لیے جو میرے پاس تھا۔ میں پریشان ہو گیا اور مجھے بخار آ گیا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگر میں اس کی شکایت وزیر سے کروں تو بدنامی ہو گی اور یہ اچھا نہیں ہے۔ میں نے پانچ گھوڑے دو کنیزیں اور دو غلام ملک مغیث الدین محمد پسر ملک الملوک عماد الدین سمنانی کو بھیج دیئے۔

اُس نے مجھے یہ سب واپس کر دیا اور دو سو تنکے مجھے دیئے۔ میں نے اس رقم کے ذریعے دین داری کی مصیبت سے رہائی پائی اور مجھے معلوم ہو گیا کہ اس محمد اور اُس محمدؐ کے درمیان کتنا فاصلہ ہے۔

عزیمتِ ابنِ بطوطہ بہ لشکرِ سلطان

جب سُلطان محمد بن تغلق اپنی مسافرت کے دوران مالا بار کے اطراف میں تلنگانہ تک پہنچا تو اُس کے لشکر میں وبا پھیل گئی۔ سلطان دولت آباد (تغلق آباد) واپس آگیا اور دریائے گنگا کے کنارے فروکش ہوا۔ حکم دیا کہ لوگ وہاں اپنی عمارتیں بنالیں اور گھر تعمیر کریں۔ اسی زمانے میں میں بادشاہ کے لشکر میں گیا اور ان ہی دنوں میں عین الملوک کی شورش کا واقعہ پیش آیا۔ میں بادشاہ کی خدمت میں تھا۔ جب اُس نے اعلیٰ درجے کے گھوڑوں کو اپنے خواص میں تقسیم کیا تو اُن میں مجھے بھی شامل رکھا۔ میں عین الملوک کے ساتھ نبرد آزمائی اور پھر اُس کی گرفتاری کے قضیے میں شامل رہا اور سلطان کی خدمت میں حاضر اُسی کے ساتھ دریائے گنگا اور سرجو ندی سے عبور کیا اور پایہ تخت واپس آگیا۔

ابن بطوطہ سے سلطان کی خفگی کا واقعہ

بادشاہ کے مجھ سے غصے ہونے کا سبب یہ تھا کہ میں ایک دن شیخ شہاب الدین پسر شیخ جام کی زیارت کے لیے اُس غار میں گیا جو شہر دہلی سے باہر تھا اور جہاں شیخ شہاب الدین رہا کرتے تھے۔ میرا مقصد اس سے غار کو دیکھنا تھا کہ وہ شیخ نے خود اپنے لیے بنایا تھا۔ بعد میں جب سلطان نے شیخ کو گرفتار کر لیا تو شیخ کے بیٹوں سے پوچھا کہ شیخ سے ملنے کے لیے کون لوگ آتے تھے۔ اُنھوں نے بہت سے لوگوں کا نام بتایا۔ اُن میں سے ایک میں بھی تھا۔ سلطان نے فرمایا کہ اس کے آدمیوں میں سے چار آدمی میری مجلس میں حاضر رہا کریں اور صورتِ حال یہ تھی کہ جس شخص پر بھی اس طرح سے سلطان کے آدمی مسلط کیے جاتے تھے۔ اُس کی نجات کی توقع مشکل ہی سے کی جا سکتی تھی۔

پہلا دن جب ان معمور کردہ لوگوں نے مجھے اپنی نگہداری میں رکھا جمعہ کا دن تھا۔ اللہ پاک نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی کہ میں "حَسْبُنَا اللہُ وَ نِعْمَ الْوَکِیل" پڑھوں۔ اُن دن میں نے تینتیس ہزار بار اس کلمۂ مقدس کی تلاوت کی۔ رات کو اسی محل میں بسر کی اور پانچ دن تک روزہ رکھا اور روزانہ میں ایک قرآن ختم کرتا تھا اور محض پانی کا گھونٹ پی کر روزہ افطار کرتا تھا۔ میں نے پانچویں دن روزہ افطار کیا اور اُس کے بعد چار دن تک مزید روزہ رکھا۔ انجام کار یہ ہوا کہ شیخ کا قتل عمل میں آیا اور مجھے نجات ملی۔

جب ایک مُدت گذر گئی تو میں اس خدمت گذاری دل برداشتہ ہو گیا اور میری طبیعت اس ملازمت سے اوب گئی۔ میں نے کمال الدین عبداللہ غازی کو جو ایک دانش مند عابد و زاہد اور نادرہ روزگار شخص تھا اپنا پیش رو بنایا وہ اولیائے وقت میں سے تھا اور صاحب کرامت شمار کیا جاتا تھا اور میں نے اُس کی بعض کرامتیں خود بھی دیکھی تھیں، میں اُس کی خدمت میں حاضر ہوا اور کار دنیا سے میں نے گوشہ گیری اختیار کر لی، جو کچھ میرے پاس تھا وہ میں نے راہِ خدا میں صَرف کر دیا۔

شیخ دس روز پیشتر سے لگاتار روزے رکھ رہے تھے ایسا بھی ہوتا تھا کہ بیس بیس دن تک وہ برابر دائم الصوم رہے میرا دل بھی برابر یہ چاہتا تھا کہ میں انھیں کی طرح ریاضتِ شاقہ کروں لیکن وہ مجھے اجازت دے یہ نہیں ہوتا میرے اس مرشد کا کہنا تھا کہ میں ریاضت و عبادت میں اعتدال کی راہ اختیار کروں۔

میں بھی اپنے اندر اس معاملہ میں ایک گونہ کمزوری محسوس کرتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ ابھی تک میں نے کُلّی طور پر ترک دنیا اختیار نہیں کیا تھا اور میرے پاس حال دنیا میں سے کچھ نہ کچھ ضرور تھا میں نے اس کو بھی تقسیم کر دیا تاکہ میں "دار و ندار" کے جھمیلے سے نجات پاؤں یہاں تک کہ میرے تن پر جو لباس تھا میں نے وہ بھی راہ مولا میں دیدیا۔ اور اپنے پیر کی دی ہوئی گدڑی پہن لی۔ چھ ماہ تک میں اسی طرح شیخ کی خدمت میں رہا۔ سلطان اس زمانہ میں دہلی سے غائب تھا اور بلادِ سندھ میں قیام فرما تھا۔

سلطان کی واپسی اور میری سرفرازی کی داستان

جب میری گوشہ گیری اور ترک دنیا کی بابت سلطان نے سنا مجھے حضور میں طلب کیا اس وقت وہ سیوستان میں تھا میں اسی درویشانہ لباس میں اس کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے بڑی ترحی سے بات کی اور لطف وعنایت سے پیش آیا اور مجھ سے یہ خواہش کی کہ میں دوبارہ شاہی ملازمت سے وابستگی اختیار کروں میں نے اُسے قبول نہیں کیا بلکہ سلطان سے اجازت طلب کی کہ میں سفرِ حجاز اختیار کر سکوں۔

سلطان نے اجازت دیدی اور رخصت عطا فرمائی میں واپس ہوا اور ایک گوشہ میں کہ ملک بشیر سے منسوب تھی زاویہ گیری اختیار کی اور یہ ماجرا اواخر جمادی الثانی ۲۷۴۲ھ میں پیش آیا۔

میں ماہ رجب (تمام) اور ماہ شعبان کی دس تاریخ تک اسی زاویہ میں معتکف رہا اور بات یہاں تک پہنچی کہ پانچ پانچ دن تک مسلسل روزہ دار رہتا تھا اور چاولوں کے پانی سے روزہ افطار کرتا تھا اور کھاتا کچھ بھی نہیں تھا، تمام دن تلاوت قرآن پاک میں مشغول رہتا یا پھر تہجد کی نفلیں پڑھتا رہتا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ جب میں کھانے کی از قسم غذا کوئی چیز لیتا تھا تو مجھے ایک گونہ اذیت ہوتی اور اگر کچھ نہ کھاتا تو راحت محسوس کرتا میں نے چالیس دن اسی انداز سے بسر کیے۔ تاآنکہ سلطان نے مجھے دوبارہ طلب کیا۔

ابن بطوطہ کو سفیرِ چین بنا دیا گیا

چالیس روز کے بعد سلطان نے ساز و میراق سے آراستہ ایک گھوڑا چند غلام اور کنیزیں علاوہ بریں امیرانہ پوشاک اور روپیہ مجھے بھیجا میں نے یہ لباس اس لیے پہنا کہ میں سلطان کے سامنے جا سکوں۔ اس وقت میں ایک نیلے رنگ کی گدڑی پہنے ہوئے جو استر دار تھی۔ میں ایام اعتکاف میں اُسے پہنے رہا تھا اب کہ میں نے اُسے

تن سے جدا کیا اور سلطان کے بھیجے ہوئے ملبوس کو پہنا تو میں نے کچھ عجیب سا محسوس کیا۔ میں اس کے بعد جب کبھی اس خرقہ کو زیب تن کرتا تو مجھ پر ایک گریہ بے اختیار طاری ہو جاتا اور میں اپنے باطن میں ایک روحانی روشنی محسوس کرتا۔ اسی لیے میں ہمیشہ اُسے اپنے ساتھ رکھتا۔ یہاں تک کہ وہ راہ زنوں نے لوٹ لیا۔

بہر نوع جب میں سلطان کی خدمت میں گیا تو اس نے میرا اعزاز و اکرام پہلے سے کچھ زیادہ کیا اور کہا میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ میں اپنی طرف سے چین کے بادشاہ کے حضور میں ایلچی بنا کر بھیجوں میں جانتا ہوں کہ تم سیر و سیاحت اور راہ پیمائی کو کس قدر دوست رکھتے ہو۔ اس کے بعد سلطان نے حکم دیا کہ اس سفارت اور عزمِ مسافرت کے لیے جن چیزوں کی فراہمی اور تیاری ضروری ہوگی۔ سلطان کی طرف سے ان کا اہتمام کیا جائے گا۔ نیز جو لوگ اس سفارت کے میرے ہمراہ ہوں گے سلطان نے ان کو بھی معین کیا۔

سلطانی تحائف کو بھیجنے اور ابن بطوطہ کو سفیر بنا کر بھیجنے کے اسباب

بادشاہ چین نے سلطان الہند کو مختلف ہدیے اور تحفے بھیجے تھے جن کی تفصیل کچھ اس طرح ہے سو غلام اور کنیزیں پانسو پارچہ کمخواب کہ ان میں سے یک صد شہر زیتون کی مصنوعات میں سے تھے اور ایک سو شہر کے کاریگروں کے تیار کردہ تھے۔ پانچ جواہرات سے مرصع ملبوس پانچ زردوزی ترکش اور پانچ قبضہ ہائے شمشیر اور یہ خواہش کی تھی کہ سلسلۂ کوہستان ہمالیا واقع بتکدوں (بودھ خانقاہوں) کو جو لشکر کشوں کی دست برد کے دوران، غیر آباد اور ویران ہو گئے ہیں دوبارہ تعمیر کرائے جائیں۔

سلطان الہند کی طرف سے یہ کہا گیا کہ جو آبادیاں سلطان وقت کو جزیہ ادا نہیں کرتیں ان کی طرف سے کوئی ذمہ داری سلطان الہند پر عاید نہیں اگر یہ آبادیاں ذمی کی حیثیت سے ہمارے زیرِ نگرانی آجائیں تو ان بُت خانوں کی تعمیر و آبادی ممکن ہے۔

بادشاہ چین کے لیے سلطانی ہدیے

سلطان الہند نے بادشاہ چین کے ہدیوں کے جواب میں جو تحفے ارسال کیے وہ چینی ہدایہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ بیش قیمت اور قابلِ قدر تھے۔ ان میں سو عمدہ قسم کے گھوڑے سو غلام اور سو ہندوستانی کنیزیں جو نہ صرف یہ کہ پڑھنے کا ہنر جانتی تھیں بلکہ انھیں فن رقص بھی آتا تھا اور ایک صد پارچہ بیرمی کہ روئی کے نرم اور باریک ریشے سے تیار کیے جاتے ہیں اور خوبی و زیبائی میں بے نظیر ہوتے ہیں اور ان کے ایک " " (تھان) کی قیمت سو دینار ہوتی ہے۔

اسی طرح ساٹھ پارچہ ہائے حریر کے سو "شقے" بھی تھے اس کپڑے کو خز کہا جاتا ہے یہ وہ عمدہ کپڑا ہے جو ریشم سے تیار کیا جاتا ہے اور اس کے تار پانچ رنگوں میں رنگے جاتے ہیں۔ سو جامے اس کپڑے کے تھے جو "صلاحیہ" کے نام سے مشہور ہے اور اسی طرح صد پارچۂ "شیریں باف" اور یک صد "شال باف" اور پانسو جامے "مرغزی" کپڑے کے کہ ان کے سو تھان سفید اور ایک سو تھان سیاہ تھے۔ یک صد سُرخ اور یک صد سبز، اور اسی عنوان سے یک صد تھان نیلے رنگ کے تھے۔

ان تحائف کے ساتھ سو شقے دیبائے رومی کے اور ایک سو شقے پارچہ باف کے، نیز سراچے، چھ قبّے، چار طلائی اور چھ نقرئی شمعدان، اور چار سونے کے طشت اور زرّیں مراجیاں مزید چھ طشت چاندی کے اور دس خلعت شاہی زربفت سے تیار کیے ہوئے اور اسی طرح دس عدد درباری دستاریں کہ ان میں سے ایک مرصع بجواہر تھی اور دس ترکش کہ ان پر زردوزی کی گئی تھی اور ان میں سے ایک جواہر نگار تھا اور اسی طرح دس تلواریں جن میں سے ایک کا دستہ جڑاؤ تھا اور ایک " " کہ وہ بھی زر و جواہر سے آراستہ پیراستہ تھا اور ان سب اشیاء کے ساتھ پندرہ پیش خدمت بھی تھے۔

روانگی چین

سلطان نے اس مسافرت کے لیے ظہیر الدین زنجانی کو جو کہ وہ اصحاب علم و فضل میں سے ایک شخص تھا کافور شرابدار کے اتفاق کے ساتھ کہ تمام تحفے اور ہدیے اس کے سپرد تھے، ہمارے ہمراہ کیا نیز حکم دیا کہ امیر محمد ہراتی ایک ہزار سواروں کے ساتھ ہمیں ساحلِ دریا تک پہنچائے اور چین پہنچ کر دربار سلطانی کی نمایندگی کرنے والی جماعت کو جو پندرہ افراد پر مشتمل تھی اور ان میں سب سے بزرگ شخص ترسی نام رکھتا تھا کم و بیش ایک صد افراد، بطور خدمت گذار ہمارے ساتھ تھے۔ ہم نے اس ترتیب کے ساتھ ایک خاصے بڑے لشکر کی صورت میں آغاز سفر کیا۔ سلطان نے یہ حکم بھی صادر کیا تھا کہ بلاد ہندوستان میں جہاں سے بھی ہمارا سفر دربار شاہی کے نمایندوں کی حیثیت سے ہماری پذیرائی عمل میں آئے۔

ہماری مسافرت کا آغاز ماہ صفر کی سترہ تاریخ کو ہوا۔ اس روز کو خصوصاً روانگی سفر کے لیے انتخاب کیا گیا تھا اس لیے کہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مسافرت یا دوسری تاریخ کو اختیار کی جائے یا سات تاریخ کو یا پھر بارہ یا سترہ تاریخ کو بائیسویں یا ستائیسویں تاریخ بہت ہی مبارک خیال کی جاتی ہے۔ سب سے پہلے جس مقام پر ہماری منزل ہوئی وہ ایک موضع تھا کہ دہلی سے دو فرسخ اور ایک ثلث کے فاصلے پر واقع ہے وہاں سے "ہلو" اور بعد ازاں ہم ایک بڑے شہر یعنی بیانہ میں پہنچے۔ یہ شہر بہت خوبصورت ہے اس کے دو طرفہ بازار بہت پُر رونق ہیں اور اس کی مسجد جامع بہت ہی خوبصورت مسجدوں میں ہے جس کی دیواریں اور سقف پتھر سے تیار کی گئی۔ حاکم بیانہ مظفر الدین دایہ ہے اس امیر کی ماں سلطان کی دایہ تھی۔

سلطان ہند کی بہن کی شادی کی داستان

امیر سیف الدین غدا جو ہبت اللہ منہا کا بیٹا ہے اور ملکِ شام کے اُمراء میں سے ہے۔ وہ اُن امیروں میں شامل تھا جنہیں ہندوستان کے دربار میں بہت اعزاز اور اکرام سے نوازا گیا۔ اُسے سلطان جلال الدین کے محل میں ٹھہرایا گیا۔ اس محل کو کوشکِ لعل کہتے ہیں جس کے معنی قصرِ احمر کے ہیں اور یہ ایک عظیم محل ہے۔ جس کا صحن بہت کُشادہ ہے اور اس کی راہیں بہت فراق یہ محل اونچائی پر واقع ہے۔ یہ میدان اور دوسرا میدان آگے جا کر اس محل سے مل جاتے ہیں، سلطان جلال الدین اس ایوان میں کرسی نشین ہوتا تھا اور اس کے سامنے یہاں چوگان کھیلتے تھے۔

اس کو میں نے اُس وقت دیکھا تھا جبکہ اسے امیر سیف الدین کو رہائش کے لیے دیا جا رہا تھا۔ یہ ہر طرح کے قیمتی سامان فرش فروش اور قالین وغیرہ سے دیوار بہ دیوار آراستہ تھا۔ ہندوستان کی رسم یہ ہے کہ بادشاہ کی موت کے بعد اُس کے محل کو اُسی حالت میں رکھا جاتا ہے۔ اور اُس کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتے اور آنے والا بادشاہ اپنے لیے دوسرا محل بناتا ہے۔ میں اس محل میں خوب گھوما اس کے بالائی حصے تک گیا اور مجھے اُس وقت اس طرح سے عبرت ہوئی کہ بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اس وقت فقیہ ادیب جمال الدین مغربی جو غرناطہ کا رہنے والا ہے؛ مجایہ شہر میں پیدا ہوا تھا اور اس وقت ہندوستان میں زندگی گزار رہا تھا وہ بھی میرے ساتھ تھا۔ یہ شخص اپنے باپ کے ساتھ ہندوستان آیا تھا اور اب یہیں صاحب خانہ ہو کر رہ رہا تھا اُس کے اولاد بھی ہے۔ اُس نے جب اس قصر کو دیکھا تھا تو اس کے تاثر کو ایک شعر میں ظاہر کیا تھا۔ اُس کا یہ مطلب ہے۔ اگر اُن ... بادشاہوں کا جو یہاں حکومت کرتے رہے ہیں، تمہیں کوئی سُراغ چاہیے تو خاک سے پوچھو کر اُن کے بلند سروں کا اب سوائے ہڈیوں کے اور کوئی نشان باقی نہیں۔ امیر سیف الدین کی شادی کا ولیمہ جس کی تفصیل میں آئندہ بیان کروں گا۔ اسی محل میں ہوا تھا

ایک بار ملک بایزید نے مانک پور کی ولایت سے معتبر ہدیے سلطان کے پاس بھیجے۔ ان میں سے سلطان نے گیارہ گھوڑے جو عمدہ نسل کے تھے۔ امیر سیف الدین کو بخش دیئے۔ اسی طرح ایک دوسرے موقع پر دس گھوڑے مُرصع ساز اور طلائی لگاموں کے ساتھ اس امیر کو عطا کر دیے یہاں تک کہ اپنی بہن فیروز خاتون کو اس کے نکاح میں دیدیا۔

جب سلطان ہند کا فرمان امیر سیف الدین عمدا کے ساتھ اپنی خواہر کی شادی کے سلسلے میں صادر ہوا۔ تو ملک فتح اللہ جو شب نویس کے نام سے معروف ہے۔ شادی کے جشن اور اس کے لیے تمام ضروری سامان کی تیاری کے واسطے ہوا، مجھے بھی اس کے لیے مقرر کیا گیا کہ میں چند روز امیر کے ساتھ رہوں ملک فتح اللہ نے حکم نامہ صادر کیا کہ چادریں تان دی جائیں اور قصر احمر کے دونوں میدانوں کے لیے سائبان یا شامیانے بنائے جائیں اور ہر ایک میدان میں ایک وسیع اور کشادہ خیمہ نصب کیا جائے اور اُس میں عُمدہ فرش اور قالین بچھائی جائیں۔

شمس الدین تبریزی کو جو رقص کرتے اور نغمہ سرائی کرنے والوں کا رئیس تھا۔ اس لیے دعوت دی گئی کہ وہ اپنی تمام رقاصہ عورتوں اور نغمہ سرا مردوں کے ساتھ اس جشن میں شریک ہو۔ کھانا پکانے، روٹیاں بنانے، بریانی تیار کرنے اور اسی طرح مٹھائی والوں، شربت داروں اور پان والوں کو جمع کیا گیا بے شمار مُرغ اور بکرے ذبح کیے گئے اور لوگوں کو دعوتیں کھلائی جاتی رہیں۔

رخصتی کی شب سے پہلے عورتیں شاہی محل سے اس محل تک آئیں۔ اور اُس کو آراستہ کیا اور بہترین ترتیب کے ساتھ اس میں فرش بچھائے گئے۔ امیر سیف الدین کو اندر طلب کیا گیا۔ امیر تو ایک عرب کا رہنے والا انسان تھا اور یہاں اس کا کوئی عزیز نہیں تھا۔ عورتوں نے اس کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور ایک خاص جگہ لیجا کر بٹھایا گیا۔ بادشاہ کے حکم مبارک خاں کی ماں کو امیر سیف الدین کی ماں کے طور پر متعین کیا گیا تاکہ وہ صورت پیدا ہو جائے کہ جیسے امیر اپنے خاندان کی خواتین کے درمیان ہو۔

ان خواتین نے امیر کو اس خاص جگہ پر بٹھایا جو اس موقع کے لیے تیار کی گئی تھی۔ مہندی لائی گئی اور اس کے ہاتھ پیر کو اس زمانے میں حنا آلود کیا گیا۔ دوسری عورتیں گانے اور رقص کرنے میں مشغول ہوئیں۔ اس کے بعد وہ اس محل کی طرف چلی گئیں جو دولھا اور دُلہن کی ملاقات کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ اور امیر اپنے کچھ خاص احباب کے یہاں رہ گیا۔ سلطان نے یہ حکم دیا تھا کہ امیروں کی ایک جماعت دولھا کے ہم قوم لوگوں اور عزیزوں کے طور پر اس کے ساتھ رہے اور اسی طرح کچھ دوسرے لوگ دُلہن کے رشتے داروں کی حیثیت سے ان مراسم میں شرکت کریں۔ ہندوستان میں یہ رسم کچھ اس طور پر ہوتی ہے کہ دُلہن کے آدمی اس محل میں جہاں عروس اور نوشہ کی ملاقات طے ہوتی ہے جمع ہوتے ہیں اور جب نوشہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ وہاں آتا ہے تو عروس کے لوگ اس کا راستہ روکتے ہیں۔ دولھا اور اس کے ہمراہی یا تو بزور وہاں جانے کی کوشش کرتے ہیں یا پھر بہت سا روپیہ دیتے ہیں یہاں تک کہ دولہن والے دست بردار ہو جاتے ہیں اور راستہ دیدیتے ہیں۔

غروب آفتاب کے کچھ بعد کا وقت تھا کہ نیلے ریشم سے تیار کیا ہوا ایک خلعت جو سنہرے کام سے مزین اور مرصع تھا اور جواہرات کے کثرت کے باعث اس کا رنگ کا بھی پتہ نہ چلتا تھا۔ ایک ایسے دستار کے ساتھ کہ اسی خلعت کی نظیر پیش کرتی تھی شہانہ جوڑا امیر سیف الدین کے محل میں لایا گیا۔ میں نے ان خلعتوں کو بھی دیکھا تھا جو سلطان نے اپنے دوسرے دامادوں کو بھجوائے تھے۔ مثلاً عماد الدین سمنانی ملک الاعلماء، شیخ الاسلام اور صدر جہاں کے بیٹوں کو ان میں سے کوئی خلعت بھی اس خلعت کے برابر خوبصورت اور شاندار نہیں تھا جو امیر سیف الدین کو بھیجا گیا تھا امیر ، اس خلعت کے حصول کے بعد اپنے ہمراہیوں اور غلاموں کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہوا ان ملازموں اور غلاموں میں سے ہر ایک اپنے ہاتھ میں چھوٹا سا عصا لیے ہوئے تھا۔

اس وقت اک پھولوں سے بنا ہوا ہار لایا گیا جس میں چنبیلی، موگرا اور ایسے ہی چھوٹے چھوٹے پھول سجے ہوئے تھے۔ اُسی کے ساتھ ایک بدھی اور سہرے جیسی پھولوں کی لڑیاں بھی

تھیں جس سے سر اور سینے کو چھپاتے ہیں۔ امیر نے ان کو پہننے میں تامل کا اظہار کیا۔ اس لیے کہ وہ عرب کے بادیا نشینوں میں سے تھا اور ان چیزوں سے انھیں کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔ میں اُس کے پاس گیا اور میں نے اُس کو قسم دی جس کے بعد اُس نے ہار کو لے لیا۔ اپنے سر پر رکھا اور محل شاہی کے دروازے تک آیا۔ یہاں دلہن کے لوگوں نے باڑھ روک دی کی۔ امیر نے اُن آدمیوں کے ساتھ مل کر جو چھوٹے چھوٹے عصا ہاتھ میں لیے ہوئے آئے تھے اُن پر حملہ کیا اور جو آدمی اُس کا راستہ روک رہے تھے انھیں ادھر اُدھر بھگا دیا۔ —— جب یہ خبر بادشاہ کے کانوں تک پہنچی تو اسے اچھا لگا۔ نوشاہ اس ترتیب سے دلہن کے محل تک پہنچا عروس ایک اونچی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی جو دیبا و حریر کے صندلی پوشوں سے آراستہ تھی اور اس پر سنہرے ہاروں سے پھول بوٹے بنائے گئے تھے۔ وہ محل سرا عورتوں اور گانے والیوں سے بھری ہوئی تھی ہر طرح کے آلات موسیقی وہاں حاضر تھے تمام آدمی دولھا کے احترام میں کھڑے ہو گئے اور وہ اُس جگہ تک سوار آیا جہاں دولہن بیٹھی ہوئی تھی۔ وہاں سے گھوڑے سے اتر کر پاپیادہ ہو گیا اس کو دولہن کے کرسی کے قریب میں جگہ دی گئی عروس اُس کی آمد پر کھڑی ہو گئی یہاں تک کی داماد تخت پر آ گیا پس دولہن نے پان لیا اور وہ دولھا کو پیش کیا۔ دولہن جس جگہ بیٹھی ہوئی تھی وہ اُس سے نچلی کرسی پر بیٹھا۔ دولھا کے لوگوں نے سنہرے سکے اظہار شادمانی کے طور پر لوگوں پر نچھاور کیے ان طلائی سکوں کو عورتوں نے جمع کیا۔

جب یہ رسمیں ادا کی جا رہی تھیں تو گانے والی عورتیں برابر بلند آواز سے گا رہی تھیں اور باہر نقارے نفیریاں اور دوسرے ساز بجائے جا رہے تھے اُس وقت امیر اُٹھا اور دولہن کا ہاتھ پکڑا اور تخت سے نیچے اور عروس دولھا کے پیچھے روانہ ہوئی۔ امیر گھوڑے پر سوار ہو کر فرش فروش اور قالین اور وہاں جو بساط بچھی ہوئی تھی اُس کے اوپر سے گزرتا ہوا وہاں سے واپس ہو گیا۔ اس مرتبہ اس پر اور اُس کے آدمیوں پر دولہن کے آدمیوں کی طرف سے پھر سکے نچھاور کیے گئے۔ دولہن کو ایک محل میں بٹھایا گیا اور غلاموں نے اس کو اپنے کندھے پر اٹھایا اور امیر سیف الدین کے محل کی طرف روانہ ہوئے۔

ساتھ والی خواتین دلہن کے محمل کے سامنے گھوڑوں پر سوار چل رہی تھی اور دوسری عورتیں پیادہ پا دلہن کے ساتھ تھی اور جب دُلہن امیر کے گلتو خانے یا پھر کسی بزرگ کے سامنے سے گزرتی تھی یا پھر کسی بزرگ کی رہائش گاہ کے سامنے سے گزرتی تھی تو صاحبِ خانہ باہر آتا تھا اور اپنے دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر درہم و دینار دُلہن پر نثار کرتا تھا اور اس ترکیب سے عروس کو نوشہ کے محل تک پہنچایا گیا۔

اُس سے اگلے روز عروس کی طرف سے اُس کے شوہر کے آدمیوں کو روپے اور تحفے بھیجے گئے۔ سلطان نے ان لوگوں میں سے ہر ایک کو زین و لگام کے ساتھ گھوڑے عنایت کیے اور اسی کے ساتھ دو سو سے لے کر ہزار دینار تک کے سکوں سے بھری ہوئی تھیلیاں اُن لوگوں کو بخشی گئیں۔ ملک فتح اللہ نے بھی خواتین کو رنگارنگ ریشمی جوڑے اور سیم و زر کی تھیلیاں بھیجیں اور گانے بجانے والی طائفوں کو بھی جوڑے اور درہم و دینار عطا کیے۔

ہندوستان میں رسم کچھ اس طرح ہے کہ گانے والوں کو کوئی شخص روپیہ پیسہ نہیں دیتا۔ انھیں جو بھی انعام و اکرام ملتا ہے وہ نوشہ کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ اُس روز سب لوگوں کو کھانا کھلایا گیا اور سلطان نے یہ فرمان نافذ کیا کہ بلادِ مالوا و گجرات کھمبایت اور نہروالا کی صوبہ داری امیر سیف الدین کو دی گئی اور ملک فتح اللہ کا مذکور کو امیر سیف الدین کی نیابت پر مامور کیا گیا۔ سلطان امیر کی بہت تعظیم و تکریم کرتا تھا لیکن وہ ایک آزاد مزاج عرب تھا ان سب چیزوں کی قدر نہیں کرتا تھا اور صحرائی تمدن کی درشت مزاجی اُس پر غالب رہی۔ نتیجہ یہ کہ شبہائے عروسی کے کچھ دن گزرنے کے بعد اُس کی جہاں داری کا دن بے نور ہو گیا۔

انعامات در قحط سالی

جس زمانے میں کہ ولایت ہندوستان میں خشک سالی کا دور دورہ ہوا اور قحط اس حد تک آگے بڑھا کہ ایک من گیہوں چھ دینار میں فروخت ہوتا تھا تو سلطان نے

حکم دیا کہ تمام اہلِ دہلی کو ششش ماہ غلّہ اور دوسری اجناس شاہی انبار خانے سے مہیّا کی جائیں اور اُن کی مقدار ایک اور آدھا رطل رکھی گئی کہ روزانہ ہر شخص کو چاہے وہ بڑا ہو یا چھوٹا آزاد ہو یا غلام، عورت ہو یا مرد شاہی انبار خانے سے دی جاتی تھیں۔ فقیہی اور قاضی شہر کے محلّوں میں لوگوں کے ناموں کی فہرستیں تیار کرتے تھے اور چھ مہینے تک کام میں آنے والا ذخیرۂ اجناس اُن کو سونپتے تھے۔

دہلی کی تخریب اور اُس کے شہریوں کی آوارہ سازی بادشاہ پر جو اعتراضات ہوتے ہیں اُن میں سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ سلطان نے دہلی کے باشندوں کو اُن کے شہر سے نکال کر بہت دُور پہنچایا اور اس اقدام کا سبب یہ تھا کہ دہلی کے لوگ سلطان کے بارے میں خفیہ خط لکھتے تھے اور اس میں سلطان کو طرح طرح کے فحش کلمات اور بدگوئی سے بھرے فقرات سے یاد کرتے تھے اُن پر مہر لگاتے تھے اور لفافے پر یہ لکھ دیتے تھے برائے سلطان عالم نیز یہ کہ اس خط کو کوئی دوسرا نہ پڑھے اور رات کے وقت یہ خط کسی نہ کسی صورت سے سلطانی محل میں بھیج دیتے تھے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ خط بادشاہ کے ہاتھوں میں پہنچتے تھے اور اسی کے نتیجے میں بادشاہ نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ دہلی کو ویران کر دے گا اس نے تمام گھروں، حویلیوں اور مندروں کو خرید لیا۔ وہ اس شرط کے ساتھ خرید اکر ان کے مالک اُنھیں خالی کر دیں۔ اس کے بعد یہ حکم دیا کہ شہر کے تمام آدمی دولت آباد کے لیے کوچ کریں۔ لوگوں نے اس حکم پر عمل نہ کیا۔ حکومت کی طرف سے شہر کے گلی کوچوں میں یہ منادی کرادی گئی کہ تین روز کے اندر اندر اب شہر میں کوئی نہ رہے۔ کافی تعداد میں لوگوں نے اپنا رختِ سفر باندھ لیا لیکن کچھ ایسے تھے کہ وہ اپنے گھروں میں چھپ گئے۔ سلطان نے حکم دیا کہ گھروں کی تلاشی لی جائے اور جو لوگ گھروں میں چھپ گئے ہیں اُن کو باہر لایا جائے۔ بادشاہ کے غلام دہلی کے کوچہ و برزن میں پھرے۔ صرف ان کو دو آدمی ملے۔ ایک اندھا تھا اور دوسرا لنگڑا۔ دونوں کو بادشاہ کے سامنے لایا گیا حکم دیا کہ جو زمین گیر ہے اسے منجنیق سے باندھ کر پھینک دیا جائے اور اندھے کے لیے کہا کہ اس کو گھوڑے کی دُم سے باندھ دیا جائے اور دولت آباد تک کہ چالیس دن کا راستہ ہے۔ اسی طرح

اُس کو گھسیٹتے ہوئے لے جائیں۔ اس غریب کا پیکر راہ میں ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا اور فقط اُس کا پیر وہاں پہنچا۔

اس واقعہ کے بعد دہلی کے شہریوں نے ترکِ وطن اختیار کیا اور اپنا مال و اسباب گھروں سے باہر نکال دیا۔ شہر بالکل ویرانہ ہوگیا۔ یہ سب باتیں میں نے اُس شخص سے سُنی ہیں جن کی باتوں پر مجھے پورا اعتماد ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دن بادشاہ رات کے وقت بالاحصار تک پہنچا اور اس پر چڑھ کر اُس نے دیکھا کہ اس کا تمام پایۂ تخت ویران ہے نہ کسی کے گھر میں آگ روشن ہوتی تھی نہ دھواں اُٹھتا تھا۔ لوگوں کے آنے جانے کے کوئی آثار شہر میں بالکل نہ تھے۔ بادشاہ نے کہا کہ اب میرا دل ٹھنڈا ہوا میری خاطر جمع ہوئی۔ اس وقت یہ حکم دیا کہ دوسرے شہر کے لوگ دہلی آجائیں تاکہ یہ شہر دوبارہ آباد ہوجائے لیکن اس حکم نامہ کے نتیجے میں بھی دہلی آباد نہ ہوا اور وہ شہر بھی ویران ہوگئے اس لیے کہ دہلی کی آبادکاری کے بارے میں کوئی یوں سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ یہ شہر اپنی وسعت اور عظمت کے لحاظ سے دنیا کے عظیم ترین شہروں میں سے ہے جس وقت کہ ہم اس شہر میں وارد ہوئے اس کا تھوڑا سا ہی حصہ آباد تھا باقی ویران پڑا ہوا تھا۔

اہل ہنود یہاں مسلمانوں کے ساتھ ایک ہی منطقہ میں زندگی گذارتے ہیں۔ مقابلہ کے وقت غلبہ باہر سے آنے والے مسلمانوں کا رہتا ہے۔ ہندوستان کے مقامی لوگ، ایسے مواقع پر اِدھر اُدھر جنگلوں، نیستانوں اور پہاڑوں میں جاکر پناہ گزیں ہوجاتے ہیں نیزہ نے ہندوستان میں مجوف نہیں ہوتا دکذا) پھر بانس کے بڑے بڑے پودے نیستانوں میں ایک دوسرے سے گوتھم گوتھ رہتے ہیں۔ پہلے جنگل کا تو پھر ان سے جنگ کروآلات مہیا کرکے بھی ان کا کچھ نہیں بنا سکتے کہ دہرے) بانسوں میں آگ نہیں لگتی۔ ایک دوسرے کے ساتھ حلقہ در حلقہ ہونے کی وجہ سے انھیں کاٹنا بھی آسان نہیں ہوتا۔ یہ بہت محکم ہوتے ہیں جو ہندو لوگ ان جنگلوں میں رہتے ہیں وہ ان کے ذریعہ اپنا تحفظ کرتے ہیں اور ان کے مویشیوں کی چراگاہیں اور ان کے کھیت کھیان جنگلوں یا ان کے آس پاس ہی کہیں ہوتے ہیں وہ بارش کا پانی اکٹھا کرکے ذخیرہ آب تیار و مہیا کر لیتے ہیں اا) ہمک دسترس اور ان پر تسلط آسان نہیں ——

مراسم ولیمہ

ولیمہ کی رسمیں ہندوستان اور شاہی شہر میں کچھ ایسی ہیں کہ کھانا کھانے کے بعد سادات، مشائخ اور قاضیوں کے سامنے ایک خاص طرح کا برتن رکھتے ہیں۔ جس کی شکل چار پایوں کے کھانے کے برتن سے بہت مشابہہ ہوتی ہے۔ ان کے اوپر کا حصہ کھجور یا ناریل یا ایسے ہی دوسرے درختوں کے خشک پتوں سے تیار کیا جاتا ہے۔ اس ٹوکری یا بڑی سی چنگیر میں توے کی روٹیاں بھنا ہوا بکرا یا بھیڑ اور چار روغنی روٹیاں رکھتے ہیں اور باقی کو ایک خاص طرح کے حلوے سے پُر کرتے ہیں جو تلوں کے تیل، ۔ ۔ ۔ یا شہد سے بنایا جاتا ہے۔۔ اُس پر چار برفی کے ٹکڑے رکھتے ہیں اور اُس پر ایک چمڑے کا بنا ہوا چھوٹا سا طبق حلوے اور سموسوں سے پُر کر کے رکھتے ہیں کہ اس کی شکل بھی کشتی نما ہو جاتی ہے اور اُس کو ریشم کے ایک خوان پوش سے ڈھکتے ہیں۔

لیکن ان لوگوں کے لیے جو اس سے نچلے طبقے کے لوگ ہوتے ہیں، ۔۔۔ بکری کے بجائے گوشت کی مقدار نصف کر دیتے ہیں اور اُسے ذلہ کہتے ہیں اور اسی طرح اُن تمام کھانے والوں کو

جن کا ذکر اوپر آیا اُن کی مقدار اُن کے مقابلے میں نصف ہو جاتی ہے اور جو اس سے بھی نچلا طبقہ ہے اُسے چوتھائی ملتا ہے۔ بعد ازاں ہر آدمی خوراک کی اُس مقدار کو اٹھا لیتا ہے جو اُسے پیش کی گئی ہے۔

جب میں نے اس رسم کو پہلے پہل دیکھا تھا تو میں شہر سرا یعنی سلطان کے پایہ تخت میں مقیم تھا اور نیا تھا چونکہ اس سے پیشتر اُس سے کوئی واسطہ نہ پڑا تھا۔ اس لیے میں نے اپنے خادموں سے یہ نہیں کہا کہ جو غذا مجھے کھانا کھانے کے بعد پیش کی گئی تھی وہ بھی اٹھا کر لے چلیں ولیمہ کے کھانے میں سے محترم اشخاص کے یہاں بھی حصہ بھیجا جاتا ہے۔

شہاب الدین احمد عباس

مسالک الابصار

مسالک الابصار عربی زبان میں ترتیب دی ہوئی ایک ایسی رو داد سفریا مشاہدات پر مبنی سر نوشت ہے جس کا مرتب شہاب الدین احمد عباس ہے۔ یہ روایتیں مصنف کو ان لوگوں کی زبانی معلوم ہوئیں جو ہندوستان کی سیر کر چکے تھے اور دہلی کے کوائف جن کی یادداشتوں میں شامل تھے۔

مرتب نے ایسے اصحاب کے ناموں کی طرف اشارہ کیا ہے مثلاً ابو صفا عمر ابن شبلی کی زبانی دہلی والوں کے حالات کا علم ہوا تھا کہ وہ لوگ تیز فہم اور عقل مند ہیں فارسی اور ہندی زبانیں خوب بولتے ہیں ان کی عقلیں تیز اور ذہن صاف ہوتے ہیں ان میں سے اکثر فارسی اور ہندی زبانوں میں شعر بھی کہتے ہیں اور بعض عربی میں بھی شعر کہہ لیتے ہیں۔

اس کا ایک سماعی ماخذ شیخ مبارک کے بیانات بھی ہیں جس سے اُسے معلوم ہوا کہ ہندوستان میں تلوار، تیر کمان، نیزے اور قسم قسم کے ہتھیار بنانے والے بھی ہیں زرہ اور زین بنانے والے بھی۔ یہاں کے لوگوں میں صاحبِ قلم بھی ہیں اور صاحب سیف بھی۔

ابن بطوطہ کے سفر نامے سے بھی اس نے استفادہ کیا ہے اور ایک سے زیادہ موقعوں پر اس کی روایتیں پیش کی ہیں مثلاً یہ کہ ہندوستان میں ہندو تمام ملک میں مسلمانوں سے ملے جُلے رہتے ہیں۔

کسی راوی کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ ہندوؤں کو روپیہ پیدا کرنے اور دولت جمع کرنے کا شوق ہے وہ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ تم نے کتنی روکڑ اکٹھی کرلی ہے۔ لین دین میں بڑی احتیاط برتتے ہیں۔

بعض دوسرے راوی بھی اس کے رشتۂ معلومات سے وابستہ ہیں جن کے نام مذکور نہیں لیکن ان کے بیانات اس سلسلۂ حرف وحکایات کی زینت ہیں۔ ... مرتب کا کہنا ہے بعض راویوں نے یہ بیان کیا کہ دہلی میں کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ ہزاروں عمدہ عمدہ غلام سستی قیمت پر نہ بکتے ہوں۔ ... خدمت کرنے والی لونڈیوں کی قیمت دہلی شہر میں آٹھ آنے یا ٹنکہ سے بھی کم ہے۔

اس میں حافظ ابن تاج ملتانی کا بھی ذکر آیا ہے ناصر الدین محمد قرمزی -- شیخ ابوبکر بن خلال کا بھی اور عبدالکریم غرناطی کا بھی وغیرہ وغیرہ۔

راقم الحروف نے مسالک الابصار کے ان بیانات کو پروفیسر آغا مہدی حسین کی کتاب "سلطان الہند محمد شاہ بن تغلق" سے اخذ کیا ہے۔

آغا صاحب نے اس طرف اشارہ، مقدمۂ کتاب میں بھی کیا ہے اور اپنی تصنیف کے باب ہشتم (آٹھواں باب تہذیب اور معاشرت) میں اس کی ان روایتوں کو نقل کیا ہے یہ سلسلہ اس کتاب کے صفحہ ۲۱۲ سے ۲۴۵ تک پھیلا ہوا ہے۔ کتاب کی اشاعت ۱۹۳۷ء میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد یوپی سے عمل میں آئی۔ اس وقت آغا صاحب آگرہ کالج ہسٹری ڈپارٹمنٹ سے وابستہ تھے۔

مسالک الابصار کی روایت

عظیم الشان سلطنت

(دہلی)

"مسالک الابصار" میں لکھا ہے کہ سرزمین کی وسعت، دولت کی بہتات، اور لشکر کی کثرت کے اعتبار سے ہندوستان ایسی عظیم الشان سلطنت ہے کہ اس کے مقابلے میں روئے زمین پر کوئی دوسری سلطنت نہیں۔ ہندوستان ایسا ملک ہے کہ جس کے سمندروں سے موتی نکلتے ہیں، جس کی زمین سونا اُگلتی ہے، جس کے پہاڑوں میں یاقوت اور الماس کی کانیں ہیں، جس کے درختوں میں عود اور کافور لگتا ہے جس کے شہر بڑے بڑے بادشاہوں کے پایۂ تخت ہیں، جس کے وحشی جانوروں میں ہاتھی اور گینڈے جیسے جانور پائے جاتے ہیں، جس کے لوہے سے ہندی تلوار بنتی ہے، جس میں لوہے پارے اور سیسے کی کانیں ہیں، جہاں زعفران کی کاشت ہوتی ہے۔ جس کی بعض وادیوں میں نئے نئے میوے پیدا ہوتے ہیں، جس کی خوبیاں بہت زیادہ ہیں، جس کے نرخ سستے ہیں، جس کی فوجیں بے شمار ہیں اور جس کے شہر اور علاقے بے حد ہیں، جن کے درمیان کہیں ویرانہ نہیں۔

عبدالرحیم قلیشی غرناطی نے تحفتہ الباب میں لکھا ہے کہ ہندوستان کے پہاڑوں اور جزیروں میں ایسے درخت ہیں جن سے عود اور کافور پیدا ہوتا ہے اور سب طرح کی خوشبوئیں بھی مثلاً لونگ، جائفل، بادام، الائچی، دارچینی، تیج پات کبابہ، جوتری اور طرح طرح کی جڑی بوٹیاں۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں مشکی ہرن بھی ہیں اور طرح طرح کے یاقوت بھی۔

سدا بہار

"مسالک الابصار" میں لکھا ہے کہ شیخ مبارک سے پوچھا گیا "تم نے ہندوستان کو اور اس کے میدانوں کو کیسا پایا؟" اس نے جواب دیا کہ اس ملک میں دریا ہیں جو دور دور تک چلے گئے ہیں۔ چھوٹے بڑے سب ملا کر ہزار ہوں گے۔ بڑائی میں بعض تو دریائے نیل کے برابر ہیں اور بعض اس سے کم ہیں۔ جیسے ہندوستان میں دریا چھوٹے بڑے ہیں ویسے ہی گاؤں اور شہر بھی چھوٹے بڑے ہر انداز کے ہیں۔ اور وہاں بھنگ کی کاشت بھی بہت ہوتی ہے۔ ہندوستان میں ایسے معتدل آب و ہوا والے شہر بھی ہیں جہاں موسموں کا اختلاف نہیں۔ نہ وہاں گرمی ہی زیادہ ہوتی ہے نہ سردی۔ گویا وہاں کا کل زمانہ موسم بہار ہے۔

پیداوار

ہندوستان میں طرح طرح کے غلے مثلاً گیہوں، چاول، جو، چنا، مسور، ماش، لوبیا وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن باقلہ کم پایا جاتا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ باقلے کی کمی اس سبب سے ہے کہ یہاں حکیم زیادہ ہیں اور حکیموں کے نزدیک باقلہ عقل کو کند کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے پیشواؤں نے اسے حرام کر دیا ہے۔

ہندوستان میں میوے بھی ملتے ہیں مثلاً انجیر، انگور، انار، جو بڑا اور میٹھا ہوتا ہے۔ بڑا لیموں اور کاغذی لیمو، گولر، کالا شہتوت، کھٹمٹھے، کیلے، شفتالو، نارنگیاں، خربوزے، تربوز، ککڑیاں، کھیرا اور پھوٹیں۔ یہ سب ہندوستان کے پھل ہیں۔ مگر انجیر اور انگور بہ نسبت اور میووں کے کم پائے جاتے ہیں۔ بہی ہندوستان میں بھی ہوتی ہے اور باہر سے بھی لائی جاتی ہے امرود اور سیب بھی پیدا ہوتے ہیں،

مگر بہی سے مقدار میں کم پائے جاتے ہیں۔ ان سب کے علاوہ ہندوستان میں ایسے میوے بھی ہوتے ہیں جو مصر، شام اور عراق میں نہیں ہوتے، مثلاً آم، مہوا، لوکاٹ، کسیرو وغیرہ ...... اور ناریل تو، جسے ہند کا اخروٹ کہنا چاہیئے لاجواب ثمر ہے۔ وہ سبز ہوتا ہے اور دودھ سے بھرا ہوتا ہے۔ ناریل اور کیلے دہلی میں اس کی گرد و نواح کی نسبت کم ہیں مگر دہلی میں یہ پھل دساور سے بہت آتے ہیں۔ دہلی کی نواح میں گنّا بہت ملتا ہے اور بہتات کے سبب اس کی بے قدری ہے۔ ایک قسم کا کالا گنا بھی ہوتا ہے، جس کا چھلکا کم سخت ہوتا ہے، وہ چوسنے ہی کے مصرف کا ہے۔ رس نکالنے کے مطلب کا نہیں۔ اس قسم کے گنے کا مول تول کھیت پر نہیں ہوتا۔ باقی قسم کے گنوں سے گڑ بنتا ہے جو مصری سے سستا ہوتا ہے اور جس سے بُورا بنتا ہے۔ اِس میں مٹھاس کم ہوتی ہے۔ اور دیکھنے میں سفید میدا سا معلوم ہوتا ہے۔ دہلی کی نواح میں چاول بھی ملتے ہیں اور وہاں شلجم، گاجر، کدو، بینگن، ہلیون[۱]، سونٹھ، کی بھی پیداوار ہے۔ سونٹھ جب سبز ہوتی ہے تو لوگ اسے گاجر کی طرح پکاتے ہیں۔ مزے میں لاجواب ہوتی ہے۔ وہاں چقندر بھی ہوتا ہے۔ سیم کی پھلیاں بھی اور پودینہ بھی اور قسم قسم کے پھول بھی جیسے گلاب، نیلوفر، بنفشہ، بید سادہ، نرگس اور گل مہندی ...... روغن زیتون وہاں نہیں پیدا ہوتا، باہر سے آتا ہے۔ شہد کثرت سے پایا جاتا ہے۔ شمعیں صرف بادشاہ کے محل میں جلتی ہیں۔ ہر شخص ان کو آسانی سے حاصل نہیں کر سکتا۔

جانور اور پرندے

چرنے والے جانور جیسے گائیں، بھینسیں، بھیڑیں، بکریاں بے شمار ہیں اور پرندے

---

[۱] ایک گھاس کا نام ہے۔ جس کا بیج دوا میں پڑتا ہے فارسی میں اسے مارچوبہ کہتے ہیں۔

مثلاً مرغ اور کبوتر بھی بڑی کثرت سے ہیں، سوائے بطخ کے جو کم پائی جاتی ہے۔ بہت سی قسم کے پرندے تو ایسے ہیں جنھیں کوئی مفت بھی نہیں پوچھتا۔ ہندی مرغ بڑے جثے کا پرندہ ہے۔ اور اپنے بڑے جثے کے سبب بطخ کے مانند معلوم ہوتا ہے۔ یہ سب پرند بہت سستے بکتے ہیں۔ ان کے علاوہ ابن بطوطہ سقنقور اور گینڈے کا بھی ذکر کیا ہے۔ اُس نے لکھا ہے کہ "سیوستان یعنی سیہوان کے باشندے سقنقور یا ریگ ماہی کھاتے ہیں۔ یہ جانور پیروں پر چلتا ہے اور گوہ کے مشابہ ہوتا ہے لیکن اس کے دم نہیں ہوتی۔ وہاں کے لوگ ریت سے کھود کر اسے نکالتے ہیں اور اس کا پیٹ چیر کر صاف کرکے اس میں بجائے زعفران کے ہلدی بھر دیتے ہیں۔ مجھے اس جانور کو دیکھ کر گھن آگئی اور میں نے اسے نہیں کھایا" اس نے ہندوستان کے جنگلوں میں کئی مرتبہ گینڈے دیکھے۔ پہلی مرتبہ دریائے سندھ کے قریب ایک بانس کے جنگل میں دیکھا۔ دوسری مرتبہ اس وقت دیکھا جب کہ وہ بادشاہ کی سواری کے ساتھ کسی اور بانس کے جنگل میں چلا جا رہا تھا۔ بادشاہ ہاتھی پر سوار تھا اور ابن بطوطہ بھی ہاتھی پر سوار تھا۔

ہاتھی اور گھوڑے

سفرنامے میں ہاتھیوں اور گھوڑوں کا بھی ذکر ہے مگر اس بارے میں مسالک الابصار میں جو کچھ لکھا ہے وہ بہتر ہے۔ اس میں شیخ مبارک کی زبانی لکھا ہے "کہ سلطان محمد ہر سال چار ہزار داغ لگائے ہوئے عربی گھوڑے تقسیم کرتا ہے جن میں کچھ تو مع زین اور مع لگام کے ہوتے ہیں اور کچھ بغیر زین اور بغیر لگام کے۔ جو گھوڑے مع زین اور مع لگام کے دئے ہیں ان میں اکثر صرف زین پہنے ہوتے ہیں۔ بعض زیور سے بھی آراستہ ہوتے ہیں۔ بعض کے زین پوشوں پر سونے کا کام کیا ہوا ہوتا ہے اور بعض زین پوش پر چاندی کا۔ تاتاری گھوڑوں کا جنھیں بادشاہ تقسیم کر دیتا ہے کوئی

حساب ہی نہیں۔ ان کی ٹکڑیاں کی ٹکڑیاں دے دی جاتی ہیں، یا سیکڑے کے سیکڑے بخشش دیئے جاتے ہیں۔ گھوڑے ہندوستان میں بکثرت ہیں اور باہر سے بھی بڑی تعداد میں آتے ہیں، پھر بھی بادشاہ ملکوں ملکوں سے بڑی قیمتیں دے دے کر انھیں منگواتا ہے اور بطور عطیہ و تحفے کے دے ڈالتا ہے۔ گھوڑوں کا نرخ ہندوستان میں چڑھا ہوا ہے اور گھوڑوں کی تجارت کرنے والے خوب روپیہ کما لیتے ہیں۔"

"مسالک الابصار" میں شیخ مبارک ہی کی زبانی ایک اور مقام پر یہ لکھا ہے "کہ یوں تو گھوڑے بہت قسم کے پائے جاتے ہیں۔۔۔۔۔ مگر جن گھوڑوں کی عادتیں اچھی ہوتی ہیں جن کے کرتب قابل تعریف ہوتے ہیں وہی سب سے اعلیٰ اور اچھے سمجھے جاتے ہیں۔ ایسے گھوڑے ہندوستان میں ترکستان کے ان تمام علاقوں سے لائے جاتے ہیں جو ہندوستان کے آس پاس ہیں۔ عربی گھوڑے ہندوستان میں بحرین سے، یمن سے اور عراق سے لائے جاتے ہیں۔ اگرچہ ہندوستان کے اندر بھی بڑے قیمتی قیمتی اور اچھی نسل والے عربی گھوڑے پائے جاتے ہیں۔ مگر بہت کم اور جب کبھی ہندوستان میں عربی گھوڑوں کو رہتے ہوئے بہت زمانہ گزر جاتا ہے تو ان کی نسل میں خلل آجاتا ہے۔ ـــ بیل کی ناک میں چھید کر کے نکیل ڈال دیتے ہیں اور پھر اس پر لادنا شروع کرتے ہیں۔ بیل چوڑے چوڑے قدم رکھتا ہے، اور جلدی جلدی چلتا ہے۔

بحرین کے ایک امیر علی بن منصور عقیلی کی زبانی شہاب الدین احمد عباس نے یہ سنا کہ ہندوستانیوں نے اچھے گھوڑوں کی ایک خاص پہچان مقرر کر رکھی ہے، اسی پہچان سے گھوڑوں کو پسند کرتے ہیں، اور جس قیمت کا ملتا ہے خرید لیتے ہیں۔"

"مسالک الابصار" سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں عام سواری کا جانور گھوڑا ہی ہے۔ سواری کے وقت عام لوگ اس پر جھول ڈال لیتے ہیں، اور خاص لوگ

اس کو چاندی کے زیور پہناتے ہیں۔ ہاتھی کی سواری بادشاہ کے لیے مخصوص ہے۔
شیخ مبارک کا اندازہ ہے کہ شاہی ہاتھیوں کی فوج میں کم و بیش تین ہزار ہاتھی ہوں گے جن کے لیے ایک صوبہ کی آمدنی بھی کافی نہیں ہوتی۔ جب "مسالک الابصار" کے مولف نے مصارف کی ٹھیک ٹھیک رقم دریافت کی تو شیخ نے کہا " بات یہ ہے کہ ان ہاتھیوں کی جنسیں مختلف ہیں، شکلیں مختلف ہیں اور اسی طرح سے ان کی خوراکیں بھی مختلف ہیں۔ ایک ہاتھی ایک دن میں بیس سیر چاول تیس سیر جو اور دس سیر گھی اور آدھا گٹھر گھاس کھا لیتا ہے۔ اپنی غذا ملنے پر ہاتھی بھاری بوجھ اٹھانے اور بڑے بڑے کام کرنے کے قابل ہو جاتا ہے "

ہندوستان کی دولت اور خزانے

"مسالک الابصار" کے راوی ہندوستان کی دولت کو اور سلطان محمد کی بخششوں کو دیکھ دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے۔ ایک نے لکھا ہے "کہ سلطان محمد اس قدر خرچ کرتا ہے مگر اس کے ملک کی آدھی آمدنی بھی صرف نہیں ہوتی۔ اسی راوی نے لکھا ہے کہ سلطان محمد کے باپ نے کوئی ریاست فتح کی تھی جس کے ذریعہ اس قدر سونا ہاتھ لگا تھا کہ تیرہ ہزار بیلوں پر لاد کر لایا گیا تھا "

شیخ برہان الدین ابو بکر بن کلہ محمد بزمی صوفی کا بیان ہے کہ " سلطان محمد بن تغلق نے ایک مرتبہ دیوگڑھ کے قریب کسی شہر پر دھاوا کرنے کی غرض سے لشکر بھیجا۔ دیوگڑھ میں ہندو رہتے ہیں اور وہاں کے حاکم رائے کہلاتے ہیں۔ جب اس علاقے کا راجہ شاہی لشکر کے مقابلے سے عاجز ہو گیا تو اس نے بادشاہ کی خدمت میں یہ کہلا بھیجا " اگر بادشاہ مجھے امن سے رہنے دے اور میرا علاقہ چھوڑ کر اپنے پایۂ تخت کو واپس چلا جائے تو جتنی دولت وہ مجھ سے چاہے میں اس کے پایۂ تخت تک بھیج دینے کو تیار ہوں۔ میرے پاس بادشاہ صرف بار برداری کے جانور بھیج دے ان پر خزانہ

لاد کر میں اس کے ملک میں روانہ کردوں گا۔" جب بادشاہ کو یہ معلوم ہوا تو اس نے حکم دیا کہ لڑائی بند کردی جائے اور راجہ کو صحیح سالم ہمارے دربار میں لایا جائے۔ جب راجہ بادشاہ کی خدمت میں آیا تو بادشاہ نے اس کا بڑا احترام کیا اور کہا "یہ تو بتاؤ کتنا روپیہ جانوروں پر لاد کر تم میرے پاس بھیج سکتے ہو؟" رائے نے جواب دیا۔ "مجھ سے پہلے اس گدی پر سات راجہ اور بیٹھ چکے ہیں، اور ان میں سے ہر ایک نے ایک خزانہ چھوڑا ہے۔ ہر خزانہ ستر ببین ؎ کا ہے اور یہ سب خزانے اب تک میرے پاس محفوظ ہیں۔" یہ سن کر بادشاہ خوش ہوا اور اس نے حکم دیا کہ ان سب خزانوں پر شاہی مہر لگادی جائے۔ پھر اس نے راجہ سے کہا تم دہلی چل کر رہو اور اس علاقے میں اپنے نائب اور والی مقرر کردو۔ اور بہتر یہ ہے کہ اسلام بھی قبول کرلو۔ راجہ نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا تو بادشاہ نے اس کو اپنے قدیم مذہب پر رہنے کی اجازت دے دی۔ راجہ نے اپنے علاقے کے انتظام کے لیے حاکم مقرر کردیے۔ اور خود بادشاہ کے ساتھ چلا گیا اور اس کے دربار میں رہنے لگا۔ بادشاہ نے راجہ کے لیے ایک معقول رقم مقرر کردی اور اس کے علاقے اپنی سلطنت میں شامل کرلیے۔ چوں کہ اب راجہ کے (علاقے کے) آدمی بادشاہ ہی کی رعایا بن گئے تھے اس لیے بادشاہ نے بہت سی رقم ان کے درمیان تقسیم کیے جانے کی غرض سے وہاں بھیج دی، مگر بادشاہ نے ببین میں سے یعنی راجہ کے خزانوں میں سے کچھ صرف نہیں کیا۔ ان سب کو شاہی مہریں لگا کر چھوڑ دیا۔

ہندوستانیوں کے اخلاق اور عادتیں

"مسالک الابصار" میں لکھا ہے کہ "ہندوستان کے باشندے نہایت تیز عقل مند

؎ ببین سے ایک بڑا حوض مراد ہے جس کے اندر اترنے کے لیے چاروں کونوں پر سیڑھیاں بنی ہوتی ہیں۔

اور ہنر مند ہیں، اور سب قوموں کے مقابلے میں اپنے نفسوں پر زیادہ قدرت رکھتے ہیں، اور اپنے معبودوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے سب سے زیادہ قربانیاں کرتے ہیں۔ محمد بن عبدالرحیم قلنیشی غرناطی نے "تحفتہ الباب" میں لکھا ہے کہ ہندوستانی علوم و فنون کے اعتبار سے دنیا بھر میں سب سے زیادہ ماہر ہیں۔ طب میں بھی ریاضی میں بھی اور طرح طرح کی صنعتوں اور کاریگریوں میں بھی۔"

ابو صفا عمر شبلی کا بیان ہے کہ ہندوستانی خوب ہیں وہ نہ شراب پیتے ہیں نہ اور کسی نشیلی چیز کا استعمال کرتے ہیں۔ وہ تو پان ہی کھا کھا کر اپنا جی خوش کر لیتے ہیں۔ اور پان ہے بھی عمدہ چیز اور حلال بھی ہے۔ اس میں حرام کا کوئی شبہ تک نہیں۔ پھر لطف یہ کہ پان کے اندر بہت سے مصالحے پڑتے ہیں جو بہت ہی مزے کے ہوتے ہیں۔ شراب میں تو ایسے ذائقے کی ایک چیز بھی نہیں ہوتی۔ علاوہ ذائقے دار مصالحوں کے پان میں اور چند خوبیاں ہیں۔ اول تو اس کے کھانے سے منہ میں خوشبو پیدا ہوتی ہے۔ دوسرے کھانا جلد ہضم ہوتا ہے۔ تیسرے سانس کی آمد و رفت میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔ دل کو فرحت ہوتی ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ پان کے کھانے سے نہ عقل بگڑتی ہے نہ ذہن خراب ہوتا ہے نہ کھانوں کا مزا زائل ہوتا ہے۔"

پان میں چھالیہ ڈال کر خاص طور سے اس کی گلوریاں بنائی جاتی ہیں۔ خاطر تواضع کے موقعوں پر ہندوستان میں پان سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں سمجھی جاتی۔ یہاں تک کہ مہمان کی خاطر میں۔ کھانے پینے کی کل نعمتیں مٹھائیاں، شربت، پھول اور خوشبوئیں وغیرہ غرض دنیا کی کل اچھی اچھی چیزیں موجود کر دی جائیں مگر پان نہ دیا جائے تو ایسی مہمانی ؛ ذکر اور قابل قدر نہیں سمجھی جاتی اور مہمان بھی یہ سمجھتا ہے کہ میری کچھ عزت ہی نہیں کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے رئیس اپنی محفلوں میں جب کسی کو سرفراز کرنا چاہتے ہیں تو اس کو اپنے ہاتھ سے پان دیتے ہیں۔

ولایت میں شراب یا کھجور جس کا یہ دستور تھا کہ رئیس اپنے اپنے دیوان خانوں میں پیالوں کے اندر شراب یا کھجور بھروا کر رکھ لیتے تھے۔ جس کسی کی عزت

بڑھائی جانی منظور ہوتی تھی اس کے سامنے شراب کا یا کھجور کا پیالہ پیش کر دیتے تھے۔ رئیسوں کے علاوہ معمولی درجہ کے آدمیوں میں بھی یہی رسم تھی اور چھوٹے بڑے سب اسی قسم کی خاطرداری کو انتہا درجے کی خاطر تواضع سمجھتے تھے۔"

جب ابن بطوطہ سلطان محمد کے محل میں پہنچا اور وہاں اس کی خاطر تواضع ہوئی تو اور بہت سی کھانے پینے کی چیزوں کے ساتھ ہزار پان آئے اور بہت سی چھالیاں آئیں۔

جب وہ دولت آباد سے چل کر احاطۂ بمبئی میں مالا بار میں پہنچا تو وہاں اُس نے برہمن اور کھتری ذات کے ہندوؤں کو دیکھا۔ سفرنامہ میں لکھا ہے کہ "مالا بار کے باشندے اکثر مرہٹے ہیں دستکاری میں مشہور ہیں۔ وہ طبیب اور منجم بھی ہیں۔ اچھا علم اور بڑی واقفیت رکھتے ہیں۔ شریف مرہٹے، برہمن اور کھتری ہوتے ہیں۔ چاول، سبزی اور سرسوں کا تیل ان کی غذا ہے۔ گوشت بالکل نہیں کھاتے۔ کسی حیوان کو تکلیف نہیں دیتے۔ کھانے سے پہلے اسی طرح غسل کرنا لازمی سمجھتے ہیں جس طرح مسلمان خلوت کے بعد۔ اپنے قریبی رشتہ داروں میں جب تک کہ سات پشتوں کا فرق نہ ہو جائے شادی بیاہ نہیں کرتے۔ شراب پینا سخت عیب سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی مسلمان شراب پی لیتا ہے تو اس کے اسّی کوڑے لگائے جاتے ہیں اور تین دن تک ایک تہ خانے میں قید کر دیا جاتا ہے، جسے سوائے کھانے کے وقت کے کبھی نہیں کھولتے۔"

"مسالک الابصار" کے مولف شہاب الدین احمد عباس نے ابو صفا عمر ابن شبلی کی زبانی دہلی والوں کے ذکر میں لکھا ہے کہ "وہ لوگ تیز اور عقل مند ہوتے ہیں۔ فارسی اور ہندی زبانیں خوب بولتے ہیں۔ ان کی عقلیں روشن اور ذہن صاف ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر فارسی اور ہندی زبانوں میں شعر بھی کہتے ہیں۔ اور بعض عربی میں بھی شعر کہہ لیتے ہیں۔۔۔ اور اچھے شعر کہتے ہیں۔ بہتیرے ایسے ہیں جو بادشاہ کے وظیفہ خوار نہیں ہیں، پھر بھی بادشاہ کی مدح میں وہ شعر کہتے ہیں۔ بادشاہ ان سے خوش ہوتا ہے اور

انھیں انعام دیتا ہے"

شیخ مبارک کا بیان ہے کہ "ہندوستان میں تلوار، کمان، نیزے اور قسم قسم کے ہتھیار بنانے والے بھی ہیں۔ زرہ اور زین بنانے والے بھی اور ان سب کے علاوہ مختلف قسم کے کام کرنے والے مرد بھی ہیں، اور عورتیں بھی صاحب شمشیر بھی ہیں اور صاحب قلم بھی"

ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ "ہندوستان میں ہندو تمام ملک میں مسلمانوں سے ملے جلے رہتے ہیں۔۔۔۔۔ بہت سے ہندو دشوار گزار پہاڑوں اور بانسوں کے جنگلوں میں حفاظت کی جگہ دیکھ کر رہتے ہیں۔ بانس فصیل کا کام دیتے ہیں۔ اس کے اندر اُن کے مویشی اور کھیت ہوتے ہیں۔ اور بارش کا پانی جمع کیا ہوا ہوتا ہے"

ہندو دولت مند ہیں اور انھیں روپیہ جمع کرنیکی عادت ہے

"مسالک الابصار" کے ایک راوی کا بیان ہے کہ "ہندوؤں کو روپیہ پیدا کرنے اور جمع کرنے کا شوق ہے۔ جب وہ آپس میں ملتے ہیں تو ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں "کہو تم نے کتنی روکڑ اکھٹی کر لی" کوئی کہتا ہے کہ میرے گھرانے میں میرے دادا کے وقت سے روپیہ جمع ہو رہا ہے اور میں روپیہ جمع کرنے والوں کی دوسری پشت میں ہوں۔ اور کوئی کہتا ہے کہ "میرے خاندان میں میرے پردادا کے وقت سے روپیہ جمع ہوتا چلا آیا ہے اور میں روپیہ جمع کرنے والوں کی تیسری پشت میں ہوں۔ جو روپیہ کئی پشتوں سے جمع ہوتا آرہا ہے اس کا شمار کیا بتاؤں" ہندوؤں کی عادت ہے کہ روپیہ جمع کرنے کی غرض سے اپنے گھروں میں گڑھا کھود لیتے ہیں۔ دیواروں میں موکھے سے بنا لیتے ہیں جن کا منہ بند کر دیتے ہیں، بس ایک چھوٹا سا سوراخ کھلا رہنے دیتے ہیں جس کے ذریعے اس میں روپیہ ڈال تو سکیں مگر نکالنا ممکن نہ ہو۔ اور لین دین کے وقت وہ بڑی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ اس خوف سے کہ

کہیں کھوٹا مال نہ آجائے۔ وہ نہ تو چاندی سونے کی بنی ہوئی چیز لیتے ہیں اور نہ ٹکڑے لیتے ہیں تو چاندی سونے کے سکے لیتے ہیں۔ ہندوؤں کی بعض بستیوں میں یہ دستور ہے کہ جب کسی گھر میں اشرفیوں کی ایک دیگ بھر جاتی ہے تو گھر کا مالک چھت کے اوپر ایک جھنڈا گاڑ دیتا ہے۔ اس طرح سے دس دس جھنڈیاں تک گڑ جاتی ہیں۔ بعض مکانوں کی چھتوں پر دس سے بھی زیادہ جھنڈیاں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔"

غلام

"مسالک الابصار" کے مصنف شہاب الدین احمد عباس نے لکھا ہے کہ "سلطان محمد جنگ سے اس قدر قیدی گرفتار کر کے لاتا ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ دہلی میں ہزاروں عمدہ عمدہ غلام سستی قیمت پر نہ بکتے ہوں۔ مجھ سے راویوں نے بھی بیان کیا کہ خدمت کرنے والی لونڈی کی قیمت دہلی شہر میں آٹھ ٹنکے سے زیادہ نہیں ہے اور جو لونڈیاں خانہ داری کے مطلب کی ہوتی ہیں ان کی قیمت پندرہ ٹنکے۔ اور بعض کی بیس ٹنکے یا اس سے بھی کچھ زیادہ ہوتی ہے۔" لیکن حافظ ابن تاج ملتانی نے راوی پر اعتراض کیا اور کہا کہ جب ہندی لونڈیوں کی قیمت اتنی زیادہ ہے تو پھر وہ سستی کہاں سے ہوئیں؟ راوی نے جواب دیا کہ ان کی خوب صورتی کی وجہ سے اور بھلی عادتوں کے سبب ہر شخص خریدنے کے لیے ان پر گرتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ میں ہی خرید لوں۔ اس سبب ان کا بھاؤ تیز ہو جاتا ہے۔ ان لونڈیوں میں یہ بھی خوبی ہوتی ہے کہ اکثر پڑھی لکھی اور قرآن کی حافظ ہوتی ہیں اور مذہب سے بھی واقف ہوتی ہیں اور حدیث سے بھی سینکڑوں شعر انھیں حفظ یاد ہوتے ہیں۔ اور حاضر جوابی ان کی نوک زبان ہوتی ہیں۔ وہ گانے بجانے میں یکتا ہوتی ہیں۔ اور شطرنج اور چوسر خوب کھیلتی ہیں۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ جب آپس میں اپنے ہنر بیان کرتی ہیں تو

ایک کہتی ہے "میں تین دن میں اپنے مالک کے دل کو مٹھی میں لے لوں" دوسری کہتی ہے "واہ یہ بھی کوئی بڑی بات ہے۔ بہن — میں تو دو ہی دن میں اُس کے دل میں گھر کر لوں" تیسری کہتی ہے "اجی۔ تمہاری بات بھی کچھ نہیں۔ میں تو گھڑی بھر میں اس کے دل پر قبضہ کر لوں" چوتھی کہتی ہے۔ "واہ بھینا، یہ بھی کیا کمال ہوا! مجھے تو اپنے مالک کے دل پر قابو کرنے میں بس اتنی دیر لگے جتنی کہ پلک جھپکانے میں لگتی ہے"

ابن بطوطہ نے لونڈیوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے "مسالک الابصار" کی تائید ہوتی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ جو لونڈیاں لوٹ میں آتی ہیں وہ ہندوستان میں بہت سستی ملتی ہیں۔ کیوں کہ وہ صاف ستھری نہیں ہوتیں۔ تہذیب سے واقف نہیں ہوتیں۔ مگر یہاں سیکھی سکھائی لونڈیاں بھی سستی ہوتی ہیں اس لیے لوٹ کی لونڈیوں کو کوئی نہیں خریدتا۔

ہندو عورتیں

"مسالک الابصار" میں لکھا ہے کہ عام طور سے ہندوستان کی عورتوں کو ترکی اور قبچاقی عورتوں کی نسبت زیادہ حسین اور ملیح بتایا جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ حسن و ملاحت کے علاوہ بعض خوبیاں ہندی عورتوں میں ایسی ہیں جو کسی اور ملک کی عورتوں میں نہیں پائی جاتیں۔ ہندوستان کی اکثر عورتیں سبزہ رنگ ہوتی ہیں اور بعض گورے رنگ کی ہوتی ہیں۔ اُن کے گورے رنگ میں سرخی جھلکا کرتی ہے۔ اور باوجودیکہ لوگوں کے پاس ترکی، قبچاقی، رومی اور ہر صنف کی عورتیں موجود ہیں مگر ان میں سے کوئی حسن و خوبی میں ہندی عورت کو نہیں پہنچتی۔ میرے خیال میں دنیا کے کسی خطے کی عورت ہندی عورت کے مقابلے میں بڑھ نہیں سکتی، اور بڑھ سکتی ہے تو ہندی عورت سے کوئی ہندوستان ہی کی عورت بڑھ سکتی ہے۔ یہ عورتیں تمام دنیا کی

عورتوں سے صرف حسن و حلاوت ہی میں بڑھی ہوئی نہیں ہیں بلکہ ان میں اور بے شمار خوبیاں ہیں جن کے لیے تحریر کے دامن میں گنجائش نہیں۔

ستی

ہندوستان میں داخل ہونے کے بعد ابن بطوطہ ملتان سے اجودھن ہوتا ہوا سرستی اور ہانسی کی طرف جا رہا تھا راستے میں اس نے ایک عورت کے ستی ہونے کی خبر سنی۔ اس کا بیان ہے کہ "ایک" دو دفعہ میں نے دیکھا کہ ایک ہندو عورت بناؤ سنگار کیے ہوئے گھوڑے پر چڑھی چلی جاتی تھی۔ ہندو مسلمان اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ آگے آگے نوبت بجتی جاتی تھی۔ برہمن لوگ بھی ساتھ ساتھ تھے۔ ——— ایسا اتفاق ہوا کہ میں ابوہر میں تھا ابوہر کے اکثر باشندے ہندو ہیں۔ اس کا حاکم سامرہ قوم کا مسلمان تھا۔ ابوہر کے نواح میں نافرمان ہندو رہتے تھے ایک دفعہ انھوں نے رہزنی کی۔ ابوہر کا حاکم ہندو مسلمانوں کے ایک دستے کو ساتھ لے کر ان سے لڑنے کو گیا۔ بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ بادشاہ کی فوج کے ساتھ ہندو مارے گئے۔ ان میں سے تین کی عورتیں تھیں۔ عورتوں نے ستی ہونے کا ارادہ کیا ستی ہونے سے تین دن پہلے وہ گانے بجانے اور کھانے پینے میں مشغول ہو گئیں۔ ان کے پاس ہر طرف سے عورتیں آنے لگیں اور ان سے مل مل کر رخصت ہونے لگیں۔ چوتھے دن صبح کو ان کے پاس گھوڑے لائے گئے۔ ہر ایک بیوہ بناؤ سنگار کر کے اور خوشبوئیں لگا کر گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ناریل تھا جس کو اچھالتی چلی جاتی تھی اور بائیں ہاتھ میں آئینہ تھا جس میں منہ دیکھتی جاتی تھی۔ برہمن اس کے ارد گرد جمع تھے اس کے رشتے دار اس کے ساتھ تھے آگے آگے نقارے بجتے جاتے تھے ہر ایک ہندو آگے بڑھ بڑھ کر اس سے کہتا تھا کہ "میرا سلام میرے ماں باپ کو، اور فلاں فلاں دوست کو کہنا۔ وہ کہتی تھی "اچھا" اور ہنستی جاتی

تھی۔ میں بھی اپنے دوستوں کو لے کر اسی طرف چلا۔ تین کوس نکل گئے تو ایک ایسی جگہ آئی جہاں بیچ میں چار گنبد تھے۔ ہر گنبد میں ایک ایک بت رکھا تھا۔ گنبدوں کے بیچ میں پانی کا حوض تھا جس پر درختوں کے سایہ کے سبب دھوپ نہ پڑتی تھی۔۔۔ جب یہ عورتیں ان گنبدوں کے پاس پہنچیں تو حوض میں اتر کر انھوں نے غسل کیا اور غوطہ لگایا اور اپنے کپڑے اور زیور اتار کر علیحدہ رکھ دیے۔ صرف ایک موٹی ساڑی باندھ لی۔ اس وقت حوض کے پاس نشیب میں آگ دہکا دی گئی جس پر سرسوں کا تیل ڈال دیا گیا شعلے اٹھنے لگے۔ پندرہ ایک آدمی لکڑی کے بندھے ہوئے گٹھے لیے ہوئے تھے اور دس ایک آدمی لکڑیوں کے بڑے بڑے کندے تھامے کھڑے تھے۔ نقارے اور نفیری والے بیوہ کے انتظار میں تھے۔ آگ کو ایک چادر کے اوٹ میں کر لیا گیا تھا تاکہ ان عورتوں کی نظر نہ پڑے۔ ایک عورت نے بڑھ کر زبردستی چادر کو چھین لیا۔ کہنے لگی، کیا میں جانتی نہیں کہ یہ آگ ہے مجھے ڈراتے ہو! پھر اس نے آگ کو ڈنڈوت کی اور بھڑکتے ہوئے شعلوں کے اندر جا پڑی۔ عورت کا آگ میں گرنا تھا کہ نقاروں کا شور اٹھا اور نفریاں بجنے لگیں۔ لوگوں نے پتلی لکڑیاں جو ہاتھوں میں لیے کھڑے تھے آگ میں ڈالنی شروع کیں اور اوپر سے بڑے بڑے کندے ڈال دیے تاکہ وہ عورت ہل بھی نہ سکے۔ دیکھنے والے چیخ اٹھے میں عورت کو جلتے ہوئے نہ دیکھ سکا۔ بے ہوش ہو گیا۔ گھوڑے پر سے گرنے کو تھا کہ مجھے میرے دوستوں نے سنبھال لیا۔۔۔۔"

غمی کی رسمیں

ابن بطوطہ کو دہلی میں آئے ڈیڑھ مہینہ گزرا تھا کہ ایک بچی کا انتقال ہو گیا اس کے کفن دفن کا بڑا اہتمام کیا گیا۔ بادشاہ اس وقت دارالخلافے میں نہ تھا۔ وزیر کو خبر ہوئی تو پہلے تو اس نے پالم دروازے کے باہر ایک خانقاہ میں قبر کی جگہ تجویز کی اور اس کے بعد بادشاہ

کو لکھا۔ بادشاہ کا جواب دوسرے دن شام کو آگیا۔ سفرنامے میں لکھا ہے کہ "ہندوستان میں تیسرے دن صبح ہوتے ہی میت کی قبر پر جاتے ۔ اور قبر کی اِرد گرد ریشمی کپڑے اور گدے بچھاتے ہیں اور قبر پر پھول رکھتے ہیں ..... نارنج اور لیموں کی ٹہنیاں بھی مع پھلوں کے قبر پر رکھتے ہیں۔ اگر ان میں پھل موجود نہ ہوں تو دھاگے کے ذریعے سے میووں کے دانے اُن میں لگا دیتے ہیں۔ لوگ اپنے اپنے قرآن مجید کی جلدیں لے جاتے ہیں اور قبر کے گرد بیٹھ کر پڑھتے ہیں۔ جب قرآن خوانی ہو چکتی ہے تو شربت پلایا جاتا ہے ۔ گلاب لاان پر چھڑکا بھی جاتا ہے۔ پھر انھیں پان دے جاتے ہیں۔"

شادی کی رسمیں

سفرنامے میں شادی کا یہ دستور لکھا ہے کہ "جس مکان سے دولہا دلہن کو اپنے گھر لاتا ہے اس مکان کے دروازے پر دلہن کی جماعت کھڑی ہو جاتی ہے جب دولہا کی جماعت آتی ہے تو دلہن والے دولہا والوں کو داخل ہونے سے روکتے ہیں۔ اگر دولہا والے غالب آجاتے ہیں تو چلے جاتے ہیں اگر مغلوب ہو جاتے ہیں تو انھیں ہزاروں روپے دینے پڑتے ہیں۔ دولہا کے سر پر سہرا باندھا جاتا ہے۔ جب دولہا والے برات لے کر دلہن کے مکان میں داخل ہو جاتے ہیں تو دولہا اور دلہن دونوں کو ایک مقام پر لاکر بٹھا دیا جاتا ہے۔ وہاں عورتوں کا مجمع ہوتا ہے۔ گانے والی عورتیں بھی بیٹھی ہوتی ہیں۔ اس وقت دلہن اپنے ہاتھ سے دولہا کو پان دیتی ہے، اور دولہا کے عزیزوں پر سے روپے پیسے لٹائے جاتے ہیں۔ عورتیں اللہ اکبر کے نعرے لگاتی جاتی ہیں اور گاتی بھی جاتی ہیں۔ باہر نقارے بجتے رہتے ہیں۔ پھر دولہا دلہن کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور دلہن دولہا کے پیچھے پیچھے ہو لیتی ہے۔ دولہا گھوڑے پر سوار ہو جاتا ہے اور دلہن ڈولے میں بیٹھ جاتی ہے۔ اس وقت ان دونوں پر سے روپے پیسے نچھاور

کیے جاتے ہیں۔ براتی کچھ تو گھوڑوں پر ہوتے ہیں اور کچھ پیدل۔ جس امیر کے دروازے سے برات گزرتی ہے وہی باہر نکل کر اس پر سے سکے نچھاور کرتا ہے دوسرے دن دلہن کے گھر سے دولہا کے دوستوں کے گھر کپڑے مع کچھ نقدی کے بھیجے جاتے ہیں۔ دعوت ہوتی ہے۔" یہ طریقے ابن بطوطہ نے محل سرا کی ایک شادی میں دیکھے۔ عام شادیوں میں بھی کم و بیش ایسی ہی رسمیں ہونگی ۔

پردہ

سفر نامے سے ظاہر ہوتا ہے کہ پردہ اکثر ہندوؤں اور بعض مسلمانوں میں نہ تھا۔ اس بات کی تائید پدماوت سے۔ فتوحات فیروز شاہی سے۔ اور تاریخ فرشتہ سے ہوتی ہے۔ محل سرا کی جس برات میں ابن بطوطہ شریک ہوا اس میں دولہا دلہن کی سواری کے ساتھ عورتیں بھی براتیوں میں شامل تھیں۔ بعض تو گھوڑوں پر بیٹھی جا رہی تھیں اور بعض پیدل چل رہی تھیں۔ برات ہر ایک امیر کے دروازے پر رک رک جاتی تھی اور گھر کا مالک باہر نکل کر برات پر — نچھاور کرتا تھا۔
دوسرے مقام پر ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ "اس ملک میں عورتیں ڈولیوں میں آتی جاتی ہیں۔" ابن بطوطہ نے ڈولی کا جو حلیہ لکھا ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں پالکیوں کا رواج تھا۔ جس میں بعض وقت مرد بھی بیٹھ جاتے تھے اور جسے آٹھ آدمی مل کر اٹھاتے تھے۔ آج کل کی ڈولی جسے دو ہی آدمی اٹھا لیں اُن دنوں معدوم تھی —— معلوم ہوتا ہے کہ عام عورتیں بازار میں پیدل چلتی تھیں۔ پالکیوں میں صرف حاکموں، رئیسوں اور امیروں کی بیگمات وغیرہ رہتی تھیں۔

پوشاک

مسالک الابصار میں لکھا ہے کہ ہندوستان کے باشندوں کا پہناوا زیادہ تر سفید لباس ہے۔ رنگین اور اونی کپڑے جیسے بانات، مخمل، شال وغیرہ باہر سے لائے جاتے ہیں اور یہاں چوگنی پچگنی قیمت پر بکتے ہیں۔ علماء، اولیا، اور درویش زیادہ تو اونی کپڑے پہنتے ہیں۔ اور بادشاہ، خان، مُلک اور فوج کے سب افسر سرے پاؤں تک تاتاری کپڑے پہنتے ہیں۔ اُن کے بدنوں پر اسلامی طریقے اور خوارزمی فیشن کی قبائیں ہوتی ہیں جو کمر پر سے تنگ ہوتی ہیں۔ ان کے سروں پر پانچ چھ گز کپڑے کی پگڑیاں ہوتی ہیں جو اُن کے لمبے قدوں پر چھوٹی معلوم ہوتی ہیں۔ پگڑیوں کو عمامہ کہنا موزوں نہیں ہے۔ ناصرالدین محمد چشتی جو زمردی کے لقب سے مشہور ہے۔ اور جو دو مرتبہ ہندوستان آ جا چکا ہے اور سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے دربار میں رہ چکا ہے۔ کہتا تھا کہ ہند میں ہمہ شما تو عام طور سے سفید لباس پہنتے ہیں مگر خاص خاص لوگ افسر اور عہدے دار وغیرہ تاتاری ملکوں کے بنے ہوئے کپڑے پہنتے ہیں جن پر سنہری کام کیا ہوا ہوتا ہے۔ بعضوں کے لباس میں سب جگہ نہیں تو صرف آستینوں پر کام بنا ہوا ہوتا ہے۔ بعضوں کے لباس میں مغلوں کی طرح پیٹھ پر اور گلے کے چاروں طرف چوڑا چوڑا زردوزی کا کام ہوتا ہے۔ گلے پر جو کام کیا جاتا ہے سونا جواہرات سے سجایا جاتا ہے یاقوت اور ہیرے ٹانکے جاتے ہیں۔ اُن کے سر کے بالوں کی لٹیں آگے سے گندھی اور بٹی ہوئی لٹکتی رہتی ہیں۔ جس طرح سے کہ مصر کے سپاہیوں کا دستور ہے۔ بالوں کی لٹوں کو گندھا ہوا رکھنے کے لیے موباف کی طرح ریشمیں کپڑا استعمال کرتے ہیں اور اپنی کمروں میں سونے چاندی کی پیٹیاں لگاتے ہیں کوڑا باندھ لیتے ہیں یا تیر لٹکا لیتے ہیں، تلواریں تو کمر سے دور دراز سفر کے وقت باندھتے ہیں، گھر پر ہر وقت

تلوار باندھنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ فوجی عہدہ داروں ہی کی طرح ملکی اور مالی افسروں اور وزیروں اور منشیوں کا لباس ہوتا ہے۔ فرق اتنا ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنی کمر میں پیٹیاں نہیں لگاتے، فوجیوں کی شان پیٹیوں سے ہوتی ہے تو وزیروں اور منشیوں کا امتیاز اس رومال سے ہوتا ہے جس کو وہ صوفیوں کی طرح اپنی پگڑیوں پر باندھ لیتے ہیں۔ اس قسم کی بندش اور وضع کو شملہ کہتے ہیں۔ قاضی اور علماء لشکریوں کی طرح چست لباس پہنتے ہیں، زرہ بکتر لگائے رہتے ہیں، قاضیوں عالموں اور لشکریوں کے علاوہ عام لوگ بھی چست کپڑے پہنے اور زرہ بکتر لگائے دیکھے جاتے ہیں۔ تاریخ فیروز شاہی سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ عالموں اور لشکریوں کی طرح سے قبا اور دگلہ پہنتا تھا۔ قبا تو ایک قسم کا جُبّہ تھا یا گاؤن (GOWN) تھا جو اس وقت تک عالموں کی پوشاک ہے اور دگلہ ایک قسم کی چست عبا تھی جو اُس زمانے میں سپاہیوں کا پہناوا تھا۔

ہندوستان کے کھانے

مسالک الابصار میں تحریر ہے کہ ہندوستان میں دودھ گھی کی --- ایسی افراط ہے کہ کوئی انھیں مفت بھی نہیں پوچھتا اور ہندوستان کے بازاروں میں کھانے پینے کی چیزوں کی بہت دکانیں ہیں، جہاں قسم قسم کے کھانے موجود رہتے ہیں، جیسے شامی کباب اور سیخ کے کمباب، پلاؤ، قورمہ اور طرح طرح کے سالن اور پینسٹھ (۶۵) قسم کی مٹھائیاں اور طرح طرح کے شیرے جو دہلی کے سوا کہیں اور نہیں پائے جاتے۔

سلطان محمد کی قلمرو میں داخل ہونے کے بعد ابن بطوطہ ملتان پہنچا تو وہاں ایک مرتبہ وہ سرکاری ضیافت میں شریک ہوا۔ جو کھانے اس ضیافت میں اس نے دیکھے ان کا ذکر سفر نامے میں موجود ہے۔ مثلاً پتلی پتلی چپاتیاں۔ بڑے بڑے

بھنے گوشت کے ٹکڑے۔ پھر پوریاں یعنی گھی میں تلی ہوئی روٹیاں، خشتی یعنی میٹھی روٹی، قلیہ جو گھی اور پیاز اور ادرک ڈال کر بنایا جاتا ہے۔ سموسے جن سے مراد گھی میں تلی ہوئی پتلی پتلی لپیٹی ہوئی روٹیاں ہیں جن میں قیمہ، بادام، جائفل، پستے، پیاز اور گرم مصالحے جیسی بہت سی چیزیں بھری ہوئی تھیں۔۔۔۔

صنعتیں

شیخ مبارک کا بیان ہے کہ سلطان محمد نے کپڑا بننے کا کارخانہ جاری کر دیا ہے جس میں طرح طرح کے ریشمیں کپڑے بنے جاتے ہیں اور چار ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ اس کارخانے کا بنا ہوا کپڑا خلعت دینے پہننے اور تحفے دینے کے کام آتا ہے۔ اس کے علاوہ چین، عراق، اور اسکندریہ سے بھی کپڑا آتا ہے۔ بادشاہ ہر سال پورے دو لاکھ جوڑے تقسیم کرتا ہے۔ ایک لاکھ گرمیوں میں اور ایک لاکھ جاڑوں میں، گرمیوں میں جو تقسیم ہوتا ہے وہ زیادہ تر اسکندریہ کا بنا ہوا ہوتا ہے، اور اور جاڑوں میں جو تقسیم ہوتا ہے وہ سب ریشمیں ہوتا ہے۔ وہ دہلی کے کارخانے کا بنا ہوا ہوتا ہے۔ یا چین کا یا عراق کا، اس کے علاوہ خانقاہوں اور سرایوں میں بھی بادشاہ کی طرف سے کپڑا تقسیم کیا جاتا ہے۔

سلطان محمد نے زردوزی کا کارخانہ بھی جاری کر رکھا ہے، جس میں چار ہزار زردوز کام کرتے ہیں۔ زردوزی کام کیے ہوئے کپڑے بیگمات کے علاوہ رؤسا کے کام آتے ہیں، امرا کو خلعت دینے کے کام آتے ہیں اور ان کی بیبیوں کو بطور عطیے کے دئے جاتے ہیں۔

دہلی کے، مکان، باغ، بازار، کنوئیں، حوض، پل وغیرہ

دہلی کے مکان پتھر اور چونے کے بنے ہوئے ہیں ان کی چھتیں لکڑی کی ہیں۔ اور ان کے فرش سفید پتھر کے ہیں جو سنگ مرمر سے ملتا جلتا ہے اگرچہ خالص سنگ مرمر کا فرش سوائے شاہی محلّات کے اور کہیں نہیں ہے۔ مکان زیادہ تر دو منزلے ہیں، بعضے ایک منزل کے بھی ہیں۔ شیخ ابو بکر بن خلال نے مجھ سے کہا کہ یہ پرانی دہلی کے مکانات کا ذکر ہے، نئی دہلی اس کے علاوہ ہے۔ اصل میں اکیس(۲۱) شہروں کو دہلی کہتے ہیں اس کے تین طرف باغات ہیں جو سیدھی سیدھی قطار میں بارہ بارہ میل تک چلے گئے ہیں۔ چوتھی طرف پہاڑ کے نزدیک ہونے کی وجہ سے باغات نہیں ہیں۔ دہلی میں ایک ہزار مدرسے ہیں جن میں سے ایک مدرسہ شافعیوں کا ہے۔ باقی کل حنفیوں کے ہیں، اس کے علاوہ وہاں تقریباً ستر شفا خانے ہیں، محلّات ہیں جن میں معماری کی عجیب عجیب صنعتیں دکھائی گئی ہیں، بڑی بڑی خانقاہیں بھی ہیں، اور چوڑے چوڑے بازار بھی ہیں، حمام بھی ہیں سب لوگ کنوؤں کا پانی پیتے ہیں، کنوؤں کی گہرائی سات ہاتھ سے زیادہ نہیں ہے۔ ہر کنوئیں پر پیاؤ لگی ہوئی ہے۔ حوضوں کا پانی بھی جاتا ہے جن میں بارش کا پانی جمع ہو جاتا ہے۔ حوضوں پر ایک تیر کی اُڑان کے برابر یا اُس سے بھی زیادہ پل بنے ہوئے ہیں۔ دہلی میں ایک مشہور جامع مسجد بھی ہے جس کی بابت کہا جاتا ہے کہ روئے زمین پر کوئی مسجد اس کے برابر عالی شان نہیں، اس کی اونچائی چھ سو ہاتھ ہے۔

شاہی محل

شیخ مبارک کا بیان ہے کہ دہلی میں سلطان محمد کے محلّات اس کے اور اُس

کے حرم کے واسطے مخصوص ہیں اس کی بیگمات کے لیے اور کنیزوں اور ماماؤں کے واسطے الگ الگ مکان بنے ہیں۔ وہاں خانوں اور امیروں میں سے کوئی نہیں رہ سکتا، خان اور ملک بادشاہ کی خدمت میں دو مرتبہ یعنی صبح اور شام حاضر ہوتے ہیں اور سلام کر کے واپس چلے جاتے ہیں۔

دربار

صاحبِ مسالک الابصار نے لکھا ہے کہ سلطان محمد کے دربار میں بارہ سو طبیب ملازم ہیں اور دس ہزار بازدار جو سکھائے جاتے ہیں۔ اور تین ہزار آدمی شکار کو گھیر گھار کر لانے پر تعینات ہیں۔ پانچ سو بادشاہ کے ہم نشین ہیں۔ دو ہزار دو سو قوال ہیں۔ بادشاہ کے غلاموں میں سے بھی ایک ہزار قوال ہیں۔ جو قوالی سکھانے پر مامور ہیں۔ اور ایک ہزار شاعر مقرر ہیں جو نہایت قابل ہیں تینوں زبانوں میں یعنی عربی فارسی اور ہندی میں شعر کہتے ہیں۔ یہ سب کے سب سلطان کے دربار سے تنخواہ پاتے ہیں۔ اُسی کی طرف سے ان پر انعام و اکرام ہوتا رہتا ہے اگر بادشاہ کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کے قوال نے کسی اور کے یہاں قوالی پیش کی ہے تو پھر اس قوال کی جان بچنی مشکل ہو جاتی ہے۔ بادشاہ کا دربار صبح اور شام دن میں دو مرتبہ ہوتا ہے۔ محمد جنیدی کا بیان ہے کہ منگل کے روز بادشاہ پورے دن دربار عام کرتا ہے۔ منگل کا دربار ایک بہت وسیع میدان میں ہوتا ہے۔ جہاں ایک شاہانہ چتر لگایا جاتا ہے چتر اتنا بڑا ہوتا ہے کہ سائبان کے طرح سارے میدان کو ڈھک لیتا ہے۔ بیچ میں ایک اونچا سونے چاندی اور جواہرات کا جڑاؤ تخت رکھا جاتا ہے جس پر بادشاہ عدل و انصاف کے لیے بیٹھتا ہے۔ تخت کے داہنے بائیں ارکان سلطنت یعنی وزیر اور مشیر ادب سے کھڑے رہتے ہیں اور تخت کے پیچھے مسلح سپاہی اور خدمت گار، وغیرہ کمر کسے رہتے ہیں۔ باقی منصب دار اور عہدے دار اپنے اپنے منصبوں کے

مطابق کھڑے ہوتے ہیں۔ تخت کے سامنے بیٹھنے کی اجازت صرف خانوں، خفیہ نویسوں اور صدر جہاں کو ہوتی ہے۔ اور آواز لگانے والے چپراسی دروازوں پر کھڑے ہو کر فریادیوں اور نالش دائر کرنے والوں کو پکار پکار کر حاضر کرتے رہتے ہیں۔

داد خواہ اور انصاف ، چاہنے والے اپنی اپنی فریاد سنا کر بادشاہ سے انصاف کے طالب ہوتے ہیں۔ بادشاہ کے حضور میں پہنچنے کے بعد جس وقت تک وہ اپنی پوری فریاد نہ سنا لیں اور اُن کے حق میں بادشاہ کا حکم صادر نہ ہو جائے اُس وقت تک نہ کوئی انھیں مار سکتا ہے اور نہ ان پر کسی طرح کا دباؤ ڈال سکتا ہے۔ منگل کے علاوہ ہر روز صبح شام بادشاہ دربار عام کرتا ہے۔ دربار عام میں کوئی شخص کسی قسم کا ہتھیار اندر نہیں لا سکتا۔ نہ خود ہتھیار سجا کر آ سکتا ہے۔ چاقو تک دربار میں نہیں لایا جا سکتا۔ دربار میں داخل ہونے سے پہلے بادشاہ کو ہر آنے والے کی بابت پوری اطلاع دی جاتی ہے۔ دربار کے میدان میں بادشاہ کے تخت تک پہنچنے کے لیے دروازے کے اندر دروازہ دروازے کے اندر دروازہ اسی طرح سات دروازے ہوتے ہیں پہلے دروازے پر ایک سپاہی مقرر ہوتا ہے۔ جب کوئی خان یا ملک یا بڑا امیر پہلے دروازے پر پہنچتا ہے تو وہ سپاہی بادشاہ کو خبر دینے کی غرض سے بگل بجانا شروع کرتا ہے۔ خانوں۔ ملکوں اور بڑے امیروں کو اندر تک سوار ہو کر جانے کی اجازت ہے مگر معمولی شخص کے لیے پہلے ہی دروازے پر پیدل ہو جانے کا حکم ہے۔ البتہ معمولی لوگوں میں سے کسی کو خاص طور سے اجازت مل جاتی ہے تو وہ بس چھٹے دروازے تک سوار ہو کر جا سکتا ہے۔ دربار میں داخل ہونے والا جب تک ساتویں دروازے تک نہیں پہنچ جاتا اُس وقت تک برابر بگل بجتا رہتا ہے۔ جو آتا جاتا ہے وہ چھوؤں دروازوں سے گزر کر ساتویں دروازے کے قریب بیٹھتا جاتا ہے۔ جب آنے والوں کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے اور کسی کا انتظار باقی نہیں رہتا تو پہلا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے۔ اور جو لوگ ساتویں دروازے پر جمع ہوتے ہیں ان کو دروازے سے گزرنے اور محل کے اندر داخل ہونے کی اجازت دیدی جاتی ہے۔ اندر

داخل ہونے کی اجازت دیدی جاتی ہے۔ اندر داخل ہونے کے بعد جو بٹھانے کے قابل سمجھے جاتے ہیں ان کو تخت کے اِدھر اُدھر بٹھا دیا جاتا ہے باقی سب کھڑے رہتے ہیں۔ بٹھائے وہ لوگ جاتے ہیں جو یا تو قاضی ہوں یا وزیر اور یا خفیہ نویس۔ ان سب کو ایسی جگہ بٹھایا جاتا ہے جہاں بادشاہ کی نظر نہ پڑے۔ اس کے بعد عدالت کی کارروائی اس طریقے سے شروع ہوتی ہے کہ ہر محکمے میں عرضیوں اور کاغذات کے بستے کھول دئے جاتے ہیں۔ ہر محکمے کے لیے ایک علیحدہ حاجب مقرر ہے جو اپنے محکمے کے مقدموں کی پیروی اور کاغذات کی پیشی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ سب محکموں کے حاجب مقدمات کے کاغذات حاجب خاص کے پاس لے جاتے ہیں۔ حاجب خاص سب حاجبوں کا افسر ہوتا ہے، وہ ان کاغذات کو بادشاہ کی خدمت میں لے جاتا ہے۔ بادشاہ ان سب پر حکم لکھ دیتا ہے اور دربار برخاست ہو جاتا ہے تو حاجب خاص ان سب کاغذات کو بادشاہ کے پیش کار کے پاس لے جاتا ہے۔ پیش کار کے ذریعے شاہی فیصلوں کا اجرا ہوتا ہے۔ دربار عام برخاست ہو جاتا ہے تو دربار خاص قائم ہوتا ہے۔ وہاں بادشاہ علمار کو بلاتا ہے۔ مگر دربار خاص میں وہی علمار جا سکتے ہیں جن کو بادشاہ کے ساتھ بہت ربط ضبط ہوتا ہے۔ ان کے ساتھ بادشاہ بہت گھل مل جاتا ہے ان کے ساتھ وہیں کھانا بھی کھاتا ہے، اور دل چسپی اور خوش مزاجی کی باتیں بھی کرتا ہے۔ وہ بھی بادشاہ سے کھل کر کلام کرتے ہیں۔ علمار کی صحبت کا وقت ختم ہو جاتا ہے تو بادشاہ ان کو رخصت کر دیتا ہے۔ علمار چلے جاتے ہیں تو بادشاہ خلوت میں بیٹھتا ہے اور اپنے خاص خاص مصاحبوں کو بلاتا ہے اور خدا کی تعریف کے نغمے سننے کے لیے قوالوں کو طلب کرتا ہے۔ کبھی بادشاہ مصاحبوں سے باتیں کر کے خوش ہوتا ہے اور کبھی قوالوں کے بول سن کر باغ باغ ہوتا ہے۔

شیخ مبارک کا بیان ہے کہ دربار عام برخاست ہو جاتا ہے تو سلطان محمد کی عام اور خاص محفلیں ہوتی ہیں۔ عام محفل کی تو یہ کیفیت ہے کہ اس میں معمولی ملازمین کا تو

گزرنہیں صرف بڑے بڑے عہدے دار بھی اپنے نمبر سے جا سکتے ہیں۔ یہی قاعدہ اہلکاروں اور طبیبوں اور ان کے ہم رتبہ لوگوں کے لیے مقرر ہے۔ غرض خاص محفل میں کوئی بھی بغیر نمبر کے نہیں جا سکتا۔ شعرا کی حاضری کے لیے بھی وقت مقرر ہے.....

سلطنت کا انتظام اور حکومت

"مسالک الابصار" میں لکھا گیا ہے کہ خانوں میں سے کسی خان کو چن کر سلطان محمد اپنا نائب مقرر کر لیتا ہے جو امیریہ کہلاتا ہے۔ لشکر کے معاملات خاص طور پر اور رعایا کے عام طور پر اسی امیریہ کے ذمے ہوتے ہیں۔ ایک بڑا صوبہ اس کی جاگیر میں دیا جاتا ہے۔ بادشاہ کا ایک وزیر بھی ہے۔ جس کو امیریہ کے برابر جاگیر ملتی ہے۔ وزیر کے چار نائب ہوتے ہیں جو شق کہلاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی تنخواہ بیس ہزار سے لے کر چالیس ہزار سالانہ ٹنکے تک ہوتی ہے۔ وزیر کے ماتحت چار میر منشی ہیں جو دفتروں میں بیٹھ کر خفیہ خبروں کو لکھتے ہیں۔ ان چاروں میں سے ہر ایک کو ایک ایک شہر جاگیر میں ملا ہوا ہے۔ جس کی آمدنی بڑی بندرگاہ کی آمدنی کے برابر ہوتی ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کی دیکھ بھال انھیں چاروں میر منشیوں کے ذمے ہے۔ ہر میر منشی کے ماتحت قریب قریب تین سو منشی ہیں، جن میں سے سب سے چھوٹے کی تنخواہ ہزار ٹنکے سالانہ ہے۔

بڑے منشیوں کے پاس اس سے بھی زیادہ ہیں، جن کی آمدنی تقریباً ساٹھ ہزار ٹنکے ہے۔ آج کل کمال الدین بن برہان خاں قاضی القضاۃ ہے۔ وہی صدر الاسلام کہلاتا ہے، اور وہی محکمہ عدل کا سب سے بڑا افسر ہے۔ عالموں اور فاضلوں کے سب معاملے خواہ وہ ہندوستانی ہوں یا ولایتی صدر جہاں کے اہتمام میں ہیں۔ شیخ الاسلام (مصر کے) شیخ الشیوخ کے برابر ہے۔ اس کی آمدنی

اتنی ہے جتنی صدر جہاں کی۔ اس کے ذمے تمام جوگیوں، سادھوؤں اور قلندروں کا اہتمام ہے۔ خواہ وہ ہندوستانی ہوں یا غیر ہندوستانی۔

شیخ مبارک نے آئین سلطنت اور طرز حکومت کے اعتبار سے سلطان محمد کا مقابلہ الپ ارسلان سلجوقی کے بیٹے ملک شاہ سے کیا ہے۔ لکھا ہے کہ۔ "یہ بادشاہ اپنے زمانے کا ملک شاہ ہے"۔ ملک شاہ گیارھویں صدی عیسوی کا وہ نامی گرامی بادشاہ گزرا ہے جس کی خوبیاں اور سیاست دانیاں اس کے وزیر اعظم نظام الملک ابو علی حسن نے سیاست نامے میں بیان کی ہیں۔ سیاست نامے کا فرانسیسی ترجمہ ہمارے سامنے ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک شاہ کو سیاسیات میں بڑی واقفیت تھی۔ وہ سیاست مدن (مصالح اور حکمتِ عملی) میں ماہر تھا۔ اسی کی سی مثال سلطان محمد کی ہے۔ وہ جہانداری میں اور ملکی انتظامات میں ماہر تھا۔ اور سیاسیات میں بڑی دل چسپی لیتا تھا۔

شاہی سواری

مسالک الابصار کا بیان ہے کہ سلطان محمد کی خدمت میں دس ہزار خواجہ سرا رہتے ہیں۔ ایک ہزار چوبدار، اور ایک ہزار بشتمقدار، دو لاکھ غلام ہیں۔ جن کے گھوڑوں پر ہتھیار سجے رہتے ہیں اور وہ بادشاہ کی سواری کے اِدھر اُدھر چلتے ہیں اور ان سواروں کا سلسلہ پیادوں سے جا ملتا ہے، جو بادشاہ کے آگے آگے چلتے ہیں۔

شیخ مبارک کا بیان ہے کہ جب سلطان محمد سوار ہوتا ہے تو اس کے سر پر شاہی چتر لگایا جاتا ہے۔ اور جب جنگ کی غرض سے نکلتا ہے یا دور دراز کا سفر کرتا ہے تو اس کے سر پر سات چتر لگائے جاتے ہیں۔ ان میں سے دو چتر زر و جواہر سے جڑے ہوئے ایسے ہیں جن کی کوئی قیمت نہیں ہو سکتی۔ جب بادشاہ پایہ تخت میں ہوتا ہے تو اس کے سارے ٹھاٹھ سکندر اعظم کے سے ہوتے ہیں۔ وہی آن بان، وہی شان،

وہی سلطنت کے آئین، وہی دربار کے قوانین

کے ساتھ ساتھ خان، ملک، اور امیر ہاتھوں میں جھنڈے لیے چلتے ہیں۔ خانوں کی جماعت میں زیادہ سے زیادہ نو جھنڈے ہوتے ہیں، اور امیروں کی جماعت میں کم سے کم تین۔ بادشاہ کی سواری جب پایۂ تخت میں نکلتی ہے تو خانوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ (۹) نو جھنڈے ہوتے ہیں اور امیروں کے ساتھ دو کوتل گھوڑے۔ بادشاہی لشکر کے کل افسر سفر کی حالت میں اپنا اپنا انتظام اپنی مقدرت اور ہمت کے مطابق کرتے ہیں اور جب پایۂ تخت میں پہنچتے ہیں تو ان کے خرچ سے کہیں زیادہ شاہی خزانے سے مل جاتا ہے۔

شکار کی سواری

صاحب "مسالک الابصار" لکھتا ہے کہ جب بادشاہ شکار کو جاتا ہے تو ہاتھی پر سوار ہو کر جاتا ہے۔ اُس وقت اس کے ساتھ ایک لاکھ سوار اور دو سو ہاتھی ہوتے ہیں۔ اس سے زیادہ نہ سوار ہوتے ہیں نہ ہاتھی۔ شاہی سواری کے ساتھ ساتھ چار لکڑی کے محل بھی آٹھ سو اونٹوں پر لدے ہوتے ہیں۔ یعنی ہر محل کو دو ۲۰۰ سو اونٹ اٹھائے ہوتے ہیں۔ ان سب محلوں پر زر دوزی کا کام کیے ہوئے سیاہ ریشمیں کپڑے پڑے ہوتے ہیں۔ ہر محل دو منزل ہوتا ہے۔ محلوں کے علاوہ تنبو اور ڈیرے بھی ساتھ ہوتے ہیں۔ مگر وہ دو منزلے نہیں ہوتے۔

ابن بطوطہ نے بھی شکار کی سواری کا حال لکھا ہے۔ اور جو کچھ لکھا ہے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر لکھا ہے اور ذاتی تجربے سے لکھا ہے۔ اس لیے کہ شکار کی سواری میں بعض موقعوں پر وہ بادشاہ کے ساتھ جاتا تھا۔

ایک مرتبہ کا ذکر اس نے یوں کیا ہے کہ "جب بادشاہ شکار کے لیے دارالخلافہ سے باہر گئے تو میں بھی ساتھ گیا۔ میں نے سفر کی تمام ضروری چیزیں خرید لی تھیں۔ ایک

ڈیرہ خرید لیا تھا۔ اور ایک سائبان۔ سائبان ڈیرے کے اندر سائے کے لیے لگایا جاتا ہے، اور دو بڑے بانسوں پر کھڑا کیا جاتا ہے، جنھیں لوگ کندھوں پر لے جاتے ہیں۔ یہ لوگ کیوانی کہلاتے ہیں۔ ان کیوانیوں کو اور ان کے علاوہ گھاس لانے والے کو کہاروں کو، ڈولہ اٹھانے والوں کو، اور دوادویوں کو جو آگے آگے دوڑتے ہیں مسافر نوکر رکھ لیتے ہیں۔ میں نے روزانہ اجرت پر یہ سب لوگ اپنے ساتھ لے لیے تھے۔ جس روز بادشاہ کی سواری شہر سے باہر نکلی، اسی روز میں شہر سے باہر نکل آیا۔ میرے سوا اور آدمی دو۔ دو تین تین دن بعد آئے۔ سواری نکلنے کے دن شام کو پانچ بجے کے قریب بادشاہ اپنے ڈیرے کے باہر کرسی پر بیٹھے تھے کہ ہاتھی پر سوار ہو کر جائیں اور دیکھیں کہ کون کون چلنے کو تیار ہے۔ اسی وقت میں بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سلام کر کے میں داہنی طرف اپنی مقررہ جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ بادشاہ نے ملک قبولہ سرجاندار کے ذریعے مجھے کہلا بھیجا کہ بیٹھ جاؤ۔۔۔۔۔ اتنے میں ہاتھی آن پہنچا۔ سیڑھی لگائی گئی اور جب بادشاہ اس ہاتھی پر سوار ہو چکے تو چتر لگایا گیا اور بادشاہ کے خاص خاص مصاحب بھی سوار ہو گئے۔ دستور یہ ہے کہ جب بادشاہ سوار ہو جاتے ہیں تو ہر ایک اپنی اپنی فوج اور علم اور طبل اور نفیری اور سونا لے کر سوار ہو جاتا ہے۔ بادشاہ کے آگے آگے فقط حاجب اور طوائف اور طبلچی اور سرنا بجانے والے ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ داہنی اور بائیں طرف پندرہ پندرہ آدمی ہوتے ہیں جن میں وزیر اور بڑے بڑے امرا اور بعض شریف پردیسی بھی ہوتے ہیں۔ میں بھی داہنی طرف کی جماعت میں تھا۔ بادشاہ کے آگے آگے کچھ پیدل سپاہی اور راہبر چلتے ہیں۔ راہبر راستوں سے خوب واقف اور راستے دکھاتے اور راہیں بتاتے ہوئے جاتے ہیں۔ بادشاہ کے پیچھے غلام اور خادم ہوتے ہیں اور ان کے بعد امیر ہوتے ہیں اور ان کے بعد عام لوگ۔ کسی کو خبر نہیں ہوتی کہ کس جگہ قیام ہو گا۔ جب کوئی جگہ دریا کے کنارے یا درختوں کے جھنڈ میں بادشاہ کو اچھی معلوم ہوتی ہے تو حکم ہوتا ہے کہ اس جگہ اتر جاؤ۔

جب تک بادشاہ کا ڈیرہ نہ لگ جائے کوئی شخص اپنا ڈیرہ نہیں لگا سکتا۔ بادشاہ کا ڈیرہ لگ جاتا ہے تو ناظر آ کر ہر شخص کو اس کی جگہ بتا دیتے ہیں۔ بیچ میں شاہی ڈیرہ ہوتا ہے ارد گرد اور ڈیرے ہوتے ہیں۔ بکری کا گوشت یا کچھ شکار پہلے ہی روانہ کر دیا جاتا ہے۔ امیروں کے لڑکے فوراً حاضر ہو جاتے ہیں۔ ہر ایک کے ہاتھ میں ایک سیخ ہوتی ہے۔ وہ آگ روشن کرتے ہیں اور گوشت بھونتے ہیں۔ پھر ایک چھوٹا سا ڈیرہ لگایا جاتا ہے، اس کے باہر بادشاہ مع اپنے مصاحبوں کے بیٹھ جاتا ہے دستر خوان آتا ہے اور بادشاہ جس کو چاہتا ہے اپنے ساتھ کھانے کے لیے بلا لیتا ہے.....‘‘

ہوا خوری اور تفریح

مسالک الابصار میں مرقوم ہے کہ جب بادشاہ ہوا خوری وغیرہ کے لیے کہیں جاتا ہے تو اس کے ساتھ تیس ہزار سپاہی گھوڑوں پر اور اتنے ہی ہاتھیوں پر سوار ہوتے ہیں۔ ایک ہزار کوتل گھوڑے ہوتے ہیں، جن پر زین کسے ہوئے ہوتے ہیں۔ لگامیں چڑھی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان کے جسموں پر سنہری پاکھریں سجی ہوتی ہیں۔ ان کے گلے میں ہار پڑے ہوتے ہیں۔ اور ہر ہر عضو میں وہ زیور پہنے ہوتے ہیں بعض گھوڑے یاقوت اور جواہرات وغیرہ سے سجے ہوتے ہیں۔ لیکن جب بادشاہ اپنے محلات میں ایک محل سے دوسرے محل تک سوار ہو کر جاتا ہے تو اس کے سر پر چتر ہوتا ہے اور مسلح سپاہی ہاتھوں میں تلواریں لیے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں اور بارہ ہزار غلام بادشاہ کے گرد حلقہ کیے رہتے ہیں۔ سوائے چتر بردار اور جاں بردار کے سب پیدل ہوتے ہیں۔ بادشاہ کی سواری کی یہ شان محلات کے اندر شیخ محمد خجندی نے جو دہلی کے شاہی لشکر میں ملازم تھا اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ اس نے جیسی دیکھی ویسی ہی لکھ دی

جنگ کی سواری اور لشکر کی ترتیب

عام سواری میں اور جنگ کی سواری میں فرق تھا، جسے مسالک الابصار میں وضاحت سے نہیں لکھا گیا۔ شیخ مبارک کے حوالے سے اس میں بس اتنا لکھا ہے کہ "جب بادشاہ سوار ہوتا ہے تو اس کے سر پر شاہی چتر لگایا جاتا ہے اور جب جنگ کی غرض سے نکلتا ہے یا دور دراز کا سفر کرتا ہے تو اس کے سر پر سات چتر لگائے جاتے ہیں۔ ان میں سے دو چتر زر و جواہر سے جڑے ہوئے ایسے ہیں جن کی کوئی قیمت نہیں ہو سکتی۔ جنگ کے وقت بادشاہ لشکر کے بیچوں بیچ کھڑا ہوتا ہے اس کے ارد گرد علماء اور فضلاء ہوتے ہیں۔ لشکر کا ہر حصہ میمنہ ہو، میسرہ ہو، یا جناح دور دور تک پھیلا ہوتا ہے۔ تیراندازوں کے آگے ہاتھی ہوتے جن کے سارے بدن پر فولادی پاکھریں سجی ہیں۔ ان ہاتھیوں پر ہودج دھرے ہوتے ہیں۔ ہودجوں پر پردے پڑے ہوتے ہیں اور ان میں جنگجو سپاہی بیٹھے ہوتے ہیں۔ ہودجوں میں تیر پھینکنے کے لیے سوراخ بھی ہوتے ہیں اور تلواروں کے ہاتھ نکالنے کے لیے بھی گنجائش ہوتی ہے۔ ہاتھیوں کے آگے آگے پیادے ہوتے ہیں جو پیر تک ہتھیاروں میں ڈوبے رہتے ہیں۔ یہ لوگ آگے آگے اس لیے چلتے ہیں کہ پیچھے آنے والے ہاتھیوں کے لیے راستہ صاف کر دیں، اور دشمن کے سواروں کو سامنے سے آتا دیکھیں تو تلواریں مار مار کر پھیر دیں۔ ہودجوں کے برجوں میں تیر انداز بیٹھے رہتے ہیں جو ہاتھیوں کی پشت طرف منہ کیے رہتے ہیں۔ اور پیچھے سے حملہ کرنے والوں پر تیر چلاتے رہتے ہیں۔ ہاتھیوں کے دائیں بائیں گھڑسوار ہوتے ہیں جو دشمنوں کو کاٹتے چھانٹتے اور پامال کرتے ہوئے چلتے ہیں۔ بھاگنے والے کو کسی غار یا گڑھے میں بھی پناہ نہیں ملتی۔ سامنے سے آنے والے کو پیادے نہیں چھوڑتے۔ غرض شاہی لشکر ہاتھیوں کے چاروں طرف حلقہ باندھے رہتا ہے۔

لشکر کے اس عمدہ انتظام کی بدولت دشمنوں پر کیا نیچے، کیا اوپر، کیا دائیں، کیا بائیں، کیا آگے، کیا پیچھے، ہر طرف سے مار کی بھرمار رہتی ہے غنیم بادشاہی لشکر سے ملتے ہی موت کے شکنجے میں کس دیا جاتا ہے، اور بلا کے گھیرے میں پھنس جاتا ہے۔

لشکر

لشکر میں درجے ہیں۔ پہلا درجہ خان کا ہے۔ وہی سب درجوں سے بڑا ہوتا ہے۔ دوسرا درجہ ملک کا ہے اور تیسرا امیر کا۔ چوتھا سپہ سالار کا اور پانچواں جند کا۔ خان کی ماتحتی میں دس ہزار (۱۰۰۰۰) سوار رہتے ہیں۔ ملک کی ماتحتی میں ایک ہزار (۱۰۰۰) اور امیر کی ماتحتی میں سو (۱۰۰) سپہ سالار کی ماتحتی میں سو (۱۰۰) سے بھی کم۔ جندیوں[۱] کی تنخواہیں مقرر ہوتی ہیں۔ جو شاہی خزانے سے پابندی کے ساتھ ملتی رہتی ہیں۔ مگر خانوں، ملکوں اور سپہ سالاروں کے لیے بجائے تنخواہ کے سرکاری دفتر سے گاؤں مقرر ہو جاتے ہیں۔ جن کی آمدنی ان کے اخراجات کے لیے بہت کافی ہوتی ہے۔ بلکہ دفتر کے کاغذات میں ان کی جتنی آمدنی لکھی ہوئی ہے اس سے دو چند ان کو گاؤں سے وصول ہو جاتی ہے۔ خان کے لیے دو لاکھ ٹنکے سالانہ کی جاگیر مقرر ہوتی ہے۔ لاکھ سو ہزار ٹنکوں کا ہوتا ہے۔ اور ٹنکہ آٹھ درہم کا ہوتا ہے۔ یہ رقم خان ہی کی جیب خاص کے لیے ہوتی ہے۔ اس میں فوج کے دوسرے سرداروں کا کچھ حق نہیں ہوتا۔ اور انھیں اس میں سے کچھ دینے پر وہ مجبور بھی نہیں ہوتا۔ ملک کے لیے پچاس (۵۰) ہزار سے ساٹھ (۶۰) ٹنکے تک کی جاگیر مقرر ہوتی ہے۔ اور امیر کے لیے تیس (۳۰) ہزار سے چالیس (۴۰)

---

[۱] جندی سے مراد معمولی سپاہی ہے، جسے مفرد بھی کہتے ہیں۔

ہزار تک کی۔ سپہ سالار کے لیے تقریبًا بیس ہزار ٹنکے کی۔ باقی افسروں کے لیے ایک ہزار ٹنکے سے لے کر دس (۱۰) ہزار تک کی جاگیر ہوتی ہے۔ مگر سپہ سالار سے کم درجے والے فوجی افسروں کو خزانے سے نقد روپیہ مل جاتا ہے۔

مُلک ہو یا خان یا سپہ سالار۔ ان میں سے کوئی بھی لشکر سے اپنے لیے خدمت نہیں لے سکتا۔ یہ بات مصر اور شام کے بالکل برعکس ہے۔ وہاں مُلک اور امیر لشکریوں سے خدمت لے لیتے ہیں۔ ہندوستان میں ملک اور امیر اور سپہ سالار اپنا کام خود ہی کیا کرتے ہیں۔ لشکر تو بس بادشاہ کی خدمت کے لیے ہے۔ ملک، خان اور سپہ سالار لشکر سے خدمت لے سکتے ہیں تو بادشاہ ہی کے نام سے اور اسی کے لیے۔

اسی (۸۰) یا اسی (۸) سے زیادہ خان بادشاہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ لشکر میں نو (۹) لاکھ سوار ہیں۔ جن میں سے کچھ تو بادشاہ کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ باقی جگہ جگہ چھاونیوں میں مقرر ہوتے ہیں۔ اِن سب کے متعلق شاہی دفتر سے احکام جاری ہوا کرتے ہیں۔ اسی دفتر سے ان پر انعام اکرام بھی ہوتے رہتے ہیں۔ لشکر میں سپاہی ترک بھی ہیں خطائی بھی ایرانی بھی اور ہندو بھی۔ بعض لشکری پہلوان بھی ہیں اور دوڑنے والے بھی۔ نیچے اونچے درجے والے سب لشکریوں کے پاس داغ کیے ہوئے گھوڑے ہوتے ہیں۔ اچھے اچھے ہتھیار ہوتے ہیں اور سب لشکری ترک بھڑک سے رہتے ہیں۔ اُن میں سے زیادہ تر مذہبی احکام سیکھتے ہیں۔ بعض کو تو مذہب سے اچھی خاصی واقفیت ہوتی ہے۔ مذہب کی کل تعلیم امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے طریقے پر ہے۔

لشکر میں تین ہزار ہاتھی عماری دار رہتے ہیں جن کو لڑائی کے وقت لوہے کی اور سونے کی پاکھریں پہنائی جاتی ہیں۔ صلح اور امن کے دنوں میں ہاتھیوں پر قسم قسم کی ریشمین اور زردوزی کا کام کی ہوئی جھولیں ڈالی جاتی ہیں۔ جھولوں پر عماریاں جمائی جاتی ہیں۔ چاندی کے تخت رکھے جاتے ہیں۔ تختوں پر اونچی

اونچی لکڑیوں کے ذریعے چھتریاں بنائی جاتی ہیں۔ چھتریوں کے اندر ہندوستان کے سورما لڑائی کے لیے تیار بیٹھے رہتے ہیں۔ ایک ہاتھی کے اوپر زیادہ سے زیادہ دس اور کم سے کم چھ آدمی ہوتے ہیں۔ اتنے ہی وہ اٹھا بھی سکتا ہے۔

لڑائی کے ہتھیار

تاریخ فیروز شاہی میں آتشبازی کا اور آگ کا ذکر ہے مگر ان دنوں بندوقوں کا یا بارود کا استعمال نہ تھا۔ نفت یا روغن نفت کے ذریعے آگ پیدا کی جاتی تھی۔ کوئلوں کو دہکایا جاتا تھا اور جلتی ہوئی آگ برسائی جاتی تھی تلواریں چلائی جاتی تھیں۔ تیر برسائے جاتے تھے۔ اور نیزے چلائے جاتے تھے منجنیق اور عرادے سے توپوں کا کام لیا جاتا تھا۔ جن کے ذریعے قلعوں کی دیواریں توڑی جاتی تھیں۔ آگ پھینکی جاتی تھی اور پتھر مارے جاتے تھے چھوٹی منجنیق کو عرادہ کہتے تھے۔ منہاج السراج نے[1] تاریخ آل چنگیز میں لکھا ہے کہ جب چنگیز خاں نے مغل قبیلوں کے سردار التون خاں ترک رائی طمغاج پر حملہ اور اسے شکست دے کر اس کے مقبوضات، یعنی ولایت تغر، تبت اور طمغاج پر قبضہ کر لیا تو طمغاج پر جو التون خاں کا پایہ تخت تھا۔ منجنقیں لگا دیں۔ جو چار سال تک لگی رہیں۔ اور ان منجنیقوں کے ذریعے شہر پر برابر پتھر اور اینٹوں کی بارش ہوتی رہی۔ جب اینٹیں ختم ہوگئیں اور پتھر بھی نہ رہے تو پھر لوہا اور تانبا وغیرہ منجنیقوں میں بھر کر پھینکنے لگے۔

---

[1] اس کتاب کا پورا نام ــــــ کتاب سیاست الامصار فی تجربہ الاحضار در تاریخ آل چنگیز مصنفہ قاضی القضات منہاج الدین بن سراج الدین جورجانی ہے اس میں فاضل مصنف نے چنگیز خاں اور اس کے جانشینوں کا حال لکھا ہے۔

اصل عبارت یہ ہے : " و چنگیز خاں بر ولایت تغرو تبت و طمغاج استیلا یافت و بہ در شہر طمغاج و دار الملک التون خان آمد و مدت چہار سال بر در شہر بود. منجنیق نہادند و بینداختند، چوں سنگ و خشت و غیرآں کم شدہ پس ہر چہ آہن و رومی و سرب و ارزیر بود ہمہ در منجنیق بینداختند۔ پس بالش زر و نقرہ بعوض سنگ در منجنیق می گزاشتند و بیروں می انداختند"

تاریخ آل چنگیز (صفحہ ۱۰) سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہجری سنہ ۱۱۰۲ اور عیسوی سنہ ۱۲۰۵ اور ہجری سنہ ۶۱۷ اور عیسوی سنہ ۱۲۲۰ کے درمیان ہوا۔

تاریخ فیروز شاہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں تیر، تیغ، ناچخ، سنگ مغربی، ساباط، پاشیب اور گرگیچ کا بھی استعمال تھا۔ ناچخ ایک قسم کا چھوٹا نیزہ ہوتا تھا۔ سنگ مغربی سے مراد غالباً وہ گول گول اور چھوٹے چھوٹے پتھر ہیں جو منجنیق کے ذریعے پھینکے جاتے تھے۔ ساباط اس سرنگ کا نام ہے جو شاہی کیمپ سے دشمن کے قلعے تک یا ایک مقام سے دوسرے مقام تک قلعے کو فتح کرنے کی غرض سے کھودی جاتی تھی۔ ساباط اس چبوترے کو بھی کہتے تھے جو قلعے کی دو بڑی دیواروں کے درمیان بنایا جاتا تھا اور جس کے نیچے زمین دوز راستے ہوتے تھے۔ گرگیچ اس گڑھی کو کہتے تھے جو قلعے کے سامنے جنگ کی تیاری کے واسطے اور تحفظ کی غرض سے بنائی جاتی تھی۔ قلعوں پر چڑھنے کے لیے جو زینے بنائے جاتے تھے یا اُن پر سے اترنے کے لیے جو ڈھال بنائے جاتے تھے ان کو پاشیب کہتے تھے۔

پدماوت[1] میں سانگ ( ) اور ترشول کا بھی ذکر آیا ہے۔ سانگ ایک قسم کا بھالا ہوتا ہے اور ترشول ترپھنا۔

---

[1] "پدماوت" ہندی کی اس کتاب کا نام ہے جو سنہ ۱۵۴۰ء میں ملک محمد جائسی نے لکھی تھی۔ اس میں پدمنی کا اور سلطان علاالدین خلجی کا حال ہے۔

ڈاک کا انتظام

"مسالک الابصار" کے مصنف نے سراج الدین ابو صفا عمر شبلی کی زبانی لکھا ہے کہ سلطان محمد کو اپنی قلمرو کے حالات اور اخبار معلوم کرنے کی دھن لگی رہتی ہے. اور اپنی ہی سلطنت پر بس نہیں۔ اُسے تو آس پاس کی سلطنتوں کے حالات کی بھی تلاش رہتی ہے. بلکہ وہ ہر سلطنت کے ملکی، مالی، اور فوجی حالات دریافت کرتا رہتا ہے۔

اس بادشاہ نے اپنی سلطنت میں ڈاک کا انتظام یوں کیا ہے کہ ہر طرف پیادے مقرر کر دیئے ہیں۔ پیادے چھوٹے بڑے درجوں کے ہیں۔ بعض چھاؤنیوں میں رہتے ہیں اور بعض شہروں میں۔ جب کسی پیادے کو نئی خبر معلوم ہوتی ہے جس کا بادشاہ تک پہنچانا ضروری ہوتا ہے تو وہ اپنے بڑے افسر تک پہنچا دیتا ہے۔ اس طرح سلسلے وار وہ خبر بادشاہ تک پہنچ جاتی ہے۔ ڈاک کا یہ انتظام قریب قریب کے شہروں اور گرد و نواح کی بستیوں کے لیے ہے۔

دور دراز کے ملکوں کی ڈاک کا یہ انتظام ہے کہ دارالخلافہ دہلی سے لے کر مختلف صوبوں کے قلعوں تک تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ڈاک خانے بنے ہوئے ہیں۔ یہ ڈاک خانے ایسے ہی ہیں جیسے کہ مصر و شام کے ڈاک گھر۔ فرق یہ ہے کہ مصر اور شام کے ڈاک گھر ذرا دور دور بنے ہوئے ہیں اور یہاں پاس پاس ہیں۔ یہاں تو ایک ڈاک خانے سے دوسرے ڈاک خانے کا فاصلہ آدھ میل ہوگا یا اس سے بھی کم۔ ہر ڈاک خانے میں دس دوڑتے والے برید رساں مقرر رہتے ہیں۔ مقررہ وقتوں پر چپراسی ڈاک کے پلندے افسر برید خانہ کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ پوست خانہ افسر ان کو کھلوا کر ڈاکیوں پر تقسیم کر دیتا ہے۔ ڈاکیہ ڈاک لیتے ہی اپنے مقام سے دوڑتا ہے اور دوسرے ڈاک خانے تک پہنچا دیتا

ہے ۔ اسی طرح سے ڈاک دور سے دور شہروں میں جلد سے جلد پہنچ جاتی ہے ۔ ڈاکیہ ڈاک کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچا دیتا ہے تو فوراً اپنی جگہ واپس آجاتا ہے ۔ یہ پیادوں کی ڈاک ہے ۔ جو گھوڑوں اور سانڈنیوں کی ڈاک کو مات کرتی ہے اور ان دونوں سے کہیں جلدی پہنچتی ہے ۔

راوی کہتا ہے کہ ہر پوسٹ خانے کے اِرد گرد اچھی خاصی بستی بسی ہوئی ہے ہر بستی میں مسجد بھی ہوتی ہے جس میں پانچوں وقت جماعت سے نماز پڑھی جاتی ہے ۔ مسافروں کے ٹھہرنے کے لیے مسجد میں حجرے بنے ہوئے ہیں، ہر بستی میں پانی سے بھرے ہوئے پکے تالاب بھی ہیں اور بازار بھی ۔ بازار میں کھانے پینے کی سب چیزیں ملتی ہیں اور جانوروں کے لیے ہر قسم کا چارا بھی موجود رہتا ہے ۔ ان بستیوں سے مسافر کو بڑا آرام ملتا ہے ۔ ان کی بدولت نہ اسے اپنے ساتھ کھانے پینے کی چیزیں لے جانے کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ ہی ڈیرہ ڈھونے کی ۔

ابو صفا عمر شبلی نے کہا کہ سلطان محمد کی انتظامی سرگرمیوں میں سے ایک یہ بات بھی ہے کہ اُس نے اپنی قلم رو میں ہر جگہ خبر پہنچانے کی غرض سے ڈاک خانوں کے علاوہ نوبت خانوں کا سلسلہ قائم کر رکھا ہے جو ایک طرف تو دارالخلافہ دہلی پر ختم ہوتا ہے اور دوسری طرف دارالخلافہ دولت آباد پر ۔ بادشاہ کی سلطنت کے دارالخلافے یہی دو بڑے شہر ہیں ۔ انہی دونوں شہروں کو ہندوستان بھر کے نوبت خانوں کا مرکز سمجھنا چاہیے ۔ ان نوبت خانوں کی بدولت شہر شہر کے حالات اور واقعات کی اطلاع بادشاہ کو ہوتی رہتی ہے خواہ بادشاہ ملک کے کسی حصے میں کیوں نہ ہو ۔ حد یہ ہے کہ ان نوبت خانوں کے ذریعے ہر شہر کے دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے تک کی اطلاع بادشاہ کو مل جاتی ہے ۔ جب کسی نوبت خانے کے قریب کوئی واقعہ ہو جاتا ہے تو اس میں نوبت بجتی ہے ، اور اس نوبت کی آواز پر چاروں طرف کے نوبت خانوں میں سلسلے وار نوبت بجتی چلی جاتی ہے ۔

ابن بطوطہ نے ڈاک کا مختصر سا حال لکھا ہے مگر جو کچھ لکھا ہے اس سے مسالک الابصار کی تائید ہوتی ہے۔ اس کو ڈاک چوکی کے اور خبر رسانی کے انتظام ایسے دل چسپ معلوم ہوئے اور اتنے اہم نظر آئے کہ اُس نے سفرنامے کے شروع ہی میں اس کا ذکر کر دیا۔ اس کا بیان ہے کہ "سیوستان سے ملتان تک دس دن کا راستہ ہے اور ملتان سے دارالخلافہ دہلی تک پچاس دن کا جو خبر اخبار نویس بادشاہ کو لکھتے ہیں وہ اس کے پاس ڈاک کے ذریعے پانچ دن میں پہنچ جاتی ہے۔ ڈاک دو قسم کی ہے۔ ایک گھوڑے کی دوسری پیادوں کی۔ گھوڑے کی ڈاک کو اولاق کہتے ہیں۔ ہر چار کوس کے بعد گھوڑا بدلا جاتا ہے۔ یہ گھوڑے سرکاری ہوتے ہیں۔

پیدلوں کی ڈاک کا انتظام یہ ہے کہ ایک میل میں تین چوکیاں ہرکاروں کی ہوتی ہیں۔ چوکی کو داوہ کہتے ہیں۔ ہر تہائی میل کے فاصلے پر ایک گاؤں آباد ہوتا ہے۔ گاؤں کے باہر ہرکاروں کے لیے برجیاں بنتی ہوئی ہوتی ہیں۔ ہر ایک برجی میں ہرکارے کمر کسے بیٹھے رہتے ہیں۔ ہر ایک ہرکارے کے پاس دو گز لمبی چھڑی ہوتی ہے۔ جس کے سرے پر تانبے کے گھنگرو بندھے ہوئے ہوتے ہیں۔ جب شہر سے ڈاک چلتی ہے تو ہرکارہ ایک ہاتھ میں ڈاک کا تھیلا پکڑ لیتا ہے۔ دوسرے ہاتھ میں چھڑی لے لیتا ہے اور پوری طاقت سے دوڑتا ہے۔ قریب کی برجی والا ہرکارہ گھنگروؤں کی آواز سن کر تیار ہو جاتا ہے اور اس سے ڈاک کا تھیلا لے کر فوراً دوڑنے لگتا ہے۔ اس طرح ڈاک دور دور پہنچ جاتی ہے۔ یہ ڈاک گھوڑوں کی ڈاک سے بھی جلدی جاتی ہے۔ کبھی کبھی اس ڈاک کے ذریعے خراسان کے تازہ میوے بھی بادشاہ کے لیے تھالیوں میں پہنچائے جاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی کسی سنگین مجرم کو بھی چارپائی پر اٹھا کر ایک مقام سے دوسرے مقام تک اسی طرح پہنچا دیا جاتا ہے جب میں دولت آباد میں تھا تو بادشاہ کے لیے گنگا جل اسی ڈاک کے ذریعے پہنچایا جاتا تھا۔ دولت آباد دریائے گنگا سے چالیس دن کے فاصلے پر ہے۔

سچے عالم اور عامل

سفرنامے میں لکھا ہے کہ زندہ علما میں سے شیخ محمود کبّا ہیں۔ یہ بڑے بزرگ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے پاس دست غیب ہے۔ اس لیے کہ وہ خرچ بہت کرتے ہیں۔ اگرچہ بظاہر ان کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں۔ ہر مسافر کو کھانا کھلاتے ہیں اور مستحقوں اور محتاجوں کو روپے دیتے ہیں، اشرفیاں دیتے ہیں اور بنے بنائے کپڑے دیتے ہیں۔ اُن سے بہت سی کرامتیں ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ میں نے کئی مرتبہ ان کی زیارت کی اور اُن سے فیض حاصل کیا۔

شیخ علاء الدین نیلی ایک اور عالم ہیں۔ یہ شیخ نظام الدین بدایونی کے جانشین ہیں۔ ہر جمعہ کو وعظ کہتے ہیں۔ بڑا مجمع ہوتا ہے۔ بہتیرے ان کے مرید ہو جاتے ہیں۔ ایک دفعہ شیخ علاء الدین وعظ کہہ رہے تھے اور قاری قرآن شریف کی آیتیں پڑھتا جاتا تھا۔ جب اس نے یہ آیت پڑھی ،، اے لوگو! خدا سے ڈرو۔ قیامت کا واقعہ بڑا سخت ہوگا۔ جان کاہ ہوگا۔ اُس دن ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پلائے ہوئے بچے کو بھول جائے گی اور ہر حاملہ کا وضع حمل ہو جائے گا اور آدمیوں کے ہوش حواس گم ہو جائیں گے۔ ایسا معلوم ہوگا کہ گویا وہ نشے میں ہیں۔ مگر وہ نشے وشے میں نہ ہوں گے۔ ان کی یہ حالت عذاب خدا کے خوف سے ہوگی ،،[1] شیخ علاء الدین نیلی نے اسی آیت کو دوبارہ پڑھوایا۔ ایک فقیر نے جو مسجد کے گوشے میں بیٹھا ہوا تھا چیخ ماری۔ شیخ نے اس آیت کو پھر پڑھوایا۔ فقیر نے ایک اور چیخ ماری۔ اور مر گیا۔ اس وقت میں بھی مسجد میں

---

[1] یٰاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ. یَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّاۤ اَرْضَعَتْ وَ تَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَ تَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَ مَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَ لٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِیْدٌ۔

موجود تھا۔ یہ واقعہ میری آنکھوں کے سامنے ہوا۔ میں نے بھی اس فقیر کے جنازے کی نماز پڑھی۔

شیخ صدرالدین ایک اور عالم ہیں جو دن میں ہمیشہ روزہ رکھتے ہیں اور رات کو نمازیں پڑھا کرتے ہیں۔ دنیا کو انھوں نے بالکل ترک کر دیا ہے۔ لباس ان کا فقط ایک کمبل ہے۔ بہت سے امیران کے پاس آتے ہیں۔ سلطان محمد خود ان کی زیارت کے لیے آتا ہے۔ مگر شیخ صدرالدین سلطان سے اور اس کے امرا سے چھپتے پھرتے ہیں۔ ایک دفعہ سلطان محمد نے اُن سے درخواست کی کہ لنگر کے خرچ کے واسطے کچھ زمین یا گاؤں قبول کر لیجیے۔ مگر شیخ صدرالدین نے منظور نہ کیا۔ سلطان پھر ان کی زیارت کے لیے آیا تو دس ہزار دینار ان کی نذر کیے۔ شیخ نے وہ بھی قبول نہ کیے۔

مخبری کا محکمہ

مسالک الابصار سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان محمد بن تغلق کی سلطنت میں مخبری کا ایک علیحدہ محکمہ قائم تھا جس کا تعلق خاص بادشاہ سے تھا۔ اس محکمے میں بہت سے کارکن، اخبار نویس اور جاسوس کام کیا کرتے تھے اسی طرح ہر امیر کے گھر میں کچھ لونڈیاں رہتی ہیں جو امیر کے سب واقعات بھنگنوں سے کہدیتی ہیں اور بھنگنیں اس قسم کی خبریں مخبروں کے افسر کو پہنچا دیتی تھیں۔

سڑکیں

سفرنامے سے ظاہر ہے کہ سلطان محمد کے زمانے میں بڑی بڑی اور پکی سڑکیں تھیں، بلکہ اس سے پہلے بھی موجود تھیں۔ وہ لکھتا ہے کہ "دہلی سے دولت آباد چالیس منزل ہے، اور راستوں پر دونوں طرف بید مجنوں کے اور قسم قسم کے درخت لگے ہوئے ہیں۔ چلنے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ باغ کے درمیان چلا جاتا ہے۔ ایک ایک کوس میں تین تین چوکیاں ڈاک کے ہرکاروں کی ہیں۔ ہر چوکی پر ضرورت کی سب چیزیں ملتی ہیں۔ مسافر کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا

وہ برابر بازار میں سے چلا جا رہا ہے۔ اسی طرح یہ سڑک تلنگانے اور معبر تک چلی گئی ہے۔ تلنگانے سے دہلی تک چھ مہینے کی راہ ہے۔ ہر ہر منزل پر بادشاہی محل ہے اور مسافروں کے لیے سرائے ہے۔

سکّے اور نرخ

چودھویں صدی کے سیاح شیخ مبارک کا بیان ہے کہ ہندوستان میں سب سے بڑے دو سکے ہیں لکّ حمرا اور لکّ ابیض۔ سنہری سکہ لکّ حمرا کہلاتا جو سو ہزار سنہری تنکوں کے برابر ہوتا ہے اور روپیلی سکہ جو لک ابیض کہلاتا ہے چاندی کے سو ہزار ٹنکوں کے برابر ہوتا ہے۔ سنہری ٹنکا وزن میں ساڑھے تیرہ (۱۳) ماشے ہوتا ہے اور روپیلی ٹنکہ آٹھ ہشتگانیوں کے برابر ہوتا ہے۔ ہشتگانی کا سکہ چار سلطانیوں کے برابر ہوتا ہے۔ سلطانی کو دوگانی بھی کہتے ہیں۔ سلطانی یا دوگانی شَشگانی کی تہائی کے برابر ہوتا ہے۔ شَشگانی ہندوستان کے چاندی کے سکوں میں سے تیسری قسم کا سکہ ہے جو ہشتگانی کی تین چوتھائی کے برابر ہوتا ہے۔ یگانی بھی ایک سکہ ہے جو سلطانی یا دوگانی کا آدھا ہوتا ہے۔ اور جو قیمت میں ایک جیتل کے برابر ہوتا ہے۔ دو سکے اور ہیں۔ ایک دوازدہ گانی اور دوسرا شانزدہ گانی۔ دوازدہ گانی تیرہ ہشتگانی کے برابر ہوتا ہے اور شانزدہ گانی جو دو ہشتگانیوں کے برابر ہوتا ہے۔

غرض ہندوستان میں چاندی سونے کے سکے جو اس وقت رائج ہیں، چھ (۶) قسم کے ہیں۔ (۱) شانزدہ گانی، (۲) دوازدہ گانی، (۳) ہشتگانی، (۴) شَشگانی، (۵) سلطانی، اور (۶) یگانی۔ آخر کے تین سکے شَشگانی، سلطانی اور یگانی چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔ یہی تینوں تجارت میں بہت کام آتے ہیں۔ ان تینوں میں سب سے چھوٹا سکہ سلطانی ہے اور وہی سب سے زیادہ چلتا ہے۔

سلطانی مصر اور شام کے چوتھائی درہم کے برابر ہوتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ سلطانی آٹھ فلوس کے۔ جیتل ﴿۱﴾ چار فلوس کے۔ اور ہشتگانی مصر اور شام کے بتیس فلوس کے برابر ہوتی ہے۔

رطل کا پیمانہ جو ہندوستان میں سیر کہلاتا ہے، وزن میں ستر مثقال یا تین سو پندرہ، ماشے کے برابر ہوتا ہے۔ من ہندوستان میں چالیس سیر کا ہوتا ہے۔ یہاں چیزوں کو ناپ کر دینے کا رواج نہیں ہے۔ گیہوں یہاں سوا روپے من ملتا ہے۔ جَو ایک روپے من اور چاول پونے دو روپے من۔

بڑھیا قسموں کے بھاؤ اس سے بھی زیادہ ہیں۔ چنا آٹھ آنے من ہے۔ اور گائے کا اور بکری کا گوشت ایک سلطانی کا (یعنی دو آنے کا) چھ سیر ملتا ہے۔ اور دونوں قسم کے گوشت کا ایک ہی بھاؤ ہے۔ بھیڑ کا گوشت ایک سلطانی کا (یعنی دو آنے کا) چار سیر ملتا ہے۔ ایک مرغابی ایک ہشتگانی کی (آٹھ آنے کی) ملتی ہے۔ اور مصری ایک شانزدہ گانی کی (یعنی ایک روپے کی)، چار سیر آتی ہے۔ اعلیٰ قسم کی موٹی بھیڑ ایک نقری ٹنکے میں آتی ہے۔ نقری ٹنکہ آٹھ ہشتگانیوں کے برابر ﴿۲﴾ ہوتا ہے۔ ایک اچھا بیل بعض وقت دو ٹنکوں کا ملتا ہے اور بعض وقت اس سے بھی کم میں۔ بھینسوں کی بھی ایسی ہی قیمت ہے۔

﴿۱﴾ جیتل چار پیسے کا ہوتا تھا۔ جیتل اور یگانی کے دونوں سکے قیمت میں برابر ہوتے ہیں۔

﴿۲﴾ ٹنکے دو طرح کے تھے۔ ایک عدنائی دوسرا نقرئی۔ عدنانی یعنی سنہری ٹنکہ ساڑھے تیرہ ماشے کا ہوتا تھا روپیلی ٹنکے کی آٹھ ہشتگانیاں آتی تھیں۔ ایک ہشتگانی مصر اور شام کے درہم کے برابر ہوتی تھی۔ اور ایک ہشتگانی کی چار سلطانیاں آتی تھیں۔ ایک سلطانی کے دو جیتل اور ایک جیتل کے چار پیسے آتے تھے

جہاں آباد
مغربی سیّاحوں کی نظر میں

سیّد زاہد علی

دورِ متوسط میں تاریخ نویسی کا ایک مخصوص نظریہ تھا۔ جس کو درباری مورخین نے بڑی خوبی کے ساتھ اختیار کر رکھا تھا۔ تاریخ کا اصل مقصد دربار کے ماحول سے وابستہ مورخین نے صرف سیاسی تاریخ سمجھا تھا۔ جب کہ تاریخ ایک ہمہ گیر مضمون ہے۔ جس میں سماجی اقتصادی، علمی اور انتظامی مختلف پہلو آتے ہیں۔ اس طرح سیاست بھی تاریخ کا اہم جزء ہے اور جس کا جاننا بھی بے حد ضروری ہے۔ اس دور کی روِش، پس منظر اور معاشرہ کا مطالعہ بھی لازمی ہے کہ کن حالات میں مختلف سیاسی اشکال رونما ہوئیں۔ درباری مورخین نے صرف تخت نشینی، جنگوں بغاوتوں فتوحات اور بادشاہ کی دریادلی کو تفصیل سے بیان کیا، اقتصادی اور معاشی حالات کو نظر انداز کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاصر مورخین کی کتابوں میں صرف سیاسی حالات ملتے ہیں جو ایک خاص رنگ کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ یہ پوری تصویر نہیں اس کا ایک حصہ ہے ——— سماجی زندگی آہستہ آہستہ تبدیل ہوتی ہے۔ جس کے لیے وقت کی میعاد یا شاہی فرامین یا قوانین مقرر نہیں کیے جاتے۔ موجودہ دور میں بھی ویدک دور کے بہت سے رواج موجود ہیں۔ جدید مورخین نے بھی سیاسی حالات کو بغیر کسی تنقید کے اپنانا شروع کر دیا۔ لین پول، اسمتھ، سر ولزلے ہیگ اور دوسرے مورخین نے بھی تاریخ کو جنگ وجدل کی صورت میں پیش کیا۔ انھوں نے ہندوستان کے معاشرہ کے پس منظر کو نظر انداز کیا۔ ہندوستان کی ذات پات، طبقہ جاتی اختلافات قبیلہ جاتی تفریق نسلی اور زراعتی ڈھانچہ کی طرف دھیان نہ دیا۔[1]

---

[1] پیٹر ہارڈی۔ ہسٹوریز آف میڈیول انڈیا۔ لنڈن ۲

عوام کی زندگی، تہذیب و تمدن کے مختلف پہلو، داخلی اور بیرونی اثرات ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ نویسی کے لیے ضروری ہیں[1]

معاشرہ کے مطالعہ کے لیے ہمیں یورپ کے سیاحوں کے سفرناموں سے کافی مواد فراہم ہوتا ہے۔ دراصل اس کمی کو ان سفرناموں ہی نے پورا کیا ہے۔ ہندوستان کے لوگوں نے یہاں کے رسم ورواج کو اہمیت نہ دی۔ کیوں کہ وہ ان کو جانتے تھے۔ لیکن یورپ کے سیاح اجنبی تھے۔ وہ یہاں کے رسم ورواج سے ناآشنا تھے۔ اس لیے انھوں نے یہاں کے رہن سہن کے بارے میں بڑی دلچسپی کے ساتھ لکھا ہے۔ ان کے سفرناموں کا مقصد بادشاہ وقت کی تعریف و توصیف نہ تھا فیچ ٹیورنیر FETCH TAVERNIER, برنیر BERNIER) منوچی ٹیری MANOCHI TERRY) ہاکنس رو HAWKINS ROW وغیرہ نے ہندوستان کے متعلق لکھا ہے۔ لیکن برنیئر اور ٹامس رو کے سفرنامہ معاشی زندگی کے لیے اہم ہیں[2]

بہرحال ایسے سیاحوں کا شکریہ ادا کیا جائے تو غیر مناسب نہ ہوگا[3]

مسٹر ٹامس رو نے آگرے میں دو سال اور نو ماہ قیام کیا۔ برنیر دارا کا معالج رہا اس کے بعد دانشمند خاں سے متعلق رہا۔ منوچی دارا شکوہ، راجہ جے سنگھ، راجہ کرت سنگھ اور شاہ عالم اول سے وابستہ رہا۔ ٹیری کوریاٹ اور برنیر نے فارسی سیکھنا شروع کیا۔ برنیر تعلیم یافتہ اور اعلیٰ قوت مشاہدہ رکھتا تھا۔ اس لیے برنیر کا سفرنامہ دوسرے سفرناموں سے مقابلتاً بہتر ہے۔

ملبوسات، زیورات اور آرائشگی کے مختلف طریقہ ہر ملک کی آب وہوا اور پیداوار کے مطابق ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی یہاں کے موسم کے مطابق لباس رائج تھے۔ لیکن غیر ملکی اثرات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ جمالیاتی تصورات میں بھی اختلاف پائے جاتے ہیں۔ اورم (AKRAM) کے مطابق کپڑوں کی وہ طرز جو موجودہ دور میں رائج ہے دراصل

---

[1] پیٹر ہارڈی۔ ہسٹوریز آف میڈول انڈیا۔ لندن۔ صفحہ ۲

[2] کرشنن۔ "مغل دور کے یوروپین سیاح" اسلامک کلچر VOL XXI, NO:3 JULY 1947 - P.2[illegible]

[3]

وہ ہزاروں سال پرانی ہے۔ یورپ کے سیاحوں نے مجموعی طور پر ہندوستانی لباس کو صاف ستھرا لکھا ہے۔ ثروت مند لوگ ہر روز لباس تبدیل کیا کرتے تھے۔ اور بعض اوقات ایک دن میں کئی لباس پہنے جاتے تھے۔" ڈیلاویلا (DIIA VIIA)نے اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ اسے ہندوستانی لباس بہت پسند آیا وہ ایک جوڑا اپنے وطن اٹلی لے گیا اور وہاں کے لوگوں کو دکھایا۔ غریبوں کا لباس عمدگی اور قیمت میں امرار اور رؤسا سے کم ہوتا تھا۔ علمار صافہ، قبا اور پائجامہ کا استعمال کرتے تھے۔ برنیر نے شاہ جہاں کے دور کے ایک ہندو عالم کے لباس کو تفصیل سے لکھا ہے جس سے وہ بنارس میں ملا تھا۔ مغل بادشاہ نئے نئے لباس ایجاد کرنے کے شوقین تھے۔ ہمایوں نے بغلی ایک نیا لباس پہننا شروع کیا۔ بادشاہوں کے لباس عموماً سلک کے ہوتے تھے۔ جن پر زردوزی کا کام ہوتا تھا۔ ہیرے جواہرات اور موتیوں کے زیورات بھی پہناتے تھے۔ شلوار اور برجس پہننے کا بھی رواج تھا جو شہر کے اعلیٰ طبقے کے لوگ پہنا کرتے تھے۔ قبا عام طور پر ٹخنوں تک لمبی ہوتی تھی۔ بچوں کو سونے کی زنجیریں پہنائی جاتی تھیں۔ موزے عام طور پر لوگ استعمال نہ کرتے تھے۔ برنیر کے بقول ہندوستان میں اتنی سخت گرمی ہوتی ہے کہ یہاں بادشاہ بھی موزے پہننے سے گریز کرتے تھے۔ لیکن موسم سرما میں کہیں کہیں موزے پہننے کے حوالے ملتے ہیں۔ ترکی فیشن کے جوتے پہنے جاتے تھے۔ جو آگے سے نوک دار اور نیچی ایڑی کے ہوتے تھے تجارتی طبقہ کے لوگ پیدل چلنے کی وجہ سے اونچی ایڑی کے جوتے پہنتے تھے تاکہ تیزی سے چل سکیں۔ موسم سرما میں چمڑے کے سلیپر اور کھڑاویں بھی استعمال ہوتی تھیں۔ عورتوں کا لباس عموماً ساڑھی ہوتا تھا۔ سرخ رنگ اور دھاری دار کپڑے بے حد مقبول تھے۔

مسلمان عورتیں غرارے پہنتی تھیں جو وزن میں ایک اونس سے کچھ اوپر ہوتے تھے اور قیمت میں چالیس پچاس روپے سے کچھ زیادہ ہوتے۔ عورتیں شلوار اور آدھی آستین کی قمیض پہنتی تھیں۔ مسلمان عورتیں شاہجہاں کے دور میں سفید چادر یا برقعہ کا استعمال کرتی تھیں۔ لیکن غریب عورتیں ننگے سر رہا کرتی تھیں۔ مال دار عورتیں انواع واقسام کے جوتے پہنا کرتی تھیں جن میں سونے چاندی کے پھول لگے ہوتے تھے۔

عطر، صندل کی لکڑی اور خوشبودار اشیار کا استعمال بکثرت ہوتا۔ عرق چمیلی مولسری اور عنبر کا بھی استعمال ہوتا تھا۔ شاہجہاں آباد (دہلی) میں بنگال کے تیار شدہ تیل بے حد مشہور تھے۔ مفلس لوگ ناریل کا تیل استعمال کرتے تھے۔ جب کہ امراء اور روٴسا اپنے جسم کو صندل و دیگر خوشبوبات سے معطر کیا کرتے تھے سُرمہ کا استعمال زیادہ نہ تھا۔ موجودہ دور کے مانند بالوں میں خضاب بھی لگایا جاتا تھا۔ عورتیں اور مرد دونوں پان کھانے کے شوقین تھے۔ لکڑی، دھات اور سینگ کے کنگھے استعمال ہوتے تھے۔ بال بنانے کے مختلف طریقہ رائج تھے۔

بعض لوگ پیروں میں بھی بعض خوشبوؤں کا استعمال کرتے تھے۔ جو موجودہ صنعتی دور میں ختم ہوتا دکھائی دیتا ہے دلچسپ بات ہے کہ اس زمانے میں بھی نائی آئینہ اور تولیہ لیے ہوئے گلی کوچوں میں پھرا کرتے تھے۔ ان کے پاس قینچی، اُسترا، ناخن تراش وغیرہ ہوتے تھے۔ بال کاٹنے کی اُجرت ایک یا دو پیسے سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ آج بھی شاہ جہانی جامع مسجد اور لال قلعہ کے گردونواح میں اس قسم کے نائی ایک ٹین کا بکس لیے گھومتے دکھائی دیتے ہیں لیکن اب ان کی اجرت پیسوں میں نہیں بلکہ روپیوں میں ہوتی ہے۔

عورتوں میں زیورات پہننے کا بہت شوق تھا، زیورات نہ پہننا بدشگونی تصور کیا جاتا تھا۔ بازو بند، گجرہ، کنگن، جوا اور چوڑیاں اس دور کے عام زیورلت تھے زیور بیشتر سونے اور چاندی کے ہوتے تھے۔ لیکن غریب طبقہ کے لوگ معمولی دھاتوں کے زیور بھی پہنتے تھے۔ گجراتی ہندو زیورات بنانے میں مہارت رکھتے تھے۔ زیورات کے علاوہ یہ طبقہ ہیرے جواہرات کی تجارت بھی کرتا تھا۔

ہندو عام طور پر گوشت کا استعمال نہ کرتے تھے۔ لیکن پنجاب اور بنگال میں برہمن بھی کھاتے تھے۔ دہلی، لاہور اور آگرے میں مسلمان طرح طرح کے کھانے تیار کرتے تھے۔ برنیر اور مینریک (MEZIACK.) نے آگرہ اور شاہ جہاں آباد کے کھانوں کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے۔

سر ٹامس رو (TOMSON) کے مطابق شاہ جہاں کے دور میں امرا اپنے مہمان کے

سامنے پچاس قسم سے زیادہ کھانے پیش کرتے تھے۔

شاہی مطبخ (کچن) میں ہندوستان کے مشہور شہروں سے چیزیں اور مصالحہ منگوائے جاتے تھے منوچی کے بیان کے مطابق شاہ جہاں اور نگ زیب کے زمانے میں شاہی مطبخ میں ایک دن میں ایک ہزار روپے سے زیادہ خرچ ہوتا تھا۔ دلی میں آگرہ کی مٹھائی (غالباً پیٹھا) مشہور تھی۔ منوچی نے آگرہ کی مٹھائی کی دو کانوں کی تعریف کی ہے اور برنیر نے شاہ جہاں آباد کی مٹھائی کی دو کانوں کی تعریف ہے۔ فصل کے پھل جیسے آم، رس بھریاں سنترے، کھجور، انجیر اور انگور وغیرہ بکثرت بازاروں میں فروخت ہوتے تھے۔ پھلوں کی درآمد بھی ہوتی تھی۔ امراء اپنے مہمانوں کی تواضع پھلوں سے بھی کرتے تھے۔ تقریباً بیس "کراؤن" ایک وقت کے ناشتہ پر صرف آتے تھے۔

برنیر شاہ جہاں آباد کے بازاروں کو دیکھ کر حیرت میں رہ گیا تھا کیوں کہ یہاں سمرقند ابلخ اور بخارا کے پھل بھی بکثرت فروخت ہوتے تھے۔ مغل بادشاہ اور خاص طور پر شاہجہاں گنگا اور جمنا کا پانی پیتے تھے۔ عام لوگوں کا کھانا سادہ ہوتا تھا۔ کھچڑی ایک دل پسند خوراک تھی۔ جو مکھن کے ساتھ کھائی جاتی تھی۔ جوار باجرہ اور گیہوں کی روٹی کا بھی استعمال ہوتا تھا۔ متوسط اور اعلیٰ طبقہ کے لوگ گیہوں کا آٹا، ابلے ہوئے چاول اور سبزیاں کھاتے تھے گوشت مختلف طریقے سے تیار ہوتا تھا۔ بکرے، گائے، مچھلی اور بھیڑ کا گوشت کھایا جاتا تھا سیاہ مرچ اور گرم مصالحہ کا بھی استعمال ہوتا تھا۔

چاولوں کو بھی مختلف طریقوں سے تیار کیا جاتا تھا۔ بریانی، قیمہ پلاؤ، وغیرہ بھی پکائے جاتے تھے۔ چاولوں کی خاص ڈش جس میں بادام، کشمش اور مکھن شامل کیا جاتا تھا۔ حلوہ، فالودہ کیوڑہ کے ساتھ تیار کیا جاتا تھا۔ بطخ اور خرگوش کا گوشت بھی استعمال ہوتا تھا۔ کھانے کے آداب سخت نہ تھے۔۔۔ ایک دسترخوان فرش پر لگا دیا جاتا تھا۔ اس کے چاروں طرف بیٹھ کر کھانا کھانے کا رواج تھا۔ دسترخوان ریشم کے بنے ہوئے ہوتے تھے۔ اور ان پر خوشنما بیل بوٹے یا گل کاری ہوتی تھی۔ چمچوں کا استعمال عموماً نہ ہوتا تھا۔ ہاتھوں سے کھانا کھایا جاتا تھا۔ ہندو اور مسلمان کھلے عام شراب نوشی سے پرہیز کرتے تھے۔ اورنگ زیب کے علاوہ تقریباً تمام

مغل شہنشاہ شراب نوشی کرتے تھے۔ لیکن بابر اور جہانگیر شراب کے بے حد شوقین تھے۔ عام لوگ نشہ کے لیے تاڑی، میزا، اور مہوا وغیرہ استعمال کرتے تھے۔ یہ درختوں کی جڑ سے بنایا جاتا تھا۔ افیون کھانے کا بھی رواج تھا۔ غریب لوگ بھنگ استعمال کرتے تھے۔ ۱۶۰۵ء عیسوی کے بعد سے ہندوستان میں تمباکو اور تمباکو نوشی روز بروز مقبول ہو رہی تھی۔ لوگ آلتی پالتی مار کر حقہ پیا کرتے تھے۔ کچھ علاقوں میں عورتیں بھی حقہ پیتی تھیں۔ شیشہ تانبے اور پیتل کے حقے استعمال ہوتے تھے۔ منوچی کے مطابق صرف دہلی تمباکو پر پانچ ہزار روپے کا ٹیکس لگتا تھا۔ اس ٹیکس کی منسوخی پر غربا نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ پان کھانے اور کافی پینے کا بھی رواج روز بروز ترقی کر رہا تھا۔ امیر لوگ پان میں مشک، زعفران و دیگر قیمتی خوشبویات ڈالتے تھے۔ دہلی اور احمد آباد میں کافی کی دو کانیں موجود تھیں لیکن موجودہ دور کے قہوہ خانوں کے مانند نہ تھیں۔

شاہ جہاں کے دور میں تفریح کے ذرائع محدود تھے۔ شطرنج اور چوسر کے کھیل اعلیٰ اور ادنیٰ طبقہ میں مقبول تھے۔ شکار امرا اور رؤسا کا شوق تھا۔ چوگان کا کھیل ہندوستان میں گیارہویں صدی سے کھیلا جاتا تھا۔ لیکن کبڈی کے متعلق کچھ حوالے نہیں ملتے۔ اس کے علاوہ تماشاگر یا بازی گروں کا ایک علیحدہ طبقہ موجود تھا۔ یورپ کے سیاحوں نے تماشہ کے متعلق جا بجا لکھا ہے۔

منوچی کے بقول شہزادیوں کو اجازت تھی کہ مذاحیہ کہانیاں سن سکیں۔ رقص دیکھیں۔ پھولوں کے حسین اور گداز بستروں پر لیٹ کر عشق و محبت کی کہانیاں سنیں، باغات میں چہل قدمی کریں اور بہتے ہوئے پانی کی آواز کا لطف اٹھائیں۔ پرندوں کے نغموں سے اپنے دل کو آشنا کریں۔ تاش شطرنج، چوسر، چنڈل منڈل (ایک قسم کی چوسر جس میں سولہ سے چونسٹھ ٹکڑے کھلاڑیوں میں تقسیم کیے جاتے تھے)، نرد (پندرہ آدمیوں کے دو گروپ ایک لکڑی کے ٹکڑے پر چوبیس خانے بنے ہوتے تھے، یہ کھیل کھیلتے تھے)، وغیرہ اس دور کے عام کھیل تھے۔ پچیسی کا کھیل اکبر کے دور میں بے حد مقبول تھا۔

گنجفہ کا کھیل بھی امرا اور عوام میں پسند کیا جاتا تھا۔ دو گنی، تری گنی، نو گنی اور بارہ

گٹی کے مختلف کھیل ہوتے تھے۔ کشتی اور مکّا بازی کے بھی مقابلے ہوتے تھے۔ جس میں بیشتر ایرانی اور ترکی مکّا باز حصّہ لیتے تھے

تیر اندازی اور تلوار چلانا اُس دور کا فیشن تھا۔ ہر جوان آدمی سے یہ اُمید کی جاتی تھی کہ وہ تلوار اور تیر چلانا جانتا ہوگا۔ جانوروں کی لڑائی دیکھنے کا بھی رواج تھا جو موجودہ دور میں تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ شاہ جہاں نے کشمیر کے سفر کے دوران مختلف جانوروں کی لڑائی سے لطف اندوز ہوا۔ نیل گائے، ہرن چیتا اور شیر کا شکار بھی کیا۔

کتّوں اور باز کو شکار کے مقصد کے لیے خاص تربیت دی جاتی۔ جو شاہی شکار میں مددگار ثابت ہوتے تھے، مچھلیاں پکڑنا، کشتی چلانا، گھوڑ سواری اور جانوروں درندوں کی لڑائی پسندیدہ کھیل تھے۔ بکریاں، مرغے، بٹیر، بارہ سنگھے، ہرن، کتّے، بیل اور بُلبل کو لڑوایا جاتا تھا۔ لیکن بادشاہ خطرناک درندوں کی لڑائی سے بھی لطف اٹھاتے تھے۔ جس میں شیر، ہاتھی، چیتا اور دوسرے وحشی درندے شامل ہوتے تھے۔ دلی اور آگرہ میں اس قسم کی لڑائی (کھیل) کے لیے وسیع میدان بنوائے جاتے تھے۔ برنیر نے ہاتھیوں کی لڑائی کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ میدان کے بیچ میں ایک دیوار بنوائی جاتی تھی۔

کچھ وقفے کے ساتھ ہاتھیوں میں لڑائی ہوتی۔ دانت اور سونڈ زخمی ہو جاتے تھے۔ مٹی کی دیوار توڑ کر ہاتھی اپنے مقابل دشمن کو زخمی کرتا۔ ہاتھیوں کو علیحدہ کرنے کے لیے چرخی گھومتی مشعل استعمال کی جاتی تھی۔ کیوں کہ ہاتھی آگ سے ڈرتے ہیں۔ یہ ہاتھی سیلون سے آتے تھے۔ لیکن ان کو جنگ میں شریک نہ کیا جاتا تھا۔ جادوگر اور تماشہ گر (نٹ کا تماشہ کرنے والے) شاہ جہاں کے دور میں جا بجا ملتے تھے۔ جن کا حال یورپ کے سیّاحوں نے بڑی دلچسپی کے ساتھ لکھا ہے۔ جو موجودہ دور کے مانند گلی کوچوں میں گھوما کرتے تھے۔

برنیر نے اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ یہ عقلمند لوگ (جیوتشی)، دھوپ میں سڑکوں کے کنارے بیٹھا کرتے تھے۔ ایک گرد آلود دری ہوا کرتی تھی۔ تھوڑا سا پُرانا حساب کتاب کا سامان سامنے پڑا ہوتا تھا۔ جس پر سیّاروں اور ستاروں کے نقش اور نام بنے ہوتے تھے۔ یہ لوگ غریبوں کو ایک پیسہ لے کر ان کی آئندہ

قسمت کا حال بتایا کرتے تھے۔ ہاتھ اور چہرہ دیکھ کر بتاتے تھے۔ بے وقوف عورتیں سفید چادروں میں لپٹی لپٹائی جیوتشیوں کے پاس جوق در جوق آتی تھیں۔ اور وہ راز جو اپنے شوہروں سے پوشیدہ رکھتی تھیں وہ جیوتشیوں سے کہتی تھیں آج بھی اگر ہم دکٹوریہ ہسپتال (دکستور یہ ہسپتال) کے باہر سڑک پر چلیں تو جیوتشی بیٹھے ہوئے دکھائی دیں گے۔ وہی پرانی چادر کچھ کتابیں اور کچھ ہاتھ کی لکیروں وغیرہ کے نقشہ سامنے رکھے ہوں گے۔ ان کو دیکھ کر شاہ جہاں کے دور کی دہلی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ سولہویں اور سترہویں صدی اور بیسویں صدی میں انسان ایسے موجود ہیں جو سیاروں کی حرکت سے متاثر ہوتے ہیں۔ آج سائنسی تکنیک کا دور ہے، لیکن قدیم ہندوستانی تہذیب کے نشانات باقی ہیں۔

رقص کرنے والی عورتوں کی جماعت علیحدہ ہوتی تھی جو تہواروں کے موقعہ پر بلائی جاتی تھیں۔ وہ اپنے گانوں اور رقص کے ذریعہ مہمانوں کی تواضع کرتی تھی۔ دہلی اور آگرہ میں یہ عورتیں معقول اجرت پر کام کرتی تھیں۔ یہ لڑکیاں (کنچنی) کہلاتی تھیں۔ اورنگ زیب کے علاوہ تمام مغل بادشاہ ان کے گانوں اور رقص سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ شاہ جہاں اور جہاں گیر کا دور موسیقی کا دور عروج تھا۔ لیکن اورنگ زیب نے اس قسم کی عورتوں کو دربار میں آنے کی اجازت نہ دی۔

مشاعرے، قصہ گوئی، باغبانی اور مختلف میلے اور عرس بھی بڑی دھوم دھام سے منائے جاتے تھے۔ گلستاں بوستاں اور ایرانی شعراء کے ابیات (اشعار) بے حد مقبول تھے۔ جہاں گیر اور شاہ جہاں کو باغات کا بے حد شوق تھا۔

اسلامی تہواروں کے علاوہ ایرانی تہوار بھی بڑی گرمجوشی کے ساتھ منائے جاتے تھے۔ برنیر نے محل کے اندر جو مینا بازار لگتا تھا۔ اس کا آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے۔ اس میلہ کو امراء کی خوب صورت عورتیں ترتیب دیتی تھیں۔ جس میں سوزن کاری، گل کاری، کے اعلیٰ نمونے پیش کیے جاتے تھے۔ یہ حسین عورتیں دکاندار ہوتی تھیں۔ اور بادشاہ، بیگمات نیز شہزادیاں خریدار ہوتی تھیں۔ اگر کوئی امیر خوب صورت لڑکی رکھتا تو اس کی خواہش ہوتی کہ وہ بادشاہ کی منظور نظر ہو جائے۔ کبھی کبھی بادشاہ خریداری میں ایک ایک پیسہ پر بحث

کرتا تھا۔ بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد اپنی اپنی پسند کی چیزیں خریدتے تھے۔ اور فوراً قیمت ادا کرتے تھے۔ شاہ جہاں اس قسم کے بازاروں کا بہت دلدادہ تھا۔ اس قسم سے عورتوں کا بازار تقریباً ہر تہوار پر لگایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ عورتیں کنچنیاں لگان جمع کرانے دیوان عام میں آتی تھیں۔ شاہ جہاں ان کو تمام رات ٹھہراتا تھا اور رقص و سرور کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔

بادشاہ کی یوم پیدائش اور تخت نشینی کا دن بڑی شان و شوکت سے منایا جاتا تھا۔ دن کا ایک بڑا حصّہ اس تقریب میں صرف ہوتا تھا۔ یوم پیدائش پر بادشاہ امرار کے ساتھ اپنی والدہ کی قبر پر جاتا اور فاتحہ پڑھتا اور دعا کرتا۔

شاہ جہاں کے دور میں اکبر کے زمانے کی بعض رسومات کو ترک کر دیا تھا۔ لیکن یوم پیدائش پر تولنے کی رسم کو قائم رکھا عبدالحمید لاہوری کے بیان کے مطابق وہ تمام اشیار جن میں بادشاہ کا وزن کیا جاتا تھا وہ غربار اور مساکین میں تقسیم ہو جاتی تھیں۔ شاہ جہاں صرف سونے میں وزن کراتا تھا۔ امرار بادشاہ کو اس موقع پر تحائف دیا کرتے تھے۔ جاگیریں عطا کی جاتی تھیں امرار کے گھر کی خواتین بھی ملکہ کو تحائف دیتی تھیں۔

ایرانی تہواروں میں نوروز کے علاوہ "جشن آب پاشان" بھی بڑی مسرت سے منایا جاتا تھا۔ یہ تہوار بارش کی یاد میں ایرانی ماہ "یتر" کی تیرہ تاریخ کو منایا جاتا تھا جس کا مقصد موسم بہار کو خوش آمدید کہنا ہوتا تھا۔ عبدالحمید لاہوری کے مطابق جہانگیر اور شاہجہاں اس تہوار کو "عید گلابی" کہتے تھے۔ کیوں کہ یہ دونوں شہنشاہ ایرانیوں سے زیادہ متاثر تھے۔ امرار شہزادے آپس میں گلاب چھڑکتے تھے۔ اکبر کے دور میں معمولی دیوالی، دسہرہ وغیرہ بھی منایا جاتا تھا۔ لیکن شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے زمانے میں بعض غیر مسلم تہواروں کی اہمیت پہلے سے کچھ کم ہو گئی تھی۔ محرم، عید میلاد۔ شب برات، عید الفطر، اور عید الضحیٰ خصوصی طور پر منائے جاتے تھے۔ محلات ان خصوصی تہواروں پر روشن ہوتے تھے۔ دیوان عام میں آتشبازی بھی چھوڑی جاتی تھی۔

ہندو پریاگ، ہردوار تیرتھ یاترا کے لیے جاتے تھے۔ مسلمان اجمیر، پانی پت،

نظام الدین اولیاء کے عُرس کی تقریبات میں شریک ہوتے تھے امراء (ہندو مسلم) کی عورتیں سختی سے پردہ کرتی تھیں۔ ان کو یہ اجازت نہ تھی کہ وہ غیر مردوں کے سامنے آسکیں عورتوں کو بیماری کے دوران بھی یہ اجازت نہ تھی کہ وہ مرد ڈاکٹر یا حکیم کا علاج کرسکیں۔ بغیر پردہ کے باہر جانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ عام طور پر پالکی کے ذریعہ عورتیں ایک مقام سے دوسرے مقام جاتی تھیں۔ کہار صرف مکان کے بیرونی حصہ تک پالکی لے جاتے اور وہاں سے پالکی کو عورتیں ہی اٹھا کر اندرونی حصہ تک لے جاتیں۔ لڑکیوں کی پیدائش کو اچھا نہ سمجھا جاتا تھا۔ محل میں لڑکے کی پیدائش پر جشن ہوتا تھا۔ لیکن لڑکی کی پیدائش پر صرف حرم میں عورتیں ہی خوشیاں مناتی تھیں۔

شادی سے پہلے لڑکی کو دکھانے کا رواج نہ تھا۔ کم عمر میں شادیاں ہوتی تھیں۔ کچھ طبقوں میں دولہا کے گھر والے دولہن کے گھر والوں کو روپیہ دیا کرتے تھے۔ عام طور پر عورتیں اپنے شوہر کے بغیر کھانا نہیں کھاتی تھیں۔ عورتوں کا مقام سماج میں بلند نہ تھا۔ بلکہ وہ شوہروں کے ماتحت رہا کرتی تھیں۔ پردہ کے باوجود عورتوں میں علم و ادب کا بھی شوق تھا۔ دولت مند گھروں کی لڑکیاں تعلیم یافتہ ہوتی تھیں۔ شعر و شاعری کا بھی ذوق رکھتی تھیں۔

——— تعلیم کے لیے مدرسے قائم تھے۔ اور اعلیٰ تعلیم کے لیے بھی علمی ادارے موجود تھے۔ ہندوؤں میں سنسکرت لازمی پڑھائی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ پنڈت چاروں وید پڑھاتے تھے۔ فلسفہ، ویدانت، گرامر، پُران وغیرہ کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ دہلی آگرہ، لاہور، گجرات اور کشمیر تعلیم کے اعلیٰ مراکز تھے۔ دہلی میں مختلف ادارے قائم تھے۔ جہاں پر علما تدریس کا کام کرتے تھے الغرض ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعلیم مذہب کے اثرات سے خالی نہ تھی۔ باہم انگا نے ایک مدرسہ خیر المنازل کے نام سے قائم کرایا تھا۔

جو پرانے قلعہ کے مغربی دروازے کے سامنے قائم تھا۔ یہ دو منزلہ عمارت کا مدرسہ تھا جس میں طلبار کے رہنے کا بھی انتظام تھا۔ ہمایوں کے مقبرہ کے احاطہ میں ایک دوسرا مدرسہ بھی قائم تھا جس کا نام دارالبقا تھا جو جامع مسجد کے جنوب کی طرف واقع تھا۔ منقولات و معقولات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ تعلیم کی تکمیل تقریباً بارہ سال میں ہوتی تھی۔ برنیر نے دہلی، آگرہ، بنارس کے علمی کارناموں کی تعریف و توصیف کی ہے۔

منوچی

BY MICCOLOO MANNUCI, TRANSLATED WITH INTRODUCTION
BY INDIAN TEST SERIES, STORIA D. MOGOR (MUGHAT)
WILLIAM IRVINE
VOLUME II
ABLE MORLE STREET, HONDON
PUBLISHED BY
THE GOVT. OF INDIA 1907

منوچی نے (MANUCCI) ہندوستان میں ایک طویل عرصہ گذارا 1653-1708ء کے دوران اتنے برسوں پر پھیلے ہوئے ایک نہایت اہم تاریخی دور میں اس نے معلومات کو جمع کیا یہاں کے مذہبی، تہذیبی اور تاریخی رویّوں کے بارے میں جن حالات و معاملات تک اس کی براہ راست یا بالواسطہ رسائی ہوئی انہیں ان تمام تفصیلات کے ساتھ ریکارڈ کیا جو اس کی نگاہ میں زیادہ اہم اور ضروری تھیں۔

اُس کی سیر و سفر کا منطقہ اور خبر و نظر کا حلقہ مغل سلطنت سے لے کر بیجاپور اور گول کنڈہ کی عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں تک پھیلا ہوا ہے اس میں شیواجی

سے متعلق مغل مہمات اور فتح و شکست کے وقوعات کو بھی شامل رکھیے کہ ان کے بغیر اس عہد کے سیاسی امور اور بدلتے ہوئے نقوش و آثار پر تاریخی اعتبار سے نظرداری ممکن نہیں تاریخی شخصیتوں، تاریخی اداروں اور تہذیبی رویوں سے متعلق منوچی نے بعض نہایت اہم تصویریں بھی اپنی اس تاریخی کتاب میں شامل کی ہیں یہ تصاویر زیادہ تر مغل، موقلم کی پیش کش ہیں اور عہد اورنگ زیب اور کچھ بعد کے زمانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اورنگ زیب کی ایک سے زیادہ تصاویر کے ماسوا جس میں اُس کے دَور آخر کی بھی ایک تصویر شامل ہے۔ ایک ایسی تصویر بھی دی گئی ہے جس میں اُسے دارا شکوہ کا سر، ایک طشت زر میں رکھ کر پیش کیا جا رہا ہے۔

تصویروں کے ذیل میں، شہزادہ محمد، شہزادہ محمد معظم، شہزادہ محمد اعظم، شہزادہ محمد اکبر اور شہزادہ کام بخش کی تصاویر خصوصیت کے ساتھ شامل ذکر ہیں، امرا میں جسونت سنگھ مرزا راجہ جے سنگھ، غازی الدین خاں فیروز جنگ، امیر الامرا شائستہ خاں وغیرہ کی تصویروں کو اہمیت حاصل ہے۔

سلاطین گول کنڈہ و بیجاپور سے متعلق ایسی الگ الگ دو تصویریں بھی ہیں جن میں ان خاندانوں کے حکمرانوں کو یکے بعد دیگرے ایک ہی مجلس میں دکھلایا گیا ہے شیواجی کے ماسوا افضل خاں کی تصویر کو بھی اس کے صفحات کی سیر کے دوران دیکھا جا سکتا ہے۔ ستی ہوتی ہوئی ایک جوان عورت کی شبیہ بھی یہاں موجود ہے دکن اور ہندوستان کی عورتوں کی تصویریں۔ چنڈول محافہ، محمل اور ڈولے جیسی سواریوں کی صورت و ہیئت کو سمجھانے کے لیے تصاویر دی گئی ہیں۔

اورنگ زیب کے عہد کے امرا، صوبہ جات ان کا گوشوارۂ آمدنی سواری خاص کے ہاتھیوں شاہی گھوڑوں کی تعداد جیسی ضروری اور نیم ضروری باتوں کی تفصیلات ان جلدوں میں موجود ہیں جن کی مدد سے اس دَور کو بہت کچھ سمجھا جا سکتا ہے لیکن نقشے MAPS اور خاکے ان صفحات و اوراق میں نہیں ملتے۔

ہندوستانی تہذیب اور شاہی و شہری جشنوں اور جلوسوں کی شکل میں ہم دہلی کے

شاہی شہر کو بھی دیکھ سکتے ہیں لیکن منوچی نے براہِ راست دہلی شہر پر بہت کم لکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے اس کی اہمیت زیادہ تر سرسری ہے۔

(منوچی)

صوبہ دہلی مغل سلطنت کے شمال مغربی حدود کے اعتبار سے وسط میں واقع ہے۔ اس کے دارالریاست کا نام بھی یہی (دہلی) ہے یہ وہ شہر ہے جہاں مغل شہنشاہ کا قیام رہتا ہے اور جہاں وہ دربار کرتا ہے۔

اسی جگہ ہندو راجاؤں کا قیام رہتا تھا۔ یہیں پٹھان اور غلام خاندان کے اکتیس سلاطین اپنے اپنے دورِ حکومت میں رہے ان کے مغل امرا اور صوبے دار بھی یہیں قیام کرتے تھے جنہوں نے دہلی اور اس ملک کے بڑے حصّہ پر حکومت کی ہے اس میں سید اور مسلمانوں کے دورِ حکومت سے پہلے کے راجپوت راجہ بھی قیام فرما رہے قصّہ کوتاہ تمام مسلمان شرفا روا ونکا یہی مستقر رہا

اگرچہ یہ مرکزی دربار کا شہر ہے پھر بھی یہاں صنعت کار مینوفیکچرر زیادہ نہیں ہیں لیکن یہ علاقہ زرعی پیداوار کے لحاظ سے بہت زرخیز ہے اور جن شاہی پارچہ جات کے بارے میں نے لکھا ہے وہ یہیں سے حاصل کیے جاتے ہیں اس کے اطراف و جوانب میں ہنوز ان آثار کو دیکھا جاسکتا ہے۔ ہندو اور مسلمان حکمرانوں کے دورِ حکومت کے آثار باقیہ اور ان کے تعمیر کردہ محلات اور قلعوں کے کھنڈر ہیں۔

انھیں میں ایک تغلق آباد ہے جو نویں پٹھان بادشاہ نے بنوایا تھا اور جس کا بڑا حصّہ ابھی باقی ہے وہ سلطان زادہ جو تغلق شاہ کہلاتا تھا اس نے نو سال اور نو دن حکومت کی وہ اس وقت اچانک موت کا شکار ہو گیا جب وہ مذکورہ ایک مصنوعی شاہی محل کے دروازہ سے گذر رہا تھا اور اس سانحہ میں اس کے بیٹے محمد بن تغلق کی فریب کارانہ تدبیر کو دخل تھا۔ اس کے بیٹے نے اس کے لیے موت کا جال تیار کیا تھا جو اس کے قدم رکھتے ہی اس پر آ پڑا اور وہ اجل رسیدہ دبیگناہ سلطان موت کے چنگل میں پھنس گیا۔ اس واقعہ یا پھر بعض وجوہ

کے باعث یہ صورت تھی کہ سلاطین اپنے بیٹوں پر اعتبار نہیں کرتے تھے۔

اس صوبہ میں دوسرے کہنہ آثار بھی ہیں جہاں مسلمان گاہ گاہ اپنی روحانیت پسندی اور پرتقدیس جذبات کے تحت جاتے اور قیام کرتے ہیں مثال کے طور جہاں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی مزار ہے یعنی قطب صاحب کا ذکر کیا جاسکتا ہے جو اہل عقیدت کی نگاہ میں بڑی عظیم روحانی شخصیت تھے۔ اس کے علاوہ حضرت سلطان المشائخ کا روضہ شریف ہے میں نے ان مزارات پر ایسی باتیں ہوتی ہوئی دیکھی جن کے ذریعہ بھولے بھالے عقیدت مندوں کو (نذر و نیاز پر) اکسایا جاتا ہے۔ ور جو توہم پرستی کے ماسوا کچھ نہیں۔

عام طور سے بادشاہ اپنے سلطانی اصطبل میں پچاس ہزار گھوڑے رکھتا ہے اور یہ تعداد ان گھوڑوں کے علاوہ ہے جو روزمرہ کے شاہی اور اس کے معمولات میں کام آتے ہیں اور وہ بھی تقریباً اتنے ہی ہوتے ہیں۔ مغل شہنشاہ کے پاس بیس ہزار پیدل فوج ہے جو سب کے سب راجپوت ہیں۔ ان میں بارہ ہزار کے قریب لشکری توپ خانے سے وابستہ ہیں باقی آٹھ ہزار شاہی قلعہ کی حفاظت کے لیے مقرر ہیں۔ گھوڑسوار سنتری وغیرہ وغیرہ اس کے علاوہ ہیں۔

جہاں تک شاہی امورات ROYAL ESTABLISHMENT. کا تعلق ہے ان میں ایک چوکی خاص کا داروغہ ہوتا ہے اور یہی اس کا رسمی نام (داروغہ چوکی خاص) بھی ہے یہ افسر منتخب پہرداروں میں سے ہوتا ہے یہ اس لیے کہ اس کا تعلق معتمد سپاہیوں سے ہوتا ہے اور ان کا انتخاب معزز خاندانوں یا اشراف میں سے کیا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ چار ہزار گھوڑسوار ہوتے ہیں یہ افسر غسل خانہ کا بھی انچارج ہوتا ہے۔

اس کے زیر احکام کچھ مملوک افسران بھی ہوتے ہیں جو اس کے اپنے آدمی ہوتے ہیں اور انہیں چیلا کہا جاتا ہے۔ ایک اور افسر بھی ہوتا ہے جس کے تحت پانچ سو نیزہ بردار HALBERDIERS. ہوتے ہیں جو طلائی (نیزے) MACES اٹھا کر چلتے ہیں ان کی تنخواہ تین سو روپے ماہانہ سے لیکر ایک ہزار ماہانہ تک ہوتی ہے اور یہ ان کے منصب کے مطابق ہوتا ہے وہ شہزادوں کے پاس خبر رسانی کے لیے ملازم رکھے جاتے ہیں یا پھر ایسی کوئی دوسری

کوئی اہم خدمت ان کے سپرد ہوتی ہے۔

اسی طرح ایک اور آفیسر ہوتا ہے ایک ہزار HALBERDIERS. جس کی کمان میں ہوتے ہیں یہ چاندی کے MACES اٹھا کر چلتے ہیں۔ یہ بھی منصب دار ہوتے ہیں اور ان کی ماہانہ تنخواہ دو سو روپے سے پانچ سو روپے تک ہوتی ہے ان کے ذمہ یہ خدمت ہوتی ہے کہ یہ خطوط اور احکامات مغل سپاہ کے سپہ سالاروں اور کپتانوں کے پاس لے جاتے ہیں۔ جب دوسرے ملکوں کے سفیر آتے ہیں تو یہ ان کے درباری استقبال میں بھی شریک رہتے ہیں اور بعض دوسرے نسبتاً کم اہمیت کے کام انجام دیتے ہیں۔

ایک اور افسر دو ہزار منصب داروں کا افسر ہوتا ہے منصب داروں کا افسر اس لیے ہوتا ہے ان کے نیزے لوہے کے ہوتے ہیں۔ ان کو سپاہیوں کی تنخواہ کے برابر ہوتی ہے وہ مذکورہ ملازموں کے مقابلہ میں کم تر درجہ والے کام انجام دیتے ہیں۔

TRAVELS IN INDIA,
JEAN - PAPTISTO TAVERNEIR
BARON OF AUBONNE

اس کا ترجمہ وینٹائن بال نے کیا بعد ازاں یہ ولیم کروک WILLIAM CROOKE کے مزید ایڈیشن کی صورت میں سامنے آیا جو ہندوستان کی سول سروس میں رہ چکے تھے۔ اسے اٹیلانٹک پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز نیو دہلی نے دو والیوم میں چھاپا ہے۔

ٹیورنیر کے اس سفرنامے کا زمانہ 1667-1641 تک پھیلا ہے۔ یہ سیاح ہیرے جواہرات کا تاجر تھا اور اس معنی میں شاہی شہروں اور درباروں تک اس کی رسائی قیمتی پتھروں کی معرفت ہوئی تھی اس نے اثنائے سفر میں ہیروں کی کھانوں کو بھی دیکھا تھا۔ اس کے تعلقات بعض مشنریز سے بھی تھے۔

اس کی جو تصویر اس کتاب میں شایع کی گئی ہے اس کا پس منظر انداز قدیمانہ اور خود ٹیورنیر کا اسلوب رئیسانہ ہے۔

وہ بھاری بھر کم لبادہ اوڑھے ہوئے ہے۔ نیچا سا پھول دار فرغل اس نے پہن رکھا ہے۔ اس کی پگڑی کا اسلوب ترکش ہے۔

اولڈ دہلی

از
ٹیورنیر

... یہاں یہ بات خصوصیت سے قابل ذکر ہے کہ لاہور سے دہلی اور دہلی سے آگرہ تک کا راستہ ایک ایسی شاہ راہ ہے جس کے دونوں طرف خوبصورت سایہ دار درخت

لگے ہوئے جن کا نظارہ آنکھوں کو بھلا لگتا ہے۔ لیکن یہاں اور وہاں ان درختوں میں ایسے درخت بھی ہیں جو سوکھ گئے ہیں، گر گئے ہیں اور ان کی جگہ دوسرے درخت نہیں لگائے گیے۔

دہلی ایک بڑا شہر ہے جو دریائے جمنا کے کنارے یا یہ کہیے اس کے قریب آباد کیا گیا ہے جو شمال سے جنوب اور پھر مغرب سے مشرق کی طرف بہتا ہے اور آگے چل کر خود دریائے گنگا میں مدغم ہو جاتا ہے اس شاہی شہر کو شاہجہاں نے بسایا ہے اسی کے نام پر اس کو شاہجہاں آباد کہا جاتا ہے۔ شاہجہاں آگرہ شہر کے مقابلہ میں یہاں قیام کرنے کو ترجیح دیتا تھا کہ یہاں کی آب و ہوا اکبر آباد آگرہ کی بہ نسبت زیادہ خوش گوار ہے۔

اس پاس قدیم دہلی کا شہر اب کھنڈروں میں بدل گیا ہے اور جو حصہ قابل رہائش ہے وہاں زیادہ تر غریب لوگ رہتے ہیں۔ اُن کی جھونپڑیاں بیشتر بانس کی کھپچیوں اور گھاس پھونس سے بنائی جاتی ہیں جیسا کہ ہندوستان میں عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے شاہی دربار سے تعلق رکھنے والے تین چار ہی امراء ایسے ہیں جو قدیم دہلی کے علاقہ میں رہتے ہیں۔ باڑے کی طرح ایک بڑے حصہ کو گھیر لیا گیا ہے اور وہاں ان کے ڈیرے تنبو اور قناتیں لگادی گئی ہیں۔ ریورینڈ جیسوئیٹ فادر بھی اسی پرانی دلی میں رہا کرتے تھے۔

جہاں آباد بھی دہلی کی طرح اس کے جوار میں آباد شہر ہے جسے ایک سادہ سی سنگین دیوار اپنے اس پڑوسی شہر سے الگ کرتی ہے۔ پرائیویٹ لوگوں کے حویلی کے مکانات کافی بڑے بڑے اور کشادہ ہیں، ایک وسیع و کشادہ احاطہ کے وسط میں وہ حصہ مکان ہوتا ہے جہاں یہ لوگ رہتے ہیں اور وہاں تک کوئی نہیں جا سکتا جہاں ان کا زنان خانہ ہوتا ہے۔ شاہی امراء اور ارکان دولت کا بڑا حصہ شہر میں نہیں رہتا وہ شہر سے باہر بھی اپنے مکانات بنائے ہوئے ہیں تاکہ پانی سے قریب رہیں۔

جب دہلی کی طرف سے شاہجہاں آباد میں داخل ہوتے ہیں تو ایک لمبی چوڑی سڑک (فیض بازار) سامنے آتی ہے جس کے دونوں طرف بڑے بڑے چھجے دار مکانات بنے ہوئے ہیں جن کے سامنے چبوترے اور چوکیاں ہیں دکانیں محراب دار ہیں جہاں خرید و فروخت کا

کاروبار ہوتا ہے یہ سڑک آگے بڑھ کر ایک چوراہے تک جاتی ہے جہاں شاہی محل ہیں سے ایک اور سیدھا راستہ نکلتا ہے اور اس شاہی محل کے دوسرے دروازے تک جاتا ہے۔ یہاں مینابازار کے تاجروں سے متعلق مکان بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

شاہی محل اپنے نیم دائرے میں HALF LEAGUE کے قریب ہے اس کی دیواریں خوبصورتی سے تراشے ہوئے سرخ پتھروں کی دیواریں ہیں جن کے حفاظتی مرغولیس بنی ہوئی ہیں اور ایسی دس مرغولوں کے بعد ایک برجی آتی ہے نہر نما خندق پانی سے بھری رہتی ہے جس کے کنارے سنگ سرخ کے خوبصورت تراشوں سے آراستہ ہیں یہ سلسلہ ادھر سے اُدھر تک چلا جاتا ہے۔

اس کا صدر دروازہ ایسا کچھ خاص پر شکوہ اور عالی شان نہیں یہی صورت اس پہلے کورٹ کی ہے جہاں تک امرا کو اپنے ہاتھی پر بیٹھ کر آنے کی اجازت ہے۔ اس سے آگے ایک لمبا چوڑا راستہ ہے جس کے ہر دو جانب خوبصورت دالان بنے ہوئے ہیں جن کے نیچے چھوٹے چھوٹے چیمبر ہیں یہ اصطبل خانے کے محافظوں کے لیے ہیں۔

سفید رنگ کے بیش قیمت بہت اور خوبصورت ریشمی کپڑے یہاں دستیاب ہوتے ہیں کپڑوں کے معاملہ میں بہت متموّل ہے ان کے ماسوا ملبوسات طلائی اور نقرئی سلمے ستارے ٹکے ہوتے ہیں یا پھر انھیں سنہرے روپہلے تاروں سے بنے جاتے ہیں یہ پردوں کے صافوں اور پگڑیوں میں کام آتے ہیں اور عورتیں زرتار ملبوسات سے اپنا لبادہ تیار کرتی ہیں اور ان سے اپنی آرائش و سجاوٹ کا کام لیتی ہیں اور جن چیزوں کا ذکر ہوا وہ سب یہیں تیار ہوتی ہیں اس کے آس پاس کے علاقے بہت سی مصنوعات تیار کرتے ہیں جنہیں لاکر اس شہر میں جمع کر دیا جاتا ہے۔

برنیر کا سفرنامہ

مشہور فرانسیسی سیاح برنیر کا یہ تاریخی نوشت نامہ جو ایک معاصر دستاویز کی سی حیثیت رکھتا ہے اُس سفرنامہ کے ترجمہ سے اخذ کیا گیا ہے۔ جو شاہجہاں کے ایامِ اسیری اور عہدِ اورنگ زیب کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ اس کے ذیل میں یہ عبارت لکھی گئی ہے۔

"مشہور فرانسیسی سیاح ڈاکٹر برنیر کا بارہ سالہ روزنامچہ"

موجودہ صورت میں نامچہ تو یہ نہیں ہے لیکن اس دور کی تاریخ سے اس کا گہرا رشتہ ہے۔ ترجمہ نگار کی حیثیت سے خلیفہ محمد حسین میر منشی ریاست پٹیالہ کا نام سرورق پر موجود ہے۔ اسے نفیس اکادمی کراچی نے ۱۹۴۰ء میں شائع کیا ہے۔ کتابت انوری بیگم دہلوی نے کی ہے۔

برنیر اپنے پیشہ کے اعتبار سے ایک طبیب تھا۔ اپنے ذوقِ سفر کی تسکین اور جہاں بینی کی خواہش کی تکمیل کے طور پر اس نے ۱۶۵۶ء تا ۱۶۶۸ء کے دوران اس نے ہندوستان کا سفر اختیار کیا اور زیادہ تر وقت مغل دربار سے وابستگی میں گزارا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ حضرت ظلِ سبحانی صاحب قرانِ ثانی نظر بند کردیے گئے تھے اور ان کے بیٹے اورنگ زیب عالم گیر بادشاہِ غازی کا دورِ حکمرانی تھا برنیر نے جو واقعات، اپنے سفرنامہ میں درج کیے ہیں ان میں بہت سے واقعات

اُس کے چشم دید ہیں اور بعض واقعات کو اس نے اپنے سفر کے دوران سنا اور قلم بند کیا ہوگا۔

بہر حال اس کا یہ سفر نامہ اس عہد کے لیے ایک تاریخی دستاویز ہے۔ جہاں تک دہلی کی تہذیبی زندگی سے متعلق برنیر کی نگارشات کا سلسلہ ہے وہ اس کے خطوط کی صورت میں ہے اور یہ خطوط اس سفر نامہ کی دوسری جلد میں ملتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرانسیسی زبان سے اس کا ترجمہ کیا گیا تھا۔

بعدازاں کرنل ہنیری موُر بہادر نے ان کے چھوٹے بھائی خلیفہ سید محمد حسین کی مدد سے اسے اُردو میں منتقل کیا۔

خود کرنل ہنری مور کا یہ بیان ہے کہ خلیفہ محمد حسین نے اس کو بہ نظر اصلاح دیکھا تھا اور ترجمہ میں اپنی طرف سے ترمیمات اور اضافہ کیے تھے ـــــ ابتدائی ترجمہ کے دوران احمد الدین نامی کسی شخص نے اس کی مدد کی تھی۔

ایسی صورت میں یہ ترجمہ تمام تر خلیفہ محمد حسین کی عملی کوشش اور قلمی کاوش کا نتیجہ نہیں۔

برنیر قلعہ مبارک اور اس کی شاہی تعمیرات کی خوبیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اُن کا تقابل پیرس اور دوسرے مقامات کی خوب صورت عمارتوں سے کرتا ہے۔

ایک سال اس نے مصر میں قیام کیا تھا وہاں سے وہ جدّہ اور سورت وغیرہ مقامات سے ہوتا ہوا آگرہ اور آگرہ سے دہلی پہنچا تھا۔

راقم الحروف نے اس ترجمہ کو اپنی طرف سے بھی ایڈیٹ کیا کہ اس کی زبان بہت قدیمانہ اور بہت سے مقامات پر بہت ڈھیلی ڈھالی نظر آتی ہے۔

قریب چالیس برس کے گزرے کہ شہنشاہِ حال کے والد شاہ جہاں نے اپنی دائمی یادگار کے طور پر پرانی دہلی کے پاس ایک نیا شہر آباد کیا اور اس کا نام اپنے نام پر "شاہجہان آباد" یا اختصار کے ساتھ "جہاں آباد" رکھا اور اس کو دار السلطنت بنانے کے لیے یہ وجہ قرار دی کہ گرمی کی شدت کے سبب آگرہ بادشاہ کے قیام کے لائق نہیں رہا[1] اس سبب سے کہ اس کی تعمیر کے لیے اکثر مصالحہ پرانی دہلی کے آس پاس کے کھنڈروں سے بہم پہنچایا گیا تھا۔ پردیسی آدمی پرانے اور نئے شہر میں تمیز نہیں کرتے، اور دونوں کو "دہلی" ہی کہتے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں یہ نیا شہر اپنے بانی ہی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

دہلی کا حصار

شہر دہلی ایک ہموار زمین پر جمنا کے کنارے ہلالی صورت میں آباد ہے اور اس طرف کے سوا جدھر دریا کی جانب سے (جس پر کشتیوں کا پل بندھا ہوا ہے) محفوظ ہے حفاظت کے

---

[1] شاہجہاں نامہ میں لکھا ہے کہ اس کی ابتدا شاہجہاں کے جلوس کے بارہویں سال مطابق ۱۰۴۸ھ اور ۱۶۳۸ء میں شروع ہوئی تھی اور خافی خاں نے اپنی کتاب منتخب اللباب میں لکھا ہے کہ تاریخوں میں سے جو شعراء نے اسکی بابت کہی تھیں، بادشاہ کو یہ مادہ پسند آیا "شد شاہجہان آباد از شاہجہاں آباد" جسکو صاحب آثار الصنادید اپنی سند پر میر یحییٰ کاشی کا نکالا ہوا بتاتے ہیں۔ (س م ح)

لیے سب طرف پختہ شہر پناہ بنی ہوئی ہے اور ان برجوں سے جو سو سو قدم کے فاصلے پر شہر پناہ کے کنارے بنے ہوئے ہیں اور اس کچے پشتے سے جو قریب چار یا پانچ انچ (فرانسیسی) فٹ کے برابر اونچا ہے، قطع نظر کی جائے تو یہ بہت کچھ نامکمل ہے، کیونکہ نہ تو اس کے گرد خندق ہے، اور نہ کوئی اور بچاؤ کا سامان ہے۔ یہ حصار اگرچہ شہر و قلعہ دونوں پر محیط ہے لیکن اسکی وسعت اتنی نہیں جتنی لوگ خیال کرتے ہیں۔ کیونکہ میں تین گھنٹے کے عرصہ میں اسکے گرداگرد پھر گیا ہوں، حالانکہ میں یہ خیال کرتا ہوں کہ میرے گھوڑے کی چال فی گھنٹہ ۳ میل سے زیادہ نہ تھی۔

شہر کے گرد و نواح کی بہت سی آبادیوں کو جو بہت دور تک لاہوری دروازہ کی جانب بستی چلی گئی ہیں، اس میں شامل نہیں کرتا اور نہ پرانی دلی کے اُس آباد علاقہ کو اور نہ ان تین چار چھوٹی چھوٹی بستیوں کو جو شہر کے نواح میں ہیں۔ کیونکہ ان کو شامل کر لینے سے شہر کی وسعت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ اگر بیچوں بیچ ایک سیدھا خط کھینچا جائے تو ساڑھے چار میل سے زیادہ ہو اور اگرچہ باغات وغیرہ کے بیچ میں آجانے کی وجہ سے میں ٹھیک نہیں کہہ سکتا کہ شہر کا کل دور کس قدر ہے، لیکن کچھ شک نہیں کہ بہت ہی

---

[1] صاحب آثار الصنادید نے کتاب "مراتِ آفتاب نما" کے حوالے سے لکھا ہے کہ سنہ ۲۴ جلوسی مطابق ۱۰۶۱ھ موافق ۱۶۵۰ء شاہ جہاں کے حکم کے بموجب مٹی اور پتھر سے چار مہینے کے عرصہ میں ڈیڑھ لاکھ روپیہ کے خرچ سے یہ فصیل تیار ہوئی۔ مگر دوسرے برس برسات میں اکثر جگہ سے گر پڑی۔ اس واسطے از سر نو چونہ اور پتھر سے بنانے کا حکم ہوا سات برس کے عرصہ میں چار لاکھ روپیہ کے خرچ سے تیار ہو گئی۔ طول اس کا چھ ہزار چھ سو چونسٹھ گز ہے چار گز کی چوڑی اور نو گز کی اونچی ہے اور اس میں ستائیس برج دس گز کے قطرے ہیں۔ ۱۸۰۳ء میں جب سرکار عالیہ انگریزی کا تسلط ہوا تو یہ اکثر جگہ سے ٹوٹ رہی تھی، جس کو بہت خوبی سے درست کرایا گیا اور اجمیری دروازہ کے باہر جو غازی الدین خاں فیروز جنگ پدر نظام الملک آصف جاہ کا مقبرہ تھا جو مدرسہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کو بھی اندر لے لیا گیا اور قریب ۱۸۱۱ء کے اسکے گرد بھی شہر پناہ بنا دی گئی۔

مختصر ہے۔ قلعہ[1] جس میں شاہی محل سرا اور بادشاہی مکانات ہیں، قریباً نصف

(بقیہ حاشیہ) صاحب آثار الصنادید کی تحقیق کے موافق پہلے اس شہر کا نام اندرپت تھا۔ اس باب میں بڑا اختلاف ہے کہ یہ نام بدل کر کب سے دہلی ہوگیا۔ "مرات آفتاب نما" میں لکھا ہے کہ یہ بات مشہور ہے کہ راجہ دلیپ نے جو چندر بنسیوں میں ایک راجہ ہے، اپنے نام پر دلی آباد کی، لیکن یہ بات صحیح نہیں اس واسطے کہ ہندوؤں کی اگلی پوتھیوں میں چندر بنسی راجہ دلیپ کا ذکر ہے، مگر کہیں دہلی کا نام نہیں ——— جہاں بھی لکھا ہے اندرپت ہی لکھا ہے اور تاریخ فرشتہ میں درج ہے کہ ۳۰۷ھ مطابق ۹۱۹ء میں تورروں کے خاندان میں سے ایک راجہ نے شہر اندرپت کے برابر دہلی بسایا اور اسی مصنف نے کتاب "نزہتہ القلوب" کے حوالہ سے لکھا ہے کہ چونکہ وہاں کی زمین نرم تھی اور ہند میں دہلی نرم زمین کو کہتے ہیں، جہاں میخ نہ تھم سکے۔ اس سبب سے وہ بستی دہلی کے نام سے مشہور ہوگئی، مگر اس سنہ میں نہ توروں کی خاندان میں حکومت تھی اور نہ اس سبب سے دہلی کا نام پڑجانا قرین قیاس ہے۔ اس واسطے یہ بات بھی قابل اعتماد نہیں اور مشہورات جو صحیح بھی معلوم ہوتی ہے، یہ ہے کہ بقول صاحب مرات آفتاب نما راجہ دہلو قنوج کے راجہ نے اس سبب سے کہ دلی کے راجہ اکثر قنوج کے تابع رہے ہیں، اندرپت میں اپنے نام پر شہر بسایا اور جب ہی سے اس کا نام دہلی مشہور ہوا۔ بلکہ اصلی نام دہلی کا دہلو ہے۔ جیسا کہ موافق روایت صاحب "جواہر الحروف" امیر خسرو نے جلال الدین خسرو شاہ کو خطاب کرکے دہلو کا لفظ اپنے اس شعر میں باندھا ہے۔

یا بیک اسپم بخش یا زاں چور بفرما بارگی + یا بفرماں وہ کہ گرد دں شیشم دد دہلو روم

راجہ دہلو راجہ پورس یعنی راجہ فور والی کمایوں کا ہم عصر تھا اور اسی کی لڑائی میں مارا گیا اور قنوج تک راجہ فور کا عمل ہوگیا اور اسکے بعد سکندر اعظم نے راجہ فور پر تلیج کے کنارے فتح پائی اور گنگا کے کنارے یعنی قنوج تک عمل کرلیا۔ یہ واقعہ ۳۲۸ء قبل ولادت مسیح علیہ السلام میں ہوا کہ تخمیناً یہی زمانہ دہلی شہر کے بسنے کا معلوم ہوتا ہے۔ (س م ر ح)

---

[1] شاہجہاں نے اپنے جلوس کے بارہویں سال مطابق ۱۰۴۸ھ ۱۶۳۸ء میں شاہجہاں آباد کی آبادکاری کا حکم دیا، اور بارہویں ذی الحجہ کو قلعہ بننا شروع ہوا۔ استاد حامد اور احمد معمار جو اپنے فن میں یکتا تھے، اسکی تعمیر کیلئے مقرر ہوئے۔ پہلے عزت خاں کو اسکا اہتمام ملا اور پانچ مہینے دو دن میں قلعہ کی بنیادیں کھدیں اور کچھ مصالحہ جمع ہوا، اور کہیں کہیں سے بنیادیں اونچی ابھر آئیں۔ پھر الہ وردی خاں کو یہ کام سپرد ہوا —

دائرہ کی شکل کا ہے اور سامنے دریائے جمنا بہتا ہے اور قلعہ کی دیوار اور پانی کے مابین ایک رتیلا وسیع میدان ہے، جس میں ہاتھیوں کی لڑائی دکھائی جاتی ہے اور امیروں اور ہندوؤں راجاؤں کی فوجیں بادشاہ کے ملاحظہ کے واسطے کھڑی کی جاتی ہیں جن کو بادشاہ محل کے جھروکوں میں سے دیکھتا ہے۔

قلعہ کی دیوار اپنی پرانی وضع کے گول برجوں کے لحاظ سے شہر پناہ کے مشابہ ہے، لیکن چونکہ یہ کچھ اینٹ اور کچھ لال پتھر کی بنی ہوئی ہے جو سنگ مرمر کے مشابہ ہے۔ اس سبب سے شہر پناہ کی بہ نسبت زیادہ خوبصورت ہے اور شہر پناہ سے اونچائی چوڑائی اور مضبوطی میں بھی زیادہ ہے اور شہر کے رخ چھوٹی چھوٹی توپیں چڑھی ہوئی ہیں اور دریا کی جانب کے سوا قلعہ کے سب طرف پختہ اور عمیق خندق بنی ہوئی ہے۔ جس کی روکار کے پتھر صاف اور گھڑے ہوئے ہیں اور جو پانی سے بھری رہتی ہے، جس میں کثرت سے مچھلیاں ہیں۔

یہ عمارت مضبوط نظر آتی ہے، لیکن اصل میں کچھ مستحکم نہیں ہے اور میری دانست میں ایک متوسط طاقت کا توپ خانہ اس کو فوراً زمین کے برابر کرسکتا ہے۔ اس خندق کے قریب ہی ایک بڑا باغ ہے جو پھولوں اور پودوں سے ہمیشہ بھرا رہتا۔ اور قلعہ کی عظیم الشان اور سرخ رنگ کی فصیل سے کے مقابل ہونے کی وجہ سے بہت خوش نما معلوم ہوتا ہے اور اس باغ کے متصل ایک بادشاہی چوک ہے، جس کے ایک طرف تو قلعہ کا دروازہ ہے اور

---

۲۴ ربیع الاول ۱۰۵۸ھ مطابق ۱۶۴۸ء یعنی تخت نشینی کے ۲۱ ویں سال میں بادشاہ (حاشیہ بقیہ) نے اس میں پہلا جلوس کیا۔ یہ ہشت پہل بنا ہے اور اس کا طول ایک ہزار گز اور عرض چھ سو گز کا ہے، جس کی کل زمین چھ لاکھ گز ہوئی اور اس حساب سے یہ اکبر آباد کے قلعہ کے دوگنا ہے۔ اس کی فصیل پچیس گز اونچی ہے اور گیارہ گز گہری بنیاد ہے۔ دیوار کا حجم بنیاد سے پندرہ گز اور اوپر سے دس گز کا ہے۔ اس کی خندق جو بیس گز چوڑی اور دس گز گہری بنی ہوئی ہے۔ جس کا محیط تین ہزار چھ سو گز کا ہے۔ اس قلعہ کی تعمیر میں پچاس لاکھ روپیہ خرچ ہوا تھا اور کتاب مرات آفتاب نما میں لکھا ہے کہ کروڑ روپیہ صرف میں آیا تھا۔ یعنی ۵۰ لاکھ قلعہ کے بننے میں اور پچاس لاکھ اسکے اندر کے مکانوں کی تعمیر میں خرچ ہوا تھا۔ (س م ح)

دوسری جانب شہر کے دو بڑے بازار آن کر ختم ہوئے ہیں۔ جو ملازم راجہ، حسب معمول ہفتہ وار چوکی دینے آتے ہیں۔ ان کے خیمے اس چوکور میدان میں لگائے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ کہ ایک قسم کے چھوٹے چھوٹے بادشاہ ہیں۔ قلعہ میں رہنے سے سخت عُذر کرتے ہیں۔

قلعہ کے اندر کا پہرہ امرا اور منصب داروں کا ہوتا ہے اور اسی جگہ صبح کے وقت بادشاہی گھوڑے جو اس کے قریب ہی ایک بڑے اصطبل میں رہتے ہیں، پھرائے جاتے ہیں اور یہیں سواروں کی فوج کا میر بخشی نئے بھرتی ہونے والے سواروں کے گھوڑوں کو دیکھتا بھالتا ہے اور اگر وہ ترکی نسل کے اور اچھے مضبوط اور پیمانہ کے لحاظ سے ہوں تو اُن کی ران پر بادشاہ کا اور اس امیر کا داغ دلوا دیتا ہے، جس کی فوج میں وہ بھرتی ہوئے ہیں اور اس سے یہ فائدہ ہے کہ انہیں گھوڑوں کو دوسرے نئے سوار مستعار لے کر حاضری کے وقت پیش نہیں کر سکتے۔

چھوٹے غیب داں

اسی جگہ انواع و اقسام کی بے شمار چیزوں کی خرید و فروخت کے لیے بازار لگتا ہے۔ جو پیرس کے پونٹ نی آف[1] کی طرح ہر قسم کے گنجانوں، بھان متیوں، ہندو اور مسلمان نجومیوں اور رمالوں کا مرجع ہے اور یہ قابل نجومی دھوپ میں ایک میلا سا قالین کا ٹکڑا بچھائے بیٹھے رہتے ہیں۔ جن کے پاس علم ریاضی کے کچھ پرانے آلات ہوتے ہیں اور سامنے ایک بڑی سی کتاب کھلی رہتی ہے۔ جس میں بارہ برجوں کی شکلیں بنی ہوئی ہوتی ہیں اور اس طور سے یہ راہ چلتے لوگوں کو بھسلاتے اور فریب دیتے ہیں

عوام الناس غیب داں سمجھ کر ان سے رجوع کرتے ہیں اور یہ ایک پیسہ لیکر بیچارے حمقا کو بتاتے ہیں کہ ان کی قسمت میں آئندہ کیا ہوتا ہے اور ان کے ہاتھ اور چہرہ کو خوب دیکھ بھال کر اور کتاب کے ورق الٹ پلٹ کر یقین دلاتے ہیں کہ واقعی یہ کچھ حساب لگا رہے ہیں اور یہ لوگ جس کام کی بابت ان سے سوال کرتے ہیں، اس کے لیے وقت اور ساعت" یعنی مہورت بتاتے ہیں اور نادان عورتیں سر سے پاؤں تک ایک سفید چادر اوڑھ کر اُن کے پاس جمع ہوتی ہیں اور اپنی تمام عمر کے معاملات کے بارے میں

---

[1] ایک بڑے پُل کا نام ہے جو شہر پیرس میں ندی پر بنا ہوا ہے۔ (س م ح)

اُن سے پوچھ گچھ کرتی ہیں اور اپنے تمام دِلی بھید ان سے کہہ دیتی ہیں۔ جس طرح فرانس میں ایک وسواسن عورت اپنے پادری کے پاس جاکر توبہ کے قصد سے اپنے تمام گناہ ظاہر کردیتی ہے اور یہ بیوقوف اور جاہل یقین رکھتے ہیں کہ ستاروں کی تاثیر کا بدل دینا ان لوگوں کے اختیار میں ہے، ان نجومیوں میں سب سے زیادہ مضحکہ خیز ایک دوغلہ پرتگیز تھا۔ جو گوا سے بھاگ آیا تھا۔ یہ مسخرہ بھی اپنا قالین بچھائے بڑی تمکنت سے بیٹھا رہتا تھا اور اس کے پاس آلاتِ نجوم کے بجائے صرف ایک پُرانا جہازی قطب نما تھا،

اس کے علاوہ رومن کیتھلک فرقہ کی نماز کی پرتگیزی زبان میں دو پرانی با تصویر کتابیں تھیں جن کی تصویروں کو کہتا تھا کہ فرنگستان میں برجوں کی صورتیں اسی طرح کی بناتے ہیں۔ ایک دِن فرقہ جیسویٹ کے پیشوا فادر بوزی صاحب نے اس کو اس کام میں مشغول دیکھ کر پوچھا کہ تو یہ کیا کرتا ہے تو اس نے شرمندہ ہونے کی جگہ یہ جواب دیا کہ " ایسے بیوقوفوں کا نجومی ایسا ہی چاہیئے۔" یہ ذکر میں ..ن غریب نجومیوں کا کرتا ہوں جو بازاروں میں دکھائی دیتے ہیں، جو منجم جو امیروں کے پاس آتے جاتے ہیں، وہ ان کو بڑا علامہ سمجھتے ہیں اور اس طرح یہ دولت مند ہو جاتے ہیں، تمام ایشیاء میں یہ بے اصل وہم پھیلا ہوا ہے اور خود بادشاہ اور بڑے۔ بڑے امیران فریبی غیب دانوں کو بڑی بڑی تنخواہیں دیتے ہیں اور بیران کی صلاح کے کوئی ادنیٰ کام بھی شروع نہیں کرتے۔ یہ نجومی گویا آسمان میں لکھی ہوئی باتیں جانتے اور ہر ایک کے .. کرنے کے لیے مبارک گھڑی تجویز کرتے، اور ہر ایک وسوسے کو قرآن سے فال نکال کر حل کردیتے ہیں۔

دہلی کے بازار وہ، دو بڑے بازار جن کا ابھی ذکر ہوگا اور جو اس چوکور میدان میں آکر ملتے ہیں۔ ان کا عرض قریب پچیس یا تیس قدم کے ہوگا اور جہاں تک نظر پہنچتی ہے، وہ سیدھے چلے جاتے ہیں اور ان میں سے جو بازار لاہوری دروازہ کو جاتا ہے وہ بہت لمبا ہے۔ بہ لحاظ وضعِ عمارت یہ دونوں بازار ایک ہی سے ہیں اور جیسا کہ پیرس کا بازار معروف "پلیس رائل" ہے۔ اسی طرح ان کے بھی دونوں جانب کی دوکانیں محرابدار ہیں، مگر اتنا فرق ہے کہ ایک تو اِن کی عمارت خشتی ہے، دوسرے یہ کہ یہ ایک منزلی ہیں

ان کی چھتیں بطور ایک مسطح چبوترے کے کام دیتی ہیں اور یہ بھی تفاوت ہے کہ پیلیس رائل کی دوکانوں کے برانڈے اس قطع کے ہیں کہ ان میں داخل ہو کر انسان بازار کے ایک سرے سے دوسرے تک جا سکتا ہے اور ان کی دوکانوں کے برانڈے علیحدہ علیحدہ ہیں، جن کے بیچ میں دیواریں حائل ہیں، ان میں بیٹھ کر دن کے وقت اہل حرفہ اور صراف اپنا اپنا کام کرتے اور بیوپاری اپنا مال خریداروں کو دکھاتے ہیں۔ ان محرابی برانڈوں کے پیچھے اسباب رکھنے کے لیے کوٹھریاں بنی ہوئی ہیں، جن میں رات کے وقت سب اسباب رکھ دیا جاتا ہے اُوپر بیوپاریوں کے رہنے کے لیے بالاخانے بنے ہوئے ہیں جو بازار کی طرف سے خوبصورت نظر آتے ہیں اور ہوادار اور آرام کے قابل اور گرد و غبار سے محفوظ ہیں اور ان کے گرد و غبار سے محفوظ حصہ جو صحن کے طور پر ہے جو لوگ ان میں رہتے ہیں، وہ رات کو اس میں سوتے ہیں، مگر ان اطراف میں کوٹھریوں کے اُوپر جو بالا خانے بنے ہوئے ہیں .... اکثر ایسے پست ہیں کہ بازار بخوبی دکھائی نہیں دیتے۔ متمول بیوپاری دوکانوں پر نہیں سوتے، بلکہ کام کاج کے بعد اپنے اپنے مکانوں کو جو شہر میں ہیں چلے جاتے ہیں۔

ان دو کے علاوہ پانچ بازار اور ہیں اور اگرچہ ان کی وضع قطع بھی انہیں کے قریب قریب ہے، لیکن ایسے لمبے اور سیدھے نہیں ہیں۔ ان کے علاوہ گلیوں اور کوچوں میں بے شمار بازار ہیں جو ایک دوسرے کو منقطع کرتے ہیں۔ ان میں سے اگرچہ اکثر کے سامنے کی عمارت محرابی طرز کی ہے مگر چونکہ وہ ایسے لوگوں کے بنائے ہوئے ہیں، جن کو عمارت کے تناسب کا کچھ خیال نہ تھا۔ اس لیے ان بازاروں میں بہت کم ایسے خوش قطع اور سیدھے اور عریض ہیں جیسے کہ وہ بازار ہیں جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔

رہائشی مکان — شہر کے گلی کوچوں میں جو منصب داروں — حکام عدالت — دولتمند تاجروں اور رئیس لوگوں کے مکانات ہیں۔ ان میں بھی بہت سے اچھے خاصے خوش قطع ہیں، مگر اینٹ یا پتھر کے بنے ہوئے مکان بہت تھوڑے ہیں۔ کچے اور خس پوش ہیں وہ بھی اچھے لمبے اور مضبوط بانس کے چھپروں سے بنائے ہوئے اور کہگل اور سفیدی

کیے ہوئے ہیں اور یہ بے شمار خس پوش اور چھوٹے چھوٹے مکانات جو بڑے بڑے مکانات کے ساتھ خلط ملط ہیں، ان میں معمولی فوجی سوا اَن گنت نفر خدمت گار، اور نان بائی وغیرہ [جو بادشاہ اور لشکر کے ساتھ جایا کرتے ہیں] رہتے ہیں اور ان کے سبب سے اکثر شہر میں آگ لگ جاتی ہے۔ چنانچہ پچھلے برس تین بار ایسی آگ لگی کہ تیز ہوا کے سبب سے جو گرمی کے موسم میں چلا کرتی ہے، قریباً ساٹھ ہزار چھپروں پر پانی پھر گیا اور چند اونٹ اور گھوڑے اور بہت سی پردہ دار عورتیں بھی جل بھن گئیں، کیونکہ یہ بیچاریاں ایسی شرمیلی اور اپاہج ہوتی ہیں کہ نامحرم لوگوں سے منھ چھپانے کے سوا ان سے کچھ بن ہی نہیں آتا، چنانچہ جو عورتیں اس صدمہ سے ہلاک ہوئیں وہ اتنی ہمت نہ رکھتی تھیں کہ بھاگ کر بچ جائیں۔ ان کچے اور خس پوش مکانوں کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ یہ خیال ہوتا ہے کہ سوائے اتنے فرق کے کہ آرام کے بعض سامان اس میں زیادہ ہیں۔ دہلی گویا چند دیہاتوں کا مجموعہ یا فوج کی چھاؤنی ہے۔

امراء کے مکان اکثر دریا کے کنارے اور شہر کے باہر ہیں۔ اس گرم ملک میں اسی مکان کو عمدہ سمجھتے ہیں جس میں سب طرح کا آرام ہو۔ اور سب طرف کی اور خاص کر شمال کے جانب کی ہوا آتی ہو۔ چنانچہ وہ مکانات عمدہ سمجھے جاتے ہیں، جن میں ایک اچھا صحن اور باغیچہ اور درخت اور حوض ہو اور دالان کے اندر یا دروازہ میں چھوٹے چھوٹے فوارے لگے ہوں، اور خوبصورت تہہ خانے ہوں جن میں بڑے بڑے پنکھے لگے ہوئے ہوتے ہیں اور اپنی خنکی کی وجہ سے گرمی کے دنوں میں، دو پہر سے چار یا پانچ بجے تک جب کہ ہوا ایسی گرم ہوتی ہے کہ سانس نہیں لیا جا سکتا، یہ بہت آرام کی جگہ ہوتی ہے، مگر تہ خانوں کی بہ نسبت اکثر لوگ خس خانوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں جو چھوٹے چھوٹے پاکیزہ کمرے ہوتے ہیں جو ایک قسم کی گھاس کی خوشبودار جڑوں سے بنائے جاتے اور چمن کے اندر اس غرض سے حوض کے قریب لگائے جاتے ہیں کہ خدمت گار لوگ چمڑے کی ڈولچیوں سے ان پر باہر کی طرف سے آسانی کے ساتھ پانی چھڑک سکیں۔ اور اس قطع کا مکان سب سے عمدہ خیال کیا جاتا ہے، جس کے چاروں طرف قدِ آدم اونچے دالان ہوں، جن میں چاروں طرف کی ہوا آتی ہو اور ایک بڑے چمن کے اندر بنا ہو ... اور فی الواقع کوئی عمدہ مکان ایسا نہیں ہے جس میں گھر والوں

کے سونے کے لیے صحن اور چبوترہ نہ ہو، جہاں سے، بارش یا آندھی کے وقت، یا جب صبح کو سرد ہوا چلنے یا شبنم پڑنے لگتی ہے، پلنگ کو سرکا کر اندر لے لیا جاتا ہے۔ یہ شبنم اگرچہ زیادہ نہیں ہوتی، مگر بدن میں سرائت کر جاتی ہے، جس سے اکثر ہاتھ پاؤں اکڑ جاتے ہیں۔

اچھے گھروں میں نشست کا یہ طریقہ ہے کہ فرش کے اوپر روئی کا ایک بھاری اور قریب چار انگل کے موٹا گدیلا بچھا رہتا ہے، جس پر گرمی کے دنوں میں عمدہ سفید کپڑا (چاندنی) اور جاڑوں میں ریشمی قالین بچھاتے ہیں اور صاحب خانہ اور معزز اور ممتاز لوگ، جو ملاقات کو آتے ہیں، اس پر بیٹھتے ہیں۔ اور دالان کے صدر میں ایک دو گدیلے بچھے رہتے ہیں، جن پر ریشم کے ہلکے کام کی سوزنی پڑی رہتی ہے، جس پر سنہری اور روپہلی زری کی دھاریاں بنی ہوئی ہوتی ہے

گدیلے پر کمخاب کا ایک گاؤ تکیہ بھی لگا رہتا ہے اور اس کے علاوہ اہلِ مجلس کے آرام کے لیے دالان کے گرداگرد کمخاب اور مخمل اور پھولدار ریشمین کپڑے کے غلافوں کے چند اور تکیے بھی لگے رہتے ہیں اور دالان کے چاروں طرف، زمین سے قریب دو یا ڈیڑھ گز اونچے، بہت معقول اور با قرینہ مختلف شکل کے طاق بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان میں عمدہ عمدہ چینی کے برتن اور گلدان رکھے جاتے ہیں اور دالان کی چھت منقّش اور ملمّع کاری کی ہوتی ہے، مگر انسان یا کسی اور جان دار شے کی تصویر اس پر نہیں ہوتی، کیونکہ یہ مذہب اسلام میں ممنوع ہے۔

یہ ہندوستان کے ایک عمدہ مکان کا تقریباً صحیح خاکہ ہے اور دہلی میں ایسے مکانات بہت سے موجود ہیں اور میں فرنگستان کے مکانوں کی رو سے صرف نظر کر کے بلا اندیشہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کے دار السلطنت کی عمارتیں اگرچہ فرنگستانی عمارتوں سے کسی طرح کی بھی مشابہت نہیں رکھتیں ـــ تاہم خوبصورتی سے خالی نہیں۔ جو چیز کہ فرنگستان کے شہروں کی زینت و زیب کا باعث ہے، وہ خوشنما اور شاندار دکانیں ہیں، جو دہلی میں نہیں ہیں اور اگرچہ یہ شہر ایک عالی شان اور طاقتور بادشاہ کے دربار کا مقام ہے، جہاں لازمی طور پر

ہر قسم کی بیش قیمت اشیاء کا جمع ہو جانا ایک ضروری امر ہے۔ تاہم کوئی ایسا بازار یہاں نہیں ہے جیسا ہمارا سینٹ ڈینیس" ہے جس کا مقابل اور ہمسر غالباً تمام ایشیا میں نہ ہوگا۔

دہلی کی دکانیں

یہاں بیش قیمت مال اکثر مال خانوں میں دھرا رہتا ہے اور فرنگستان کی طرح دکانیں بھڑک دار اور بیش قیمت اسباب سے شاذو نادر ہی آراستہ نظر آتی ہیں اور اگر ایک دوکان میں پشمینہ کمخاب اور زر کار مندیلیں اور ریشمین کپڑے وغیرہ ہیں تو پاس ہی کوئی پچیس دوکانوں میں گھی تیل دال، چاول، گیہوں جو وغیرہ بے شمار قسم کے اناج (جو نہ صرف ہندوؤں کی معمولی غذا ہے، جو کبھی گوشت نہیں کھاتے بلکہ غریب مسلمان اور بہت سے سپاہی بھی یہی کھاتے ہیں) ٹوکروں میں بھرے ہوئے دھرے نظر آتے ہیں۔

البتہ ایک بازار ایسا ہے جس میں میوہ کھلا رکھا رہتا ہے اور اس میں بہت سی دکانیں ہیں جو گرمی کے موسم میں ایران، بلخ بخارا اور سمرقند کے خشک میووں، بادام، پستہ، فندق، کشمش اور زرد آلو اور جاڑوں میں یہ اور سفید نہایت عمدہ اور تازے انگوروں (جو روئی کی تہہ میں لگائے ہوئے ان ملکوں سے آتے ہیں) ناشپاتی اور تین چار قسم کے سیب اور نہایت عمدہ سردوں سے (جو جاڑوں بھر بکتے رہتے ہیں) بھری رہتی ہیں، مگر یہ میوے بہت مہنگے بکتے ہیں ——— ایک سردہ پونے چار روپیہ کو آتا ہے۔ ..! باایں ہمہ اہلِ دہلی کو سب سے زیادہ مرغوب اور پسند ہے۔ امراء کے ہاں میوہ کثرت سے خریدا جاتا ہے چنانچہ مجھے یاد ہے کہ میرے "آغا" کے ہاں اکثر صبح کے کھانے کے موقعہ پر کوئی پچاس روپیہ کا میوہ صرف میں آتا تھا۔

گرمی کے موسم میں خربوزہ بہت سستا ہوتا ہے لیکن زیادہ لذیذ نہیں ہوتا اور بجز اس کے کہ ایران سے بیج منگا کر ایک اچھی اور کمائی ہوئی زمین میں بویا جائے جیسا امراء اکثر کرتے ہیں، عمدہ خربوزہ میسر نہیں آتا بہر حال اس پر بھی اچھا اور عمدہ خربوزہ کمیاب ہے۔ کیونکہ یہاں کی زمین موافق نہیں ہے اور ایک سال بعد یہ تخم بھی بگڑ جاتا ہے۔

گرمی کے موسم میں آم دو مہینے تک رہتے ہیں اور بہت کثرت سے اور سستے ملتے ہیں۔

—— دہلی میں جو آم پیدا ہوتا ہے، وہ نہ تو کچھ اچھا ہی ہے اور نہ کچھ برا اور سب سے عمدہ آم بنگالہ، گول گنڈا اور گوا سے آتا ہے۔ جو فی الواقع نہایت عمدہ ہوتا ہے اور کوئی مٹھائی اس کی شیرینی اور خوشبو کو نہیں پہنچتی۔ تربوز سال بھر رہتا ہے، لیکن دہلی میں جو پیدا ہوتا ہے، وہ نرم اور بے مزہ ہے، اور رنگت بھی اچھی نہیں ہوتی۔ البتہ کبھی کبھی امراء کے ہاں اچھا کھانے میں آتا ہے، جو باہر سے بیج منگوا کر بڑی احتیاط اور خرچ سے اُگواتے ہیں۔

شہر میں حلوائیوں کی دکانیں کثرت سے ہیں، لیکن مٹھائی اچھی نہیں بنتی، گرد اور شہد کی مکھیوں سے بھری رہتی ہے۔ نان بائی بھی بے شمار ہیں، مگر ان کے تنور ہمارے ہاں کے تنوروں سے مختلف وضع کے ہیں اور بہت بڑے ہیں اور اس سبب سے روٹی نہ تو عمدہ ہوتی ہے اور نہ خوب سکی ہوئی، البتہ جو روٹی قلعہ میں پکتی ہے، وہ کسی قدر اچھی ہوتی ہے امراء تو اپنے گھر پر ہی تیار کرا لیتے ہیں اور اس وجہ سے نہایت عمدہ ہوتی ہے۔ اس میں دُودھ مکھن اور انڈا خوب ڈالا جاتا ہے اور اگرچہ خوب پھول جاتی ہے مگر مزا جلی ہوئی کا سا ہوتا ہے اور زیادہ تر کیک جیسی ہوتی ہے اور پیرس کی "گانس" اور دوسری روٹیوں کو ہرگز نہیں پہنچتی۔

اگرچہ بازار میں کئی قسم کے کباب اور قلیہ وغیرہ بکتا ہے، لیکن اس کا کچھ اعتبار نہیں کہ کس جانور کا گوشت ہے، کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ کبھی کبھی اونٹ یا گھوڑے، یا قریب المرگ بیل کا گوشت بھی ہوتا ہے۔ غرض کوئی کھانا جو گھر میں تیار نہ ہو، صحت کے لیے مفید نہیں ہے۔

—— دہلی کے ہر گلی کوچے میں گوشت بکتا ہے، لیکن بکری کے گوشت کی جگہ دھوکے سے بھیڑ کا گوشت بھی دیدیتے ہیں، پس اس فریب سے بچنے کے لیے ہوشیار رہنا چاہیئے۔ بیل کا گوشت اور خاص کر بھیڑ کا، اگرچہ مزے میں برا نہیں ہوتا، مگر گرم ذرا زیادہ ہوتا ہے۔ نفخ پیدا کرتا اور دیر ہضم ہوتا ہے۔ حلوان کا گوشت سب سے عمدہ ہوتا ہے، مگر چونکہ بازار میں شاذو نادر ہی ملتا ہے، اس لیے زندہ جانور ہی خریدنا پڑتا ہے۔

بڑی دقت یہ ہے کہ اس ملک میں صبح کا گوشت شام تک نہیں ٹھہرتا۔ دوسرے یہ کہ جانور دُبلے ملتے ہیں اور اس وجہ سے گوشت بے مزہ ہوتا ہے اور قصائیوں کی دکانوں میں دُبلی

بکریوں کا گوشت ملتا ہے جو اکثر سخت ہوتا ہے، لیکن خصوصیت سے میرا اس بارے میں شکایت کرنا نامناسب ہے، کیونکہ جب سے کہ میں ان لوگوں کے رویہ سے واقف ہو گیا ہوں، ایسا کم اتفاق ہوا ہے کہ مجھ کو روٹی یا گوشت اچھا نہ ملا ہو۔ چنانچہ میں خاص بادشاہی باورچی خانہ کے داروغہ کے پاس میں اپنا نوکر بھیج دیتا ہوں اور وہ خوشی سے عمدہ کھانا دیدیتے ہیں۔ جس پر ان کی لاگت اگرچہ کم لگی ہوتی ہے، مگر میں برضامندی ایک اچھی قیمت ادا کرتا ہوں۔ چنانچہ میرا "آغا" مجھ سے یہ بات سن کر ہنسا کہ میں برسوں سے چوری اور چالاکی سے اپنا گذارہ کرتا ہوں۔ ورنہ پونے چار سو روپیے میں جو مجھے آپ کی سرکار سے ملتے ہیں، فاقوں کے مارے مرجاتا۔ حالانکہ فرانس میں صرف آٹھ آنہ روز میں ایک بادشاہ کا سا کھانا کھا سکتا ہوں۔

مچھلی اور پرندے

خصی مرغ دہلی میں بالکل نہیں دکھائی دیتا۔ کیونکہ اس ملک کے لوگ جانوروں پر عموماً رحم کرتے ہیں، اگرچہ انسانوں پر رحم نہیں کرتے۔ جن کو محل سرا کے کام کے لئے خوجہ بناتے ہیں۔ ... پرند جانور کثرت سے بازار میں بکتے ہیں۔ اور اچھے اور سستے بھی ہیں۔ چنانچہ ایک چھوٹی قسم کی مرغی جس کا چمڑہ سیاہ ہوتا ہے اور جس کا نام میں نے "حبشی" رکھا ہے، وہ بھی بکتی ہے۔ کبوتر بھی ملتے ہیں، مگر بچے نہیں ملتے۔ کیونکہ ہندوستان کے لوگ بچوں کا مار ڈالنا بے رحمی کا کام سمجھتے ہیں۔ تیتر بھی ملتے ہیں، مگر ہمارے ملک کے تیتر سے چھوٹے ہوتے ہیں اور اس سبب سے کہ جال میں پکڑ کر دور دور سے زندہ لاتے ہیں، ایسے اچھے نہیں ہوتے جیسے کہ اور پرند ہوتے ہیں۔ یہی کیفیت مرغابیوں اور خرگوشوں کی ہے جو زندہ پکڑے جا کر پنجرے بھرے ہوئے شہر میں آتے ہیں۔

ماہی گیر اپنے پیشہ میں ہوشیار نہیں ہیں، لیکن بعض اوقات اچھی مچھلی بھی بکتی ہے۔ خصوصاً "سنگھاڑا" اور "روہو" جو اپنے ہاں کی پائک اور کارپ کی شکل کی ہوتی ہیں۔ مگر جاڑوں میں ماہی گیر مچھلی کم پکڑتے ہیں، کیونکہ اس ملک کے لوگ سردی سے اس سے بھی زیادہ ڈرتے ہیں جتنا کہ اہلِ فرنگ گرمی سے خوف کھاتے ہیں اور اگر اس موسم میں اتفاق سے کوئی مچھلی آجاتی ہے تو خواجہ سرا اس کو فوراً خرید لیتے ہیں، کیونکہ وہ خاص طور سے

اس کے شائق ہیں اور مجھے معلوم نہیں کہ اس کا سبب کیا ہے۔ امرا کوڑے کے زور سے جو ہمیشہ ان کے دروازہ پر لٹکتا رہتا ہے، ان کو ہر ایک موسم میں مچھلی پکڑنے کو بھیجتے ہیں۔

آپ میرا یہ بیان سُن کر غور فرما سکتے ہیں کہ کیا کوئی مچھلی خور شخص

بادۂ فرنگ

پیرس کو چھوڑ کر دہلی کی سیر کے لیے خوشی سے آئے گا، بے شک امیروں اور دولت مند لوگوں کو ہر ایک شے میسر ہے لیکن یہ صرف ان کے ملازموں کی کثرت اور کوڑے اور روپیہ کے باعث سے ہے۔ دہلی میں متوسط الحال شخص کوئی نہیں ہے یا تو بڑے بڑے عالی مرتبہ لوگ ہیں یا ایسے ہیں جن کی زندگی مصیبت سے بسر ہوتی ہے۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ میری تنخواہ بھی معقول ہے اور میں خرچ بھی کرتا ہوں

بعض اوقات حسب دل خواہ کھانا نہیں ملتا۔ وجہ یہ کہ اچھی چیز بازار میں نہیں ملتی اور اکثر وہی چیزیں ملتی ہیں، جن کو اُمرا نے ناپسند کر کے چھوڑ دیا ہو۔ شراب جو فرنگستان میں کھانے کا بڑا جزو سمجھی جاتی ہے۔ دہلی کی کسی دکان میں نہیں ملتی اور اگرچہ دیسی انگور کی بن سکتی ہے، لیکن شرع اسلام اور شاستر کی رُو سے ممنوع ہے۔ چنانچہ میں نے احمد آباد اور گول کنڈہ میں بعض ڈچ اور انگریزوں کے گھروں میں مے پی تھی۔ جو بدمزہ نہ تھی اور سلطنتِ مغلیہ میں اگر کبھی عمدہ شراب ملتی ہے تو وہ شیرازی یا جزائر کناری کی ہوتی ہے۔

چنانچہ شراب شیرازی تو ایران سے خشکی کی راہ سے بندر عباس میں پہنچ کر بذریعہ جہاز سورت میں آتی ہے۔ جہاں سے چھیالیس دن کے عرصہ میں دہلی میں پہنچ جاتی ہے۔ اور جزائر کناری سے ڈچ لوگ سورت میں لاتے ہیں لیکن یہ دونوں قسم کی شرابیں اس قدر گراں قیمت ہیں کہ بقول اس ملک کے لوگوں کے، ان کی قیمت ان کے مزے کو بے لطف کر دیتی ہے چنانچہ ایک بڑا شیشہ جو تین انگریزی بوتلوں کے برابر ہوتا ہے، پندرہ یا سولہ روپیہ سے کم کو ہرگز نہیں آتا اور جو شراب خاص اس ملک میں بنتی ہے اور جس کو یہاں عرق کہتے ہیں، ایک قسم کی تیز اور تند شراب ہے جو گڑ سے بھپکے میں کھینچ کر بناتے ہیں، مگر اس کی فروخت کی بھی سخت ممانعت ہے اور سوائے عیسائی مذہب کے لوگوں کے علانیہ کوئی شخص نہیں

پی سکتا، مگر یہ عرق ویسا ہی تند و تیز ہے جیسا کہ پولینڈ کے ملک میں اناج سے بناتے ہیں اور اگر اس کو تھوڑا سا بھی زیادہ استعمال کیا جائے تو لاعلاج اعصابی امراض اس سے پیدا ہوتے ہیں۔ پس عقلمند آدمی یہاں یا تو صرف خالص پانی پینے کی عادت رکھے گا یا نہایت عمدہ لیمو کے شربت کی جو تھوڑی سی قیمت میں میسر آجاتا ہے اور کچھ ضرر نہیں کرتا۔ اصل یہ ہے کہ اس گرم ملک میں بہت ہی کم لوگوں کو شراب کی خواہش زیادہ ہوتی ہے اور کچھ شبہ نہیں کہ یہ اپنی شراب نہ پینے کی عادت اور پسینہ کے بکثرت آتے رہنے کی وجہ سے بہت سی بیماریوں مثلاً نقرس، سنگ مثانہ اور امراض گردہ اور زکام نزلہ اور چوتھے تپ کو جانتے بھی نہیں۔ جو لوگ ان امراض کے شاکی یہاں آتے ہیں۔ جیسا کہ خود میرا حال تھا، وہ بہت جلد بالکل اچھے ہو جاتے ہیں اور اعضائے تناسل کی بیماریاں بھی جو اس ملک میں بکثرت ہیں اور ملکوں کی طرح نہ تو سخت ہی ہوتی ہیں اور نہ ویسے بُرے نتیجے ہی پیدا کرتی ہیں۔ البتہ اس ملک کے لوگ اکثر تندرست رہتے ہیں لیکن ویسی ہمت اور جرأت نہیں رکھتے جیسے کہ ہمارے ملک کے لوگوں میں ہے اور جسم اور طبیعت کی کمزوری اور کاہلی جو ملک کی نہایت درجہ کی گرمی کا نتیجہ ہے ایک ایسی بیماری سمجھنی چاہیئے، جس میں ہر ایک شخص مبتلا ہے۔ اور جو فرنگستان کے لوگوں پر جو گرمی کے برداشت کے عادی نہیں ہیں، خصوصیت کے ساتھ اثر کرتی ہے۔

صناعی اور کاریگری

دہلی میں ہنرمند کاریگروں کے کارخانے بالکل نہیں ہیں، اس کا سبب یہ نہیں کہ ہندوستانی لوگ صناعی اور کاریگری کی لیاقت نہیں رکھتے۔ کیونکہ ہندوستان کے ہر ایک حصے میں بہت سے ہوشیار اور ذہین لوگ پائے جاتے ہیں اور بے شمار خوبصورت چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں، جن کو لوگ بغیر کلوں کے بناتے ہیں اور جنھوں نے شاید کسی استاد سے بھی تعلیم نہیں پائی ہوتی اور بعض اوقات تو یہ لوگ یورپ کی چیزوں کی ایسے کامل طور سے نقل کرتے ہیں کہ اصل اور نقل میں فرق کرنا دشوار ہوتا ہے۔ چنانچہ منجملہ اس قسم کی اور اشیاء کے نہایت عمدہ شکاری بندوقیں ہیں اور سونے کے زیور تو ایسے عمدہ بناتے ہیں کہ کوئی یورپین سنار اُن سے بڑھ کر شاید

ہی بنا سکے۔

مصوری اور نقاشی کا بھی ایسا نازک اور باریک کام تیار کرتے ہیں کہ جسے دیکھ کر میں اکثر حیرت میں پڑ گیا ہوں۔ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کی بڑی بڑی مہموں کی ایک شبیہہ جو ایک مشہور اور نامی مصوّر نے ایک ڈھال پر سات برس کے عرصہ میں تیار کی تھی اس نے خصوصیت سے مجھ کو حیران کر دیا اور میں نے اس کو ایک عجیب کام خیال کیا۔ مگر ہندوستانی مصور اکثر تصویر میں تناسب اعضاء اور ان حالتوں کے ظاہر کرنے میں جو مختلف اوقات میں انسان کے چہرے پر نمایاں ہوا کرتی ہیں، کچے ہیں، لیکن اگر ان کو کوئی اچھا استاد اس فن کے اصول کی تعلیم دے تو یہ عیوب جلد رفع ہو سکتے ہیں۔

ہندوستان کے اس دارالسلطنت میں دست کاری اور ہنرمندی کے اس اعلیٰ قسم کے نمونوں کا نہ پایا جانا لوگوں کی کند ذہنی اور نا قابلیت کی وجہ سے نہیں ہے، اور اگر کاریگروں اور کارخانہ داروں کی کچھ ہمت افزائی جائے تو بے شک مفید اور عمدہ صنعتوں اور حرفوں کو ترقی ہو سکتی ہے، لیکن ان بے چاروں کو واجبی اجرت بھی نہیں ملتی، بلکہ ان کے ساتھ سختی برتی جاتی ہے اور دولتمند لوگ ہر ایک چیز ارزاں قیمت پر لینی چاہتے ہیں، اور کسی امیر یا منصب دار کو کسی کاریگر کی ضرورت ہوتی ہے تو بازار سے بلوا لیتا ہے اور بشرط ضرورت بیچارے سے جبراً کام لیتا ہے اور چیز کے تیار ہو جانے پر اس کی خوبی کے لحاظ سے نہیں، بلکہ صرف اپنی اٹکل سے جو قیمت چاہتا ہے دیدیتا ہے اور کاریگر کوڑوں کی مار سے بچ جانے کو ہی غنیمت سمجھتا ہے۔ پس اس حالت میں کیونکر ممکن ہے کہ کاریگر اور کارخانہ دار لوگ ایک دوسرے سے بڑھ کر ہنر دکھانے میں سعی کریں، بلکہ اُن کو تو شہرت اور ناموری پیدا کرنے کی کوشش کے بجائے صرف یہ فکر رہتی ہے کہ اس سے جلدی پیچھا چھوٹ جائے اور اس قدر ضرور مل جائے جس میں اوقات بسر ہو جائے۔

صرف وہی کاریگر اپنے فن میں کسی قدر کمال پیدا کرتے ہیں جو بادشاہ یا کسی صاحبِ اقتدار امیر کے نوکر ہیں اور صرف اپنے آقا کے لیے کام تیار کرتے ہیں۔

لال قلعہ قلعہ میں محل سرائے شاہی نیز دوسرے اور محل ہیں، لیکن آپ یہ گمان کریں ویسے ہی ہیں جیسے کہ لوائر یا اسکیوریل[1] ہیں، بلکہ ان کی کوئی چیز بھی فرنگستان کی عمارت کے مشابہ نہیں ہے اور جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا ہے، مشابہ ہونا چاہئے بھی نہیں، کیونکہ ان کے لیے اس ملک کی آب وہوا کے موافق عمدہ اور شان دار ہونا ہی کافی ہے۔

قلعہ کے دروازے قلعہ کے دروازے کی عمارت میں کوئی قابل الذکر چیز نہیں ہے۔ بجز اس کے کہ پتھر کے دو بڑے ہاتھی بنا کر دونوں جانب کھڑے کیے ہوئے ہیں جن میں سے ایک پر چتوڑ کے مشہور و معروف راجہ جیمل کی مورت ہے، اور دوسرے پر اس کے بھائی فتا کی۔ جو دونوں بڑے بہادر اور شجاع شخص تھے اور ان کی ماں ان سے بھی زیادہ دلیر تھی اور جو شہنشاہ اکبر سے اس طرح جان توڑ کر لڑے تھے کہ ابد الآباد تک ان کا نام رہے گا۔ اس عظیم الشان بادشاہ نے جب ان کے شہر کو آن کر گھیر لیا تو یہ بڑے استقلال کے ساتھ اس سے مقابل ہوئے اور بجائے اس کے کہ اپنے دشمن کی جس کو اپنے زور اور قوت پر بڑا گھمنڈ تھا، اطاعت قبول کریں، اپنی اور اپنی ماں کی جان اپنے ملک پر قربان کر ڈالی اور یہ ان کی بے مثل جان بازی کی ہی وجہ سے تو ہے کہ ان دشمنوں نے بھی یادگار کے طور پر ان کی مورتیوں کا قائم رکھنا مناسب خیال کیا۔ یہ ہاتھی جن پر یہ دونوں بہادر سوار ہیں بڑے شان و شکوہ کے ہیں اور ان کو دیکھ کر رعب اور ادب کا ایک ایسا خیال مجھ پر چھا گیا جس کو میں بیان نہیں کر سکتا۔[2]

---

[1] یہ بادشاہی محل ہیں جس میں پہلا فرانس میں اور دوسرا اسپین میں ہے۔

[2] مآثر عالمگیری میں لکھا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے گیارہویں جلوس مطابق ۱۰۷۹ھ میں پتھر کے دو پورے قد کے ہاتھی جو نہایت عمدہ صنعت سے بنے ہوئے اور دروازہ قلعہ کے دونوں جانب نصب تھے اور اسی وجہ سے اس دروازہ کو ہتھیا پول کہتے تھے شریعت کے لحاظ سے ہٹوائے تھے۔ نعمت خاں عالی نے اپنی مشہور کتاب وقایع میں انی رانے

اس دروازے سے قلعہ میں داخل ہو کر ایک لمبا اور وسیع راستہ ملتا ہے۔ جس کے بیچوں بیچ پانی کی ایک نہر جاری ہے اور دونوں جانب پانچ یا چھ فرانسیسی فٹ اونچا اور چار فٹ چوڑا اس طرح کا چبوترہ بنا ہوا ہے جیسا کہ پیرس کا پونٹ نی آف ہے، جس کو چھوڑ کر دونوں طرف اخیر تک برابر برابر دالان بنتے چلے گئے ہیں۔ جن میں مختلف کارخانوں کے داروغہ اور دوسرے کم درجہ کے عہدیدار بغیر اس کے گھوڑے اور آدمی جو نیچے آتے جاتے ہیں، ان سے اُن کو کچھ تکلیف پہنچے، بیٹھے ہوئے اپنا اپنا کام کیا کرتے ہیں، اور منصب دار جورات کو چوکی دینے آتے ہیں، وہ بھی اسی چبوترہ پر ٹھہرتے ہیں۔

قلعہ کے درمیان سے ایک نہر گذرتی ہے جس نہر کا پانی اوّل محل سرا میں جاتا ہے اور پھر موقعہ بموقعہ سب مکانوں میں پہنچتا ہے اور اس کے بعد قلعہ کی خندق میں جا گرتا ہے اور یہ دہلی سے پندرہ یا اٹھارہ میل کے فاصلہ پر جمنا میں سے نکالی گئی ہے، اور بڑی خندق سے میدان اور سخت پہاڑی زمین پر سے لائی گئی ہے[1]

(حاشیہ بقیہ) نامی صیغۂ حساب تنخواہ کے ایک عہدیدار کی ہجو میں بھپتی کے طور پر جو یہ شعر لکھا ہے ؎

آں صورتِ مہاوتِ فیلانِ ہتھیا پول

پارا چہ فیل بند حساب وکتاب کرد

اس سے بھی ان ہاتھیوں اور ہتھیا پول کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ اگر یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ہتھیا پول قلعہ شاہجہاں آباد کے کون سے دروازہ کا نام تھا۔ صاحب آثار الصنادید نے ان ہاتھیوں کو نقارخانہ کے دروازہ کے آگے بنایا ہے اور لکھا ہے کہ اس دروازے کو اسی سبب سے ہتھیا پول کہتے تھے۔ پس صحیح بات وہی ہے جو ڈاکٹر برنیر اور صاحب مآثر عالمگیری نے اپنی آنکھوں دیکھی ہوئی لکھی ہے (س م ح)

[1] صاحب آثار الصنادید نے کتاب "مرآت آفتاب نما" کے حوالہ سے اس نہر کی بابت یہ لکھا ہے کہ اول اس کو سلطان جلال الدین فیروز خلجی نے ۹۱۰ھ مطابق ۱۲۹۱ء میں پرگنہ حضر آباد میں دریا سے کاٹ کر بتیس کوس تک پرگنہ سفیدوں میں جہاں اس کی شکارگاہ

قلعہ کے دوسرے دروازہ کے اندر بھی ایک لمبی اور خاصی چوڑی سڑک ہے اور اس کے بھی دونوں جانب ویسے ہی چبوترے ہیں، لیکن محرب دار دالان کے بجائے دکانیں بنی ہوئی ہیں اور سچ پوچھیے تو یہ ایک بازار ہے، جو لداؤ چھت کی وجہ سے، جس میں اوپر کی طرف روشنی اور ہوا کے لیے بڑے بڑے گول گول روشن دان بنے ہوئے ہیں اور گرمی اور برسات میں بہت آرام دہ ہے۔ ان دونوں سڑکوں کے سوا دائیں بائیں اور بھی چھوٹی چھوٹی سڑکیں ہیں جو ان مکانات کی طرف جاتی ہیں جہاں معمول کے موافق امرا باری باری ہفتہ میں ایک رات دن چوکی دیا کرتے ہیں۔ یہ مکانات جہاں امرا چوکی دیتے ہیں، اچھے عمدہ ہیں، کیونکہ یہ لوگ ان کو اپنے خرچ سے آراستہ رکھتے ہیں اور یہ سب بڑے بڑے دیوان خانے ہیں اور ان کے سامنے باغیچے ہیں جن میں چھوٹی چھوٹی نہریں اور حوض اور فوارے بنے ہوئے ہیں۔ جس امیر کی نوکری ہوتی ہے، اس کے لیے کھانا بادشاہی خاصے میں سے آتا ہے، جس کے آنے کے وقت امیر کو ادائے شکر کے لیے بادشاہی محل کی طرف رخ کرکے تین دفعہ تسلیمات بجالانا یعنی زمین تک ہاتھ لے جاکر ماتھے تک لانا ہوتا ہے۔ ان کے سوا مختلف مقامات میں سرکاری دفتروں کے لیے بہت سے دیوان خانے بنے ہوئے اور خیمے لگے ہوئے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ) تھی، لاکر چھوڑ دیا تھا۔ پھر کسی بادشاہ کو اس کا خیال نہ رہا اور یہ بند ہوگئی۔ سنہ ۹۹۶ھ مطابق ۱۵۶۱ء میں شہنشاہ اکبر کے عہد میں شہاب الدین احمد خاں صوبہ دار دہلی نے اس کو پھر صاف کرایا اور اپنی جاگیر تک لایا اور نہر شہاب اس کا نام رکھا، مگر ایک مدت بعد پھر بند ہوگئی اور سنہ ۱۰۴۰ھ مطابق ۱۶۳۸ء میں شاہجہاں کے حکم سے سفیدوں تک پھر صاف کی گئی اور وہاں سے آگے شاہجہاں آباد تک نئی نہر کھودی گئی اور جب قلعہ بن چکا تو قلعہ اور شہر میں جاری ہوئی۔ ایک عرصہ بعد اس کا پھر وہی حال ہوگیا تھا جو تخمیناً سنہ ۱۸۲۰ھ مطابق ۱۲۳۶ھ میں سرکار عالیہ انگریزی نے اسکو پھر جاری کیا اور آج تک یعنی جولائی سنہ ۱۸۸۵ء مطابق ماہ شوال سنہ ۱۳۰۲ھ نہایت خوبی سے صفائی سے جاری اور نہر جمن شرقی کے نام سے معروف ہے۔ (س م ح)

کارخانہ جات قلعہ ان میں سے جن بڑے دالانوں میں کاریگر بیٹھتے ہیں، وہ مختلف کارخانوں کے نام سے موسوم ہیں، جن میں ایک ایک ماہر فن استاد کے تحت کام ہوتا ہے۔ کسی کارخانہ میں کارچوب اور چکن دوز اور زردوز وغیرہ کام کرتے ہیں اور کسی میں سنار اور کسی میں مصوّر اور نقاش اور کسی میں روغن ساز اور کسی میں بڑھئی، اور خرادی اور کسی میں درزی اور موچی اور کسی میں دارائی اور چوڑیا اور کمخاب اور باریک ململ بننے والے جولاہے جو پگڑیاں بنتے اور کمر باندھنے کے پھول دار زری کار پٹکے اور زنانے پاجاموں کے لیے ایسا نازک اور باریک کپڑا بناتے ہیں جو صرف ایک رات کے استعمال میں بیکار ہو جاتا ہے۔ یہ کپڑا صرف جو چند گھنٹے کام دیتا ہے، پچیس یا تیس روپیہ قیمت کا ہوتا ہے اور کبھی اس سے بھی زیادہ۔ جب کہ اس پر سوئی سے نہایت خوبصورت زری کا کام کیا گیا ہو۔ یہ تمام کاریگر علی الصبح اپنے اپنے کارخانوں میں حاضر ہو کر دن بھر کام کرتے اور شام کو اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں اور انہیں دھندوں میں ان کی زندگی بسر ہوتی چلی جاتی ہے اور جس حالت میں کوئی پیدا ہوا ہے اس سے ترقی کرنے کے لیے کوئی بھی کوشش نہیں کرتا۔ مثلاً کارچوب اور چکن دوز اور سوزن کار اپنے بیٹے کو اپنا ہی پیشہ سکھاتا ہے اور سنار کا بیٹا سنار ہی ہوتا ہے اور شہر کا طبیب اپنے فرزند کو علم طب ہی کی تعلیم دیتا ہے۔

یہاں تک کہ کوئی شخص اپنے پیشہ کے سوا دوسرے پیشہ والے کے ہاں شادی نہیں کرتا اور اس رسم کی پابندی مسلمان بھی ایسی ہی سختی سے کرتے ہیں جیسا کہ ہندو، جن کا شاستر یہی حکم دیتا ہے اور اس کے باعث سے بہت سی خوبصورت لڑکیاں کنواری بیٹھی رہتی ہیں۔۔۔۔ اگر ان کے والدین پیشہ اور ذات کا خیال چھوڑ دیں تو ان کی شادی اچھی جگہ ہو سکتی ہے۔

عام و خاص نقار خانہ اب ضروری ہے کہ میں عام و خاص نقّار خانہ کا ذکر کروں جو ان مکانات میں سے گزرنے کے بعد ملتا ہے اور فی الواقع بہت عمدہ اور عالی شان عمارت ہے۔ یہ ایک بڑا وسیع مربع شکل کا مکان ہے، جس کے چاروں طرف محرابیں ہیں۔

اور پلیس رائل سے مشابہ ہے اور صرف اس قدر فرق ہے کہ اس کے اوپر کوئی عمارت نہیں ہے۔ اس کی محرابیں اس طرح بنی ہوئی ہیں کہ ایک محراب میں سے دوسری محراب میں جا سکتے ہیں اور ایک بڑا دروازہ جو اس کے سامنے ہے اس پر ایک بڑا بالا خانہ بنا ہوا ہے۔ جس کے دروازے اسی جانب ہیں اور چونکہ اس میں نفیریاں اور شہنائیاں اور نقارے وغیرہ رکھے رہتے ہیں، اس کو "نقار خانہ" کہتے ہیں۔ جو دن کو اور رات کو اوقات معینہ پر اکٹھے بجائے جاتے ہیں اور نو وارد اہل فرنگ کے کانوں کو نہایت ہی کریہہ معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ دس بارہ نفیریاں اور اسی قدر نقارے ایک ہی دفعہ بجنے لگتے ہیں۔ بڑی نفیری جس کو "قرنا" کہتے ہیں ۹ فٹ لمبی ہے۔ جس کا نیچے کا منھ ایک فرانسیسی فٹ سے کم نہیں ہے اور لوہے یا پیتل کا سب سے چھوٹا نقارہ کم سے کم چھ فٹ قطر کا ہے۔ پس اسی سے آپ قیاس کر سکتے ہیں کہ اس نقار خانے سے کس قدر شور و غل پیدا ہوتا ہوگا۔ چنانچہ جب میں پہلی بار یہاں آیا تو شور کے مارے میرے کان بہرے ہو گئے لیکن عادت ایسی زبردست چیز ہے کہ اب رغبت سے سنتا ہوں۔ خصوصیت رات کے وقت مکان کی چھت پر لیٹے ہوئے جب دور سے اس کی آواز سنائی دیتی ہے تو نہایت بھلی اور سریلی معلوم ہوتی ہے۔ [۱]

اس دروازہ کے مقابل جس پر نقار خانہ ہے، صحن سے گذر کر ایک بڑا دالان ہے جس کے ستون اور چھت سنہری کام کے ہیں اور بہت اونچی کرسی کا اور بہت ہوادار اور

---

[۱] اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ کیونکہ ان کے بجانے والے بچپن ہی سے موسیقی کی تعلیم پاتے ہیں اور ان باجوں کی آواز کے اونچا نیچا کرنے اور سریلی اور لے دار بنانے میں ایسے مشاق ہیں کہ فاصلے سے سنی جائے تو نہایت پیاری لگتی ہے۔ نقار خانہ ہمیشہ ایک اونچے مکان پر اور بادشاہی محل سے دور رکھا جاتا ہے تا کہ بادشاہ کو اس کی آواز سے تکلیف نہ ہو۔

تین طرف سے کھلا ہوا ہے اور اس دیوار کے وسط میں جو محل سرائے اس کو جدا کرتی ہے، قد آدم سے کچھ اونچا ایک وسیع شہ نشین[1] بنا ہوا ہے۔ جہاں ہر روز بادشاہ دوپہر کے قریب آن کر تخت پر بیٹھتا ہے اور دائیں بائیں شہزادے کھڑے ہوتے اور خواجہ سرا مورچھل ہلاتے

---

[1] آثار الصنادید میں اس کو نشیمن ظل الٰہی یا تخت سنگین کر کے لکھا ہے اور اس کی کیفیت یوں بیان کی کہ دیوان عام کے مکانوں کے بیچوں بیچ ۔۔ شرقی دیوار سے ملا ہوا سنگ مرمر کا چارگز کا مرصع تخت ہے جس پر چار ستون لگا کر بالاخانہ کی طرح اس کی چھت بنائی ہے، اور قد آدم سے زائد کرسی دی ہے اور اس کے پیچھے جو سنگ مرمر کا سات گز لمبا اور ڈھائی گز چوڑا ایک طاق ہے، اس پر ہر قسم کے چرند پرند کی تصویریں عجیب عجیب رنگین پتھروں کی بنی ہوئی ہیں اور ایک آدمی کی تصویر ہے جو یک تارا بجا کر گا رہا ہے۔ یہ تصویر ملک اٹلی کے رہنے والے ارفیوس نام کے ایک کلاونت کی ہے جس کی کہانی یوں مشہور ہے کہ وہ علم موسیقی میں اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا اور ایسا خوش آواز تھا کہ جب گانے بیٹھتا تو چرند پرند اس کی آواز سے مست ہو کر اس کے گرد آن بیٹھتے تھے اور اس کہانی کے موافق اسی ملک کے رہنے والے رفیل نامی ایک مصور نے جو اس فن میں بے مثل تھا، اپنے خیال سے آرفیوس کے گانے کا ایک مرقع کھینچا تھا۔

یہ مصور ۱۵۲۰ء میں مرا مگر اس کا یہ مرقع اٹلی اور فرنگستانی ملکوں میں بہت مروج اور نہایت مشہور ہے اور اب تک اس کی نقلیں موجود ہیں اور یہ وہی مرقع ہے جو پتھر کی پچی کاری میں یہاں بنایا گیا ہے۔ اس مرقعہ کا فرنگستان کے سوا اور کہیں رواج نہیں تھا۔

یقین ہوتا ہے کہ اس قلعہ کے بنانے میں کوئی نہ کوئی اٹلی کا رہنے والا فرنگی شریک تھا۔ اس طاق کی بغل میں ایک دروازہ ہے اور اندر سے بھی آنے کا راستہ ہے۔ بادشاہ اس تخت پر دربار عام کے دن اجلاس کرتے تھے۔ اس تخت کے آگے ایک تخت سنگ مرمر کا بچھا ہوا ہے۔ امراء میں سے جس کسی کو کچھ عرض کرنا ہوتا تھا۔ اس پر چڑھ کر بادشاہ سے عرض کرتا تھا مگر بادشاہ کے بیٹھنے کا تخت اس قدر اونچا ہے کہ اس تخت کے چڑھنے پر بھی آدمی کا صرف گلا تخت تک پہنچتا ہے۔ اس تخت کے آگے دالان در دالان ہے جو سٹھ گز لمبا، اور

یا بڑے بڑے پنکھے جھلتے یا ادائے خدمات کے لیئے نہایت ادب کے ساتھ دست بستہ حاضر دربار رہتے ہیں اور تخت کے نیچے کے حصہ میں چاندی کا بنگلہ لگا ہوا ہے، جس میں تمام امراء اور راجہ اور غیر ملکوں کے سفیر آنکھیں نیچی کیے ہوئے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں اور تخت سے کسی قدر فاصلہ پر اسی قاعدہ پر منصب دار یعنی چھوٹے امراء کھڑے ہوتے ہیں اور اُن سے جو جگہ خالی رہتی ہے، وہ اور بلکہ تمام صحن سب قسم کے لوگوں اعلیٰ اور ادنیٰ مفلس و غنی سے بھرا رہتا ہے۔ کیونکہ یہی مقام ہے جہاں رعایا کا ہر ایک متنفس اپنے عرضِ حال کے لیے باریاب ہو سکتا ہے اور اسی وجہ سے اس کو عام و خاص[۱] کہتے ہیں اور ڈیڑھ یا دو گھنٹے تک

(بقیہ حاشیہ) چوبیس گز چوڑا ہے اور ہر ایک دالان کے نو نو در ہیں اور ان سب کے ستون سنگ سرخ کے ہیں اور ان پر بہت خوبصورت محرابیں بنائی گئی ہیں اور سفیدی گھونٹ کر سنہری نقاشی کی ہے۔ باہر کے دالان میں بیچ کے در چھوڑ کر سنگِ مرمر کا کٹہرا لگایا ہے۔ جس پر بہت خوشنما سنہری کلیاں تھیں جو اب ایک بھی باقی نہیں۔ اس دالان میں امراء، وزراء اور وکلاء کے حسب مرتبہ کھڑے رہتے ہیں۔ دربار کا یہ دالان درحقیقت ایک چبوترہ مصطبہ ہے، جس کا ایک سو چار گز طول اور ساٹھ گز کا عرض ہے۔ اس کے بیچ میں یہ دالان ہے اور باقی تین طرف چبوترہ ہے، جس کے گرد قدِ آدم سنگ سرخ کا کٹہرا لگا ہوا ہے، جس پر سنہری کلیاں تھیں۔ یہ جگہ چوب دار اور نقیب اور احدی وغیرہ لوگوں کے کھڑے رہنے کی تھی اور اس کو گلال باڑی کہتے تھے اور اس کے آگے دو سو چار گز لمبا اور ایک سو ساٹھ گز چوڑا صحن ہے۔ اور اس کے چاروں طرف قرینہ دار اور موقعہ سے مکانات بنے ہوئے ہیں اور شمال کی طرف دیوان خاص میں جانے کا دروازہ ہے۔ (س م ح)

[۱] خافی خاں اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ چونکہ شاہجہاں سے پہلے بادشاہوں کے عہد میں دربار عام کے لیے کوئی ایسا مکان بڑا موجود نہ تھا، جہاں دھوپ اور بارش سے بچاؤ ہو، اس لیے شاہجہاں نے اپنے جلوس کے پہلے سال میں حکم دیا کہ قلعہ آگرہ، لاہور اور برہان پور میں دربار عام کے لیے چالیس چالیس ستون کی تین عالی شان عمارتیں بنائی جائیں۔

جاری ص ۱۷۶

لوگوں کا مجرا اور سلام ہوتا رہتا ہے اور اس عرصہ میں کسی قدر خاص گھوڑے سامنے کیے جاتے ہیں، تاکہ خود بادشاہ ملاحظہ کر سکے کہ وہ کیسے آراستہ و پیراستہ ہیں اور ان کے بعد ہاتھی آتے ہیں جن کی میلی کھال خوب نہلا دھلا کر سیاہی سے رنگ دی جاتی ہے اور دو لال خط سر سے سونڈ کے اخیر تک جہاں دونوں آکر مل جاتے ہیں، کھینچ دیے جاتے ہیں، اور زربفت کی جھول ڈال کر چاندی کے دو گھنٹے جو ایک نقرئی زین میں بندھے ہوئے ہوتے ہیں، پیٹھ پر سے دونوں طرف لٹکا دیے جاتے ہیں اور سفید سرہ گائے کی دُمیں جو تبت سے آتی اور بیش قیمت ہوتی ہیں، لٹکا دی جاتی ہیں جو بڑی بڑی مونچھیں سی معلوم ہوتی ہیں اور دو چھوٹے چھوٹے ہاتھی جو خوب سجائے جاتے ہیں خدمتگاروں کی طرح ان بڑے ہاتھیوں کے ساتھ رہتے ہیں اور یہ ہاتھی جھوم جھوم کر اور سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ گویا اپنے زرق برق ساز و سامان اور اپنی آن بان پر نازاں ہیں اور جب تخت کے سامنے پہنچتے ہیں تو مہاوت جو گردن پر بیٹھا ہوا ہوتا ہے، لوہے کی ایک نوکدار چیز (آنکس) چبھو کر ان کو بڑھاوا دیتا اور زبان سے کچھ کہتا ہے اور اس وقت یہ جانور گھٹنا ٹیک کر اور سونڈ اوپر کو اٹھا کر چنگھاڑتا ہے۔ جس کو لوگ اس کی تسلیمات خیال کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد اور جانور پیش ہوتے ہیں۔

بعد ازاں سدھائے ہوئے ہرن جو لڑائے جاتے ہیں، نیل گائیں اور گینڈے اور بنگالہ کے بڑے بڑے بھینسے جن کے سینگ ایسے بڑے ہوتے ہیں کہ ان سے وہ شیر کے ساتھ لڑ سکتے ہیں اور چیتے جن سے ہرن کا شکار کھیلا جاتا ہے اور ہر قسم کے شکاری کتے خوبصورت جو ملک اُزبک (بخارا وغیرہ) سے آتے ہیں اور جن پر سرخ رنگ کی جھولیں پڑی ہوتی ہیں پیش ہوتے ہیں اور اخیر میں ہر قسم کے شکاری پرند جو تیتر، کلنگ اور خرگوش کو پکڑتے ہیں کہتے ہیں کہ ہرن پر بھی چھوڑے جاتے ہیں، جن پر یہ نہایت تیزی کے ساتھ جھپٹتے اور پنجے اور چونچ مار مار کر ان کو اندھا کر دیتے ہیں۔ ان جانوروں کے پیش ہونے کے علاوہ اکثر اوقات ایک دو امیروں کے سوار بھی ملاحظہ کرائے جاتے ہیں، جن کی پوشاک اس وقت روزمرہ کے لباس کی بہ نسبت ذرا مکلف ہوتی ہے، اور گھوڑوں پر ایاکریں

پڑی ہوئی اور انواع واقسام کے زیور مثلاً ہیکل جھبے وغیرہ سے سجائے ہوئے ہوتے ہیں اور بادشاہ اس تماشے سے بھی اپنا دل خوش کرتا ہے کہ مردہ بھیڑیں جن کا پیٹ صاف کرکے پھر سی دیا جاتا ہے، نوجوان امراء، منصب دار گرز بردار اور اعصا بردار ان پر تلوار سے اپنے کرتب دکھاتے اور ایک ہی ہاتھ میں چورنگ کاٹنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ تمام امور دربار کے شروع میں ہوا کرتے ہیں اور ان کے بعد زیادہ اہم معاملات پیش ہوتے ہیں اور بادشاہ نہایت توجہ کے ساتھ سواروں کو صرف دیکھتا ہی نہیں، بلکہ ان کے متعلق تفتیشِ حال بھی کرتا ہے، بلکہ جب سے لڑائی بند ہوئی ہے کوئی سوار یا پیدل ایسا نہیں جس کو بادشاہ نے بچشمِ خود نہ دیکھا ہو اور اس سے اپنی ذاتی واقفیت حاصل نہ کی ہو۔ چنانچہ اس نے کسی کی تنخواہ بڑھا دی اور کسی کی کم کردی اور کسی کو بالکل ہی موقوف کردیا ہے۔

داد رسی

اس موقعہ پر مستغیث جو غلطیاں پیش کرتے ہیں وہ تمام وکمال بادشاہ کے ملاحظہ اور سماعت میں آتی ہیں اور بادشاہ بذات خود مستغیثوں سے دریافت حال کرتا اور اکثر ستم رسیدہ لوگوں کی فوراً داد دیتا ہے اور ہفتہ میں ایک دن خلوت میں کامل دو گھنٹے تک ایسے دس غربا کی عرضیاں سنتا ہے جو مستغیثوں میں سے چن لیے جاتے ہیں اور جن کے پیش کرنے کا کام ایک نیک دولت مند اور مُسن شخص کے سپرد ہے عدل وانصاف کے کمرے میں جس کو "عدالت خانہ" کہتے ہیں بادشاہ دو بڑے قاضیوں کے ساتھ بیٹھ کر داد رسی کرتا ہے اور اس میں کبھی ناغہ نہیں ہونے دیتا اور اس سے

(حاشیہ بقیہ ص ۱۷۶) اور تیار ہونے پر عام وخاص ان کا نام رکھا گیا۔ چنانچہ آگرہ کا خاص وعام جب تیار ہوگیا تو ملک الشعرا طالبائے کلیم نے اس کی تعریف میں یہ رباعی کہی۔

ایں تازہ بنا کہ عرش ہمسایہ اوست — رفعت حرفے ز زینۂ پایہ اوست
باغیست کہ ستوں سبزش برونست — کاسائش خاص وعام در سایہ اوست

(س م ح)

بخوبی عیاں ہیں کہ ایشیائی بادشاہ جن کو ہم اہلِ یورپ جاہل اور ناتراشیدہ خیال کرتے ہیں، وہ ہمیشہ ہی اپنی رعایا کی داد دہی اور انصاف رسانی سے جو ان پر واجب ہے، غفلت نہیں کرتے۔

خوشامد اور لجاجت

جو حالات اس دربار عام وخاص میں گذرتے ہیں اور جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے اگرچہ وہ سب معقول اور قابلِ احترام معلوم ہوتے ہیں، لیکن یک گونہ سفلگی اور مکروہ خوشامد اور لجاجت ہمیشہ یہاں دیکھنے میں آتی ہے، اس کا تذکرہ بھی مجھ پر فرض ہے۔ چنانچہ جب کوئی اچھا لفظ بادشاہ کے منھ سے نکل جاتا ہے تو خواہ وہ کیسے ہی خفیف امر کی نسبت کیوں نہ ہو، تمام دربار اور بڑے بڑے امراء آسمان کی طرف دونوں ہاتھ اٹھا کر جس طرح کوئی خدا کی رحمت کو لیتا ہے، اس لفظ کو لے کر اور "کرامات کرامات" کہہ کر عرض کرتے ہیں کہ سبحان اللہ کیا ہی خوب ارشاد ہوا ہے اور حقیقتاً مغلوں میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے کہ جس کو یہ بیت یاد نہ ہو اور وہ اس کو فخریہ طور پر نہ پڑھتا ہو۔

اگر شہ روز را گوید شب ست ایں

بباید گفت اینک ماہ و پروین!

یعنی اگر بادشاہ رات کو دن بتلائے تو کہدینا چاہیے کہ وہ چاند اور ستارے نظر آ رہے ہیں اور یہ خوشامد کا عیب کیا ادنیٰ کیا اعلیٰ سب میں موجود ہے۔ مثلاً اگر کسی مغل کو مجھ سے معالجہ کی ضرورت پڑتی ہے تو اپنے معمول کے موافق تمام باتوں سے پہلے مجھ کو یہ کہتا ہے کہ آپ تو اپنے وقت کے ارسطو، اور بقراط اور بوعلی سینا ہیں۔ چنانچہ اول اول تو میں نے اس حرکت کو روکنا چاہا اور کہا کہ جس قدر آپ میری یہ تعریف کرتے ہیں، میں ہرگز اس کے لائق نہیں ہوں۔ اور مجھ ان بزرگوں سے کچھ نسبت نہیں، لیکن جب دیکھا کہ میرا انکسار ان کو اور زیادہ مبالغہ کرنے پر آمادہ کرتا ہے تو مجبوراً اپنے کانوں کو ان کی خوشامدی باتیں سننے کا ویسا ہی عادی بنا لیا جیسا کہ ان کے موسیقی، باجوں کے سننے کا۔

اس موقعہ پر ایک لطیفہ آپ کو سناتا ہوں اس سے آپ کو یہاں کے لوگوں کا خاصۂ طبعی معلوم ہو جائے گا۔ ایک پنڈت جس کی میں نے اپنے آقا سے ہی ملاقات کرائی تھی، ایک روز

اس نے اپنے ایک اشلوک میں اول تو ان کو ان بڑے بڑے فتح مندوں سے جو دنیا میں شاذو نادر ہی پیدا ہوئے ہیں، زیادہ بڑا بتایا، اور پھر سینکڑوں مہمات اور واہیات بک کر اپنے کلام کے اخیر میں بڑی سنجیدگی سے کہا " کہ جب آپ گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی سپاہ کے آگے چلتے ہیں تو آپ کے قدموں کے نیچے زمین کانپنے لگتی ہے۔ کیونکہ وہ آٹھ ہاتھی جو اس کو اپنے سر پر اُٹھائے ہوئے ہیں، اُس غیر معمولی بوجھ کے اٹھانے کی تاب نہیں لا سکتے"۔ جس کو سن کر میں بے اختیار ہنس پڑا اور اپنے "آغا" سے کہ میری طرح ان کو بھی ہنسی آ گئی تھی، شوخی کے ساتھ بہت سنجیدگی شکل بنا کر کہا کہ آپ ذرا سمجھ کر گھوڑے پر سوار ہوا کریں، ایسا نہ ہو کہ بھونچال آ کر دنیا درہم برہم کر جائے، جس کے جواب میں انھوں نے فوراً یہ کہا کہ اسی وجہ سے تو میں پالکی میں سوار ہونا زیادہ پسند کرتا ہوں۔

خلوت خانہ

عام وخاص کے بڑے دالان کی بغل میں ایک خلوت خانہ ہے جسے غسل خانہ[1] کہتے ہیں۔ یہاں صرف چند ہی شخصوں کو حاضر ہونے کی اجازت ہے، اور یہ وسعت میں اگرچہ عام خاص کے برابر نہیں ہے مگر وہاں کافی وسعت میں نہایت خوبصورت روغنی اور سنہری کام ہے اور ایک بڑے شہ نشین کی طرح چار یا پانچ فرانسیسی فٹ کا اونچا ہے جہاں بادشاہ کرسی پر بیٹھ کر وزراء سے جو ادھر اُدھر کھڑے ہوتے ہیں تخلیے میں امراء اور صوبہ داروں کے عرائض سنتا اور سلطنت کے اہم معاملات پر غور کرتا ہے اور جسطرح

---

[1] پادشاہ نامہ میں لکھا ہے کہ شہنشاہ اکبر کے زمانے میں قلعہ آگرہ میں محل سرا اور دیوان خانہ کے مابین ایک مکان تھا، جس میں بادشاہ غسل کیا کرتا تھا اور خاص خاص لوگ اور وزیر اور بخشی بعض ضروری اور اہم معاملات میں وہاں حاضر ہو کر حکم حاصل کیا کرتے تھے۔ شاہجہان کے زمانہ میں جو نئی نئی عمارتیں بنائی گئیں تو اگرچہ بادشاہ نے اس مکان کا نام جہاں سلطنت کے مخفی اور اہم معاملات امراء اور وزراء کے مشورے سے طے کیے جاتے تھے، دولت خانہ خاص رکھا لیکن لوگ اس کو بھی غسل خانہ کہتے رہے اور اسی لیے بادشاہ اگر سفر میں بھی ہوتا تھا تو خیام شاہی میں سے ایک خیمہ غسل خانہ کے نام سے نامزد رہتا تھا، اگرچہ

صبح کو عام و خاص کے دربار میں حاضر نہ ہونے کے باعث امراء پر جرمانہ کیا جاتا ہے، یہاں شام کو نہ حاضر ہونے پر سزا ملتی ہے۔ البتہ صرف میرے "آغا" دانشمند خاں ایک ایسے امیر ہیں جن کو ان کے علم و فضل اور شوق مطالعہ اور سرانجام امور ممالک غیر کی وجہ سے معافی حاصل ہے، لیکن چہارشنبہ کو جو ان کی چوکی کا دن ہے، ان کو بھی اور امرا کی طرح حاضر ہونا پڑتا تھا۔ یہ "دو وقتہ حاضری" کی رسم نہایت پرانی ہے اور کوئی امیر بھی اس پابندی کی معقول طور پر شکایت نہیں کر سکتا ــــ کیونکہ خود بادشاہ سوائے کسی ضروری کام یا سخت بیماری کی حالت کے دونوں وقت دربار میں آنا اپنا فرض جانتا ہے۔ چنانچہ اورنگ زیب کی پچھلی خطرناک بیماری کی حالت میں بھی دربار کے دونوں مقاموں میں نہیں تو ایک میں تو ضرور لوگ اس کو اٹھا کر لے آتے تھے۔ کیونکہ اس نے رات دن میں کم از کم ایک بار لوگوں کو اپنا دیدار دکھا دینا واجب سمجھتا تھا۔ اس لیے کہ اس کا صرف ایک دن دربار میں نہ آنا بھی تمام سلطنت میں فتنہ و فساد کے پھیل جانے اور شہر میں ہڑتال ہو جانے کا باعث ہو سکتا تھا۔

اگرچہ غسل خانہ کے دربار کے موقعہ پر بادشاہ ان اُمور میں مصروف رہتا ہے، جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے، لیکن دربار عام و خاص کے دستور کے موافق یہاں بھی زیادہ تر وہی جانوروں کا ملاحظہ و مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، مگر چونکہ کچھ دن باقی نہیں رہتا اور سامنے کا صحن بھی مختصر ہے، اس لیے امراء کے رسالوں کا ملاحظہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس وقت کے دربار کی یہ خاص رسم ہے کہ جن منصب داروں کی چوکی دینے کی باری ہوتی ہے، وہ بادشاہ کو نہایت ادب و تعظیم کے ساتھ سلام کرتے ہوئے بڑے قرینے اور ترتیب سے سامنے سے گزر جاتے ہیں۔ جن کے آگے آگے لوگ "قور" ہاتھوں میں لیے ہوئے چلتے ہیں جو چند خوبصورت نقرئی چیزیں ہیں جو چاندی سے منڈھی ہوئی چھڑیوں کے سروں پر لگائی جاتی ہیں ــــ جن

(حاشیہ بقیہ) اس میں دربار خاص ہوتا تھا اور وہ غسل کے کام سے کچھ علاقہ نہ رکھتا تھا۔

(س م ح)

میں سے دو بڑی مچھلی کی شکل کی ہیں اور دو ایک مہیب اور خیالی جانور کی صورت کی جس کو "اژدہا" کہتے ہیں۔ اور کچھ شیر کی شکل کی اور بعض ہاتھ کے پنجہ اور بعض ترازو کی اور بہت سی اور بے شمار وضع کی جن کے ایک طرح کے بعید الفہم معنی بتاتے ہیں۔ ان لوگوں میں بہت سے گرز بردار بھی ہوتے ہیں جو قد آور اور وجیہہ دیکھ کر بھرتی کیے جاتے ہیں اور جن کا کام یہ ہے کہ دربار میں بے ترتیبی نہ ہونے دیں اور بادشاہی فرمان اور احکام پہنچائیں اور جو حکم ملے نہایت جلد اس کی تعمیل کریں۔

اب میں بڑی مسرت کے ساتھ آپ کو بادشاہی محل سرا کی سیر کراتا ہوں جیسا

شاہی محل سرا کہ قلعہ کی اور عمارات کی کرائی ہے، لیکن کسی سیاح کو وہاں کی کیفیت چشم دیدہ بیان کرنی ناممکن ہے۔ کیونکہ بادشاہ کے دہلی میں موجود نہ ہونے کے وقت مجھے کئی دفعہ وہاں جانے کا موقعہ ملا اور مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ ایک بڑی بیگم کے علاج کی خاطر جو شدت مرض کی وجہ سے معمول کے موافق باہر کے دروازے تک نہیں لائی جا سکتی تھی۔ بہت دور تک اندر جانے کا اتفاق ہوا مگر میرے سر پر ایک کشمیری شال اس طور سے اڑھا دی گئی تھی کہ ایک لمبے سکارف (اوڑھنی) کی طرح پاؤں تک لٹکتی تھی اور ایک خواجہ سرا ہاتھ پکڑے ہوئے مجھے اس طرح لے گیا تھا جیسے کوئی اندھے کو لے جاتا ہے۔

یہاں اسی پر قناعت کرنی ہوگی جو بعض خواجہ سراؤں سے سن کر میں نے لکھا ہے ان کا بیان ہے کہ محل میں بیگمات کے مدارج اور حیثیت اور ان کے معاش کی مناسبت سے علیحدہ علیحدہ بہت خوبصورت اور بڑے بڑے محل بنے ہوئے ہیں جن کے دروازوں کے سامنے حوض اور سب طرف باغیچے اور دلچسپ روشیں اور سایہ دار آرام گاہیں اور نہریں اور فوارے اور دن کی گرمی کے بچاؤ کی خاطر عمیق تہ خانے اور رات کو خنکی میں آرام کرنے کے لیے اونچے اونچے چھتے اور صحن چبوترے بنے ہوئے ہیں اور ایسے دل کش مکانات ہیں کہ ان میں اس ملک کی تکلیف دہ گرمی کو مطلقاً دخل نہیں ہے

ایک چھوٹے سے برج کی جو دریا کی طرف ہے، حد سے زیادہ تعریف کرتے ہیں، جس میں آگرہ کے دونوں برجوں کی طرح سونے کے ورق چڑھے ہوئے اور لاجوردی کام کیا ہوا، اور

نہایت عمدہ نقش ونگار بنے ہوئے اور بڑے بڑے آئینے لگے ہوئے ہیں۔[1]

دربار اور تختِ طاؤس اب قبل اس کے کہ میں قلعہ کا بیان ختم کروں، آپ کو دوبارہ عام وخاص کی طرف متوجہ کرنا اور ان سالانہ جشنوں اور درباروں کی کیفیت سنانی چاہتا ہوں جو میں نے اس میں ہوتے دیکھے ہیں خصوصاً وہ بڑا جشن جو لڑائی کے اختتام کے بعد ہوا تھا اور جس سے بڑھ کر کوئی تماشا میں نے عمر بھر میں کبھی نہیں دیکھا، اس روز بادشاہ نہایت ہی عمدہ لباس پہنے دیوانِ عام وخاص کے صدر میں مرصع تخت پر بیٹھا ہوا نظر آیا۔ اس کی پوشاک نہایت نازک اور پھول دار ریشمی کپڑے کی تھی، جس پر بہت ہی عمدہ زری کا کام کڑھا ہوا تھا، جس میں ایک پکھراج ایسا تھا جو لاثانی کہا جا سکتا ہے۔ اور آفتاب کی طرح چمکتا تھا اور بڑے بڑے موتیوں کا کنٹھا گلے میں تھا جو ہندوؤں کی مالا کی طرح پیٹ تک لٹکتا تھا۔

یہ تخت چھ طلائی پایوں کا ہے (کہتے ہیں کہ یہ بالکل ٹھوس ہیں) جن میں یاقوت اور زمرد اور ہیرے جڑے ہوئے ہیں مگر میں ان کی تعداد اور قیمت بیان نہیں کر سکتا کیونکہ کسی کو اس قدر نزدیک جانے کی اجازت نہیں کہ ان کا شمار اور آب وتاب کا اندازہ کر سکے۔ لیکن یقین کیجیے کہ ہیرے اور دوسرے جواہرات بہت ہی ہیں۔ اور مجھے خوب یاد ہے کہ اس کی قیمت چار کروڑ روپے جانچی گئی تھی اور اس کو اورنگ زیب کے باپ شاہجہاں نے اس لیے بنوایا تھا کہ بے شمار جواہرات جو خزانہ میں قدیم راجاؤں اور پٹھان بادشاہوں کی لوٹ

---

[1] آثار الصنادید میں اس برج کا نام برج طلایا مثمن برج لکھا ہے اور سرتاپا سنگِ مرمر کا بنایا ہے جس میں سونے کا کام اور پرچین سازی اور منبت کاری کی ہوئی ہے جو کلس سمیت باہر سے بھی سنہری ہے اور ہشت پہلو ہونے کے باعث مثمن برج کہلاتا ہے۔ تین ضلعے اس کی خواب گاہ کی عمارت کی طرف ہیں اور پانچ دریا کی جانب، اور پانچوں میں سنگِ مرمر کی جالیاں لگی ہوئی ہیں اور ایک نشیمن بطور برآمدے کے دریا کے رُخ بنا ہوا ہے۔ (س م ح)

اور ان پیش کشوں کے ذریعہ سے، جو ہر سال سب امراء کو خاص خاص موقعوں پر نذر میں پیش کرنی لازم ہیں، وقتاً فوقتاً جمع ہو گئے تھے، لوگ ان کو دیکھیں مگر اس کی ساخت اور کاریگری ان جواہرات کے ہم پایہ نہیں ہے۔ البتہ دو مور جو موتیوں اور جواہرات سے بالکل ڈھکے ہوئے ہیں، بہت ہی خوب اور نہایت عمدہ نقشے پر بنے ہیں اور ان کو ایک صناع نے بنایا تھا[۱]۔ جس کی کاریگری اور ہنرمندی حیرت کے لائق تھی اور جو اصل میں فرانس کا

---

[۱] مُلّا عبدالحمید مورخ شاہجہانی نے "بادشاہ نامہ" میں اس تخت کی جو کیفیت بیان کی ہے، دلچسپ سمجھ کر ہم اس کو یہاں بلفظہٖ نقل کرتے ہیں اور وہ یہ ہے۔

"چون بمرور ایام و گردر اعوام اقسام جواہر ثمینہ کہ ہر یک شایستہ گوشوارہ ناہید و کمر بند خورشید است در جواہر خانہ والا فراہم آمدہ بود۔ در آغاز جلوس مقدس بر ضمیر الہام پذیر منطبع گردید کہ از تحصیل چنیں تحفٔ غریبہ دنگاہداریٔ این نفایس عجیبہ مطمح نظر دوربین جز دولت آرائی و زینت افزائی امرے دیگر نیست پس درجائے بکار باید برد کہ ہم تماشائیاں از حسن جہاں افروز ایں نتائج بحر و کان بہرہ برگیرند و ہم کارگاہ سلطنت را فروغے تازہ پدید آید۔ حکم شد کہ سوائے جواہر خاصہ کہ در جواہر خانہ مشکوئے مینو مثال مے باشد از قسم لعل و یاقوت و الماس و مرداریدقیمتی و زمرد کہ "صد لک روپیہ قیمت آنست ہرچہ در تحویل خازنان بیرون است از نظر اطہر بگذرانند و جواہر ثمینہ گران سنگ را کہ پنجاہ ہزار مثقال است و مبلغ ہشتاد و شش لک روپیہ بہائے آں شدہ بود انتخاب نمودہ بہ بے بدل خاں داروغہ زرگرخانہ حوالہ فرمودند تا بیک لک تولہ طلائے ناب کہ دو صد پنجاہ ہزار مثقال ست و مبلغ چہاردہ لک روپیہ قیمت آں تختے بطول سہ گز در یک و عرض دو و نیم گز و ارتفاع پنج گز سرکاری نمودہ بجواہر مذکورہ ترصیع نمایند و مقرر شد کہ سقف آں از درون بیشتر مینا کار و لختے مرصع و از بیرون بہ لعل و یاقوت و جز آن

رہنے والا تھا اور جس نے یورپ کے بہت سے رئیسوں کو جھوٹے جواہرات دیدے کہ جن کو وہ ایک خاص حکمت سے تیار کرتا تھا، خوب لوٹا تھا اور پھر بھاگ کر شہنشاہ مغل کے ہاں آکر پناہ لی تھی اور یہاں بھی خوب دولت کمائی تھی

تخت کے نیچے کے چبوترے پر جس کے گرد چاندی کا کٹہرا لگا ہوا اور اوپر زری کی جھالر کا ایک پر زور وسیع شامیانہ تنا ہوا تھا۔ امراء نہایت مکلّف پوشاکیں پہنے کھڑے تھے، اور مکان کے ستون زربفت سے منڈھے ہوتے اور ریشمی مشجّر کے شامیانے جن میں ریشم اور زری کے پھندنے لگے ہوتے تھے، تنے ہوئے اور نہایت عمدہ قالین ریشمی بچھے ہوئے تھے اور باہر ایک خیمہ جسے اسپک[1] کہتے ہیں اور جو اس مکان سے بھی بڑا ہے، اس کی چھت کے ساتھ ملا کر لگایا ہوا تھا، جو صحن کے نصف تک پھیلا ہوا اور چاروں طرف سے چاندی کی پتروں سے منڈھے ہوئے کٹہرے سے گھرا ہوا تھا، اس کی چوبیں بھی چاندی

(حاشیہ بقیہ) مرصع مغرق ساختہ بہ زمرد ایں اساطین دوازدہ گانہ بر افراز دو بالائے آن دو پیکر طاؤس مکلل بزدا ہر جواہر و درمیان ہر دو طاؤس درختے بجواہر آب دار ترتیب دہد۔ درمدت ہفت سال ایں تخت عرش مثال بہ مبلغ صد صد لک روپیہ کہ سہ صد وسی وسہ ہزار تومان عراق و چہار کرورخانی رائج ماوالنہر است صورت اتمام یافت۔ از جملہ یازدہ تختہ مرصع کہ بر دور آن برائے تکیہ

دہد شاہ جہاں رابوسہ برپائے	ازاں شد پایۂ قدرش فلک سائے
کند شاہ جہاں بخش جواں بخت	خراج عالی را خرج یک تخت
خداوندے کہ عرش و کرسی افراخت	تواند قدرتش تختے چنیں ساخت
اثر با قیمت تاکون و مکان را	بود بر تخت جا شاہجہاں را
بود تختے چنیں ہر روز جایش	خراج ہفت کشور زیر پایش
چو تاریخش زبان پرسید از دل	بگفت را اورنگ زیب شاہنشاہ عادل

دیگر ایں تاریخ یافتہ ۶ (سریر ہمایون صاحبقرانی سنہ ۱۰۴۴ھ" (س م ح)

[1] فارسی میں ایک بڑے خیمہ کو کہتے ہیں۔ (غیاث اللغات) (س م ح)

سے منڈھی ہوئی تھیں، جن میں سے تین ایسی بلند تھیں جیسے جہاز کا مستول اور باقی چھوٹی تھیں۔ اس عالی شان خیمہ کے باہر کی طرف سرخ رنگ کا کپڑا تھا اور اندر کی جانب مچھلی پٹن کی نہایت عمدہ چھینٹ تھی جو اسی غرض سے بنائی گئی تھی اور جس کے بیل بوٹے ایسے عمدہ اور رنگ ایسے تیز اور شاداب تھے کہ ایک تختۂ گلزار معلوم ہوتا تھا اور چونکہ سب امراء کو حکم دیا گیا تھا کہ عام وخاص کی گردش کی ایک ایک محراب کی زیبائش و آرائش وہ اپنے خرچ سے کریں، اس لیے بادشاہ کی زیادہ سے زیادہ رضامندی حاصل کرنے کے لیے ہر ایک نے دوسرے سے بڑھ کر ان کی زیب وزینت میں کوشش کی تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام در و دیوار اوپر سے نیچے تک کمخاب اور زربفت میں غرق اور فرش نہایت بیش قیمت قالینوں سے آراستہ و پیراستہ ہوگیا۔

ز انواعِ جواہر گشتہ الوان | چراغِ عالمی ہر دانۂ آن!
در اطرافش، بود گلہائے مینا | فروزاں چوں چراغ از طورِ سینا
چو می کرد از فرازش کوتہی دست | نگینِ خویش، جم بر پایہ اش، لبدت
شبِ تار از فروغِ لعل و گوہر | تو اندٗ صد فلک را، داد، اختر

جشن شاہانہ جشن کے تیسرے دن اول بادشاہ اور اس کے بعد اکثر امراء بڑے تکلف کے ساتھ بڑی بڑی ترازوؤں میں جن کے پلڑے اور بٹے سونے کے تھے تولے گئے اور مجھے یاد ہے کہ یہ دیکھ کر کہ اورنگ زیب کا وزن سال گذشتہ کی بہ نسبت ایک سیر زیادہ ہے۔ تمام دربار نے نہایت ہی مسرت ظاہر کی۔ اس قسم کے جشن ہر سال ہوا کرتے ہیں، لیکن اس شان و شوکت کا جشن کبھی نہیں ہوا اور نہ اس قدر کبھی خرچ ہوا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ بادشاہ کا اس کروفر کے ساتھ جشن کرنے سے مقصود یہ تھا، کہ سوداگروں کو جن کا کمخاب وغیرہ لڑائی کی وجہ سے پانچ سال کے عرصہ سے بکنے میں نہیں آیا تھا، کچھ فائدہ ہو جائے۔ اس جشن میں امراء کو بہت خرچ پڑا، آخر کار اس کا ایک حصہ فوج کے غریب سواروں کے سر تھوپا گیا جن کو اپنے اپنے امیر کے حکم سے مجبوراً قباؤں کے

واسطے کمخاب خریدنا پڑا۔

ان سالانہ جشنوں کے موقعہ پر ایک قدیم دستور ہے جس کو امراء بالکل پسند نہیں کرتے یعنی ان کو ایک عمدہ پیش کش نذر کرنا پڑتی ہے۔ جس کی قیمت بمناسبت اُن کی تنخواہوں کے کم یا زیادہ ہوتی ہے اور بعض امرا نہایت ہی عمدہ عمدہ چیزیں پیش کرتے ہیں اور یہ نذرانے کبھی بغرض نمایش اور کبھی اس مطلب سے کہ بادشاہ اس دست برد کی تحقیق و تفتیش کے حکم دینے سے جو انھوں نے اپنے برسرِ عہدہ ہوتے یا صوبہ داری کے زمانہ میں کی تھی، باز رہے، اور بعض سونے کے مرصع برتن اور بعض بہت سی اشرفیاں جو بارہ بارہ روپیہ کی قیمت کی ہوتی ہیں پیش کیں ایک ایسے ہی جشن کے موقعہ پر جو اورنگ زیب وزیر ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ رشتہ داری کی وجہ سے جعفر خاں کی نوتعمیر حویلی دیکھنے کے بہانے اس کے ہاں گیا تو اس نے ڈھائی لاکھ روپیہ کی اشرفیاں اور کچھ عمدہ موتی اور ایک لعل جس کی قیمت ایک لاکھ روپیہ آنکی گئی تھی، نذر کیا مگر شاہجہان نے جو جواہرات کے پرکھنے میں سب لوگوں سے زیادہ مہارت رکھتا تھا۔ اس کی قیمت ساڑھے بارہ سو روپیہ سے بھی کم تجویز کی جس کو سن کر بڑے بڑے جوہری جنھوں نے اس کے جانچنے میں بالکل دھوکا کھایا تھا، حیران رہ گئے۔

مینا بازار کبھی کبھی ان جشنوں کے وقت محل سرا میں ایک فرضی بازار بھی لگا کرتا ہے جس میں امراء اور بڑے بڑے منصب داروں کی خوبصورت اور دل رُبا بیبیاں دکانیں لگا کر بیٹھتی اور عمدہ عمدہ کمخاب اور زردوزی کام کی چیزیں اور زرکار مندیلیں اور سفید باریک کپڑے جو امیرزادیوں کے استعمال میں آتے ہیں نیز دوسری بیش قیمت چیزیں فروخت کرنے کو رکھتی ہیں اور بادشاہ اور اس کی بیگمیں، شاہزادیاں اور دوسری عالی رتبہ خاتونیں خریدار بنتی ہیں اور اگر کسی امیر کی بیٹی خوبصورت اور حسین ہوتی ہے تو اس کی ماں اس کو ضرور اپنے ساتھ لے جاتی ہے، تاکہ بادشاہ کی نظر پڑ جائے اور بیگمات سے بھی تعارف ہو جائے۔ اس میلہ کا بڑا لطف یہ ہے کہ ہنسی اور مذاق کے طور پر خود بادشاہ ایک ایک پیسہ کے لیے جھگڑتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ بیگم صاحبہ بہت گراں فروش ہیں۔ دوسری جگہ سے اس سے اچھی اور سستی چیز مل سکتی ہے۔ ہر ایک بیگم اور شہزادی کوشش

کرتی ہے کہ اپنا مال زیادہ قیمت کو بیچے اور جب دیکھتی ہے کہ بادشاہ زیادہ قیمت نہیں لگاتا تو گفتگو میں اکثر ایسی بڑھ جاتی ہے کہ یہ کہہ اٹھتی ہے کہ آپ اپنے برف بیچنے کی فکر کریں، ان چیزوں کی قیمت آپ کیا جانیں اور یہ آپ کے لائق نہیں ہیں۔ بہتر ہے کہ کسی اور جگہ تلاش کریں۔ بیگمیں بادشاہ سے بھی زیادہ ارزاں خریدنا چاہتی ہیں۔ غرض کہ دونوں طرف سے ایسی گفت گو بڑھ جاتی ہے کہ ایک جھگڑے کا سوانگ سا معلوم ہوتا ہے، مگر آخر کار سودا طے ہو جاتا ہے اور بادشاہ اور بادشاہزادیاں اور بیگمیں جو چیزیں ادھر ادھر سے خریدتی ہیں، ان کی قیمت فوراً دے دیتی ہیں اور روپیوں کی جگہ اشرفیاں اس طور سے ہاتھ سے ڈال دیتی ہیں کہ گویا دوکاندار یا اس کی بیٹی کے حسن و جمال نے ان کو ایسا محو کر دیا ہے کہ روپیوں اور اشرفیوں کی تمیز ہی نہیں رہی اور ویسی ہی بے پروائی سے دکاندار ان کو اٹھا لیتی ہے اور اسی طرح سے یہ جلسہ دل لگی اور چہل میں ختم ہو جاتا ہے۔

شاہجہاں عورتوں کی طرف زیادہ مائل تھا، ہر ایک جشن کے موقع پر سوانگ کرایا ہی کرتا۔

اس موقع پر ان عورتوں کو بھی محل میں بلا لیتا اور رات بھر وہیں رکھتا تھا جن کو "کنچنی" کہتے ہیں، جس کے معنی ہیں سونے سے ملمع کی ہوئی اور پھولوں کی طرح کھلی ہوئی گویہ عورتیں بازاری نہ تھیں، بلکہ باعزت ہوتی تھیں جو بیاہ شادی کے موقع پر امراء اور منصب داروں کے ہاں صرف ناچنے گانے کے لیے جاتی تھیں۔ ان کنچنیوں میں اگرچہ اکثر صاحب حسن و جمال ہیں اور لباس و پوشاک بھی عمدہ رکھتی ہیں اور گانے میں بھی ان کو کمال ہے اور ناچنے میں تو اپنے اعضاء کو اس خوبی سے لچکاتی اور اس سرعت اور تیزی سے ناچتی ہیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور تال میں بھی درست رہتی ہیں مگر پھر بھی کسبی ہیں۔

شاہجہاں اسی پر قناعت نہ کرتا تھا کہ یہ عورتیں اس میلہ میں آئیں، بلکہ بدھ کے روز جو معمول کے موافق دربار میں سلام کو آتی تھیں تو اکثر رات بھر کے لیے ٹھہرا لیتا اور ان کے ناچنے گانے سے حظ اٹھاتا تھا، لیکن اورنگ زیب باپ سے زیادہ سنجیدہ ہے اور اس نے ان کا محل میں آنا بالکل بند کر دیا ہے مگر معمول کے موافق چہارشنبہ کو دربار میں حاضر ہونے

سے منع نہیں کیا اور صرف دور سے سلام کر کے رخصت ہو جاتی ہیں۔

اب چونکہ میں جشن اور مینا بازار اور کنچنیوں کا ذکر کر رہا ہوں تو ایک واقعہ کے بیان کرنے سے باز نہیں رہ سکتا جو ہمارے ایک ہم وطن برنارڈ نامی سے تعلق رکھتا ہے اور چونکہ میرے نزدیک بھی پلوٹارک[1] کا یہ قول صحیح ہے کہ "جزوی اور خفیف باتوں کو پوشیدہ رکھنا نہیں چاہیے۔ کیونکہ اکثر اوقات اُن سے ایک قوم کے رسوم و عادات اور ذہن وذکا کے باب میں صحت کے ساتھ رائے قائم کرنے میں بڑی بڑی باتوں کی بہ نسبت زیادہ مدد ملتی ہے۔ اسی لیے اگرچہ یہ ایک ہنسی کا قصہ ہے، تاہم سننے کے لائق ہے!

برنارڈ جہانگیر کے اخیر زمانہ میں ایک نامی اور فی الواقع ایک نہایت کامل طبیب اور جراح تھا اور بادشاہ اس پر بہت مہربانی کرتا تھا۔ چنانچہ اکثر اوقات بادشاہ کے ساتھ کھانے پینے میں بھی شریک ہو جاتا تھا اور دونوں حد سے زیادہ شراب پی لیتے تھے اور بادشاہ

---

[1] پلوٹارک قدیم زمانہ کا ایک مشہور مصنف ہے، یہ کرونیا کا رہنے والا تھا جو یونان کے ضلع بوئیا میں ایک شہر ہے۔ اس کی پیدائش کا زمانہ ٹھیک معلوم نہیں، مگر خیال کیا گیا ہے کہ شہنشاہ کلاڈیس رومی کے اخیر زمانہ سلطنت یعنی اڑتالیس سے لے کر ترپین سنہء تک کسی سال میں پیدا ہوا تھا۔ یہ ایک اعلیٰ خاندان میں سے تھا اور اس نے ایمونیس حکیم سے فلسفہ کے وہ اصول سیکھے جو نفس ناطقہ اور قوائے عقلی سے متعلق ہیں اور اس میں بڑی شہرت حاصل کی۔ علم اخلاق اور علم رجال میں اس کی بہت سی تصنیفات ہیں اور اس کی عمدگی خیالات اور مہارت علمی اور اس خاص طرز کی خوبی کا اثر جو اس کی تمام تحریروں میں پائی جاتی ہے۔ پڑھنے والوں کی زبان تک محدود نہیں رہتا تھا، بلکہ دل تک پہنچتا اور گرویدہ کر لیتا تھا۔ اس کی تصنیفات میں سے جس کتاب نے اس کو حیات جاودانی بخشی وہ روم اور یونان کے چھیالیس مشہور و معروف لوگوں کا تذکرہ ہے، جس کے بہت سے ترجمے فرانسیسی، انگریزی اور جرمن وغیرہ میں ہوئے ہیں۔ اس کی وفات کا سال بھی معلوم نہیں مگر قیاس کیا گیا ہے کہ شہنشاہ ہیڈرین رومی کے پانچویں سنہ جلوس میں ستر برس کی عمر میں مرا تھا۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا)

(س م ح)

اور طبیب دونوں ایک ہی طرح کے مزاج کے تھے اور بادشاہ کا یہ حال تھا کہ شب و روز عیش و نشاط میں مشغول رہتا تھا اور سلطنت کا کام کاج اپنی مشہور و معروف بیگم نور جہاں کو سونپ رکھا تھا جس کی نسبت اس کا یہ قول تھا کہ اس کی عقل و دانائی سلطنت کے انتظام کے لیے کافی ہے، مجھے دخل دینے کی حاجت نہیں۔ برنارڈ کی معمولی تنخواہ اگرچہ پچیس روپیہ روز تھی مگر شاہی محل سرا میں اور امراء کے ہاں معالجہ کے لیے جانے کے باعث اور نیز اس سبب سے کہ لوگ نہ صرف اس کے طبیب ہونے کی وجہ سے بلکہ بادشاہ کے مزاج دخل کے سبب سے ایک دوسرے سے بڑھ کر اس کی تواضع کرتے تھے۔

مگر وہ روپیہ کی بھی کچھ قدر نہ کرتا تھا اور ایک ہاتھ سے لیتا اور دوسرے ہاتھ سے دیدیتا تھا اور اسی لیے سب لوگ اس کو عزیز جانتے تھے۔ خصوصاً "کنچنی" جن کو اس نے بہت کچھ کھلایا تھا۔ پس اس کے ہاں ہمیشہ رات کو ان عورتوں کا جمگھٹ ہوتا تھا۔ یہ ان میں سے ایک نوخیز عورت پر جو نہایت حسین اور ناچنے میں مشہور تھی، فریفتہ ہوگیا اور ہر چند طرح طرح کی کوششیں کیں۔ لیکن اس عورت کی ماں اس خیال سے کہ کم عمری کی وجہ سے اس کے حسن و جمال اور تندرستی میں فرق نہ آجائے۔ ایک لحظہ اس کو اپنی نظر سے علیحدہ نہ ہونے دیتی تھی۔

اسی حالت میں جب کہ برنارڈ معشوق کے وصال سے مایوس ہو رہا تھا کہ ایک دن جہانگیر نے جو سر دربار اس کے ایک بے نظیر علاج کے صلہ میں اس کو انعام دینا چاہا۔ تو اس نے عرض کیا امیدوار ہوں کہ حضور معلیٰ اس انعام سے معاف رکھیں اور بجائے اس کے کہ میری یہ التجا منظور فرمائیں کہ یہ نوجوان کنچنی جو ارباب نشاط کے ساتھ سلام کو حاضر ہوئی ہے، مجھے عنایت ہو۔ تمام دربار اس کے عذر اور ایسی درخواست کے کرنے سے جو اس کے عیسائی اور اس کنچنی کے مسلمان ہونے کی وجہ سے شاید ہی قابل قبول معلوم ہوتی تھی، مسکرایا لیکن جہانگیر نے جس کو دین اور مذہب کا کچھ خیال نہ تھا ایک بڑا قہقہہ مارا اور حکم دیا کہ اس کنچنی کو اس کے کاندھے پر بٹھا دو اور کہو کہ لے جائے۔ چنانچہ فوراً بھرے دربار میں یہ اس کے کاندھے پر بٹھا دی گئی اور وہ اس انعام کو لے کر خوشی خوشی گھر

کو چلتا ہوا۔

ہاتھیوں کی لڑائی جشن کا اختتام ہمیشہ ایک ایسے تماشہ پر ہوتا ہے، جس سے یورپ میں کوئی بھی واقف نہیں، یعنی ہاتھیوں کی لڑائی پر جو عام خلقت کے سامنے جمنا کی ریتی میں لڑائے جاتے ہیں اور بادشاہ اور بیگمات اور تمام امرا قلعہ کے جھروکوں میں سے یہ تماشہ دیکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک خام دیوار تین یا چار فٹ چوڑی اور پانچ یا چھ فٹ اونچی بنائی جاتی ہے اور اس کے دونوں جانب سے دو قوی ہیکل ہاتھی جن پر دو دو آدمی سوار ہوتے ہیں مدِّ مقابل کیے جاتے ہیں۔ دوسرا آدمی اس لیے ہوتا ہے کہ اگر ہاتھی کی گردن پر سے ایک آدمی گر پڑے تو دوسرا آنکس سے اس کو چلائے اور یہ لوگ کبھی تو ان کو بڑھاوا دیکر اور کبھی برا بھلا کہہ کر اور پاؤں سے ٹھوکے دیکر آگے بڑھاتے ہیں، —— یہ بے چارے جانور دیوار کے پاس پہنچ کر ایک دوسرے پر حملہ کرتے اور ایسی ٹکر لگاتے ہیں کہ دیکھ کر خوف آتا اور سر اور سونڈ اور دانتوں کے زخموں سے ان کا زندہ رہنا تعجب معلوم ہوتا ہے۔ یہ لڑائی اکثر رہ رہ کر ہوتی اور مٹی کی دیوار آخر کار گر جاتی ہے اور زبردست اور دلیر ہاتھی اس کو پھاند کر حریف پر حملہ کرتا اور اس کو بھگا دیتا ہے اور ایسا پیچھے دباتا ہے کہ آتش بازی کی چرخیوں کے بغیر جو ان کے بیچ میں چھوڑ دی جاتی ہیں، حریف سے الگ نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ جانور بالطبع ڈرپوک ہے اور خصوصاً آگ سے بہت ڈرتا ہے اور یہی سبب ہے کہ جب سے آتشی ہتھیار لڑائی میں برتے جانے لگے ہیں؛ ہاتھی لڑائی میں بہت کم کارآمد رہ گئے ہیں اور اگرچہ سراندیپ کے ہاتھی سب سے زیادہ دلیر ہوتے ہیں، مگر خواہ کہیں کے ہوں، میدان جنگ میں لے جانے سے پہلے برسوں تک ڈر نکالنے کے لیے ان کے کانوں کے پاس پٹاخے چھوڑے جاتے ہیں۔

ان عظیم الشان جانوروں کی لڑائی کا خاتمہ بڑی بے دردی پر ہوتا ہے۔ یعنی اکثر یہ ہوتا ہے کہ ہاتھی اپنے حریف کے مہاوت کو اپنی سونڈ سے پکڑ کر نیچے گرا لیتا اور فوراً پاؤں سے کچل ڈالتا ہے۔ مہاوتوں کا کام ایسا خطرناک ہے کہ یہ بدنصیب آدمی اپنے جوروُ بچوں سے اس طرح پر رخصت ہوتے ہیں کہ گویا مرنے کو جاتے ہیں۔ لیکن انکے دل کو اس خیال

سے کسی قدر تسلی رہتی ہے کہ اگر زندہ بچے اور بادشاہ ان کی کارگزاری سے راضی ہوا تو نہ صرف ان کی تنخواہ بڑھادی جائے گی بلکہ ہاتھی سے اترتے ہی پچیس روپے کے پیسوں کی ایک تھیلی مل جائے گی اور اگر کام آگئے تو ان کی تنخواہ ان کی بیوی کو ملتے رہے گی اور بیٹا ان کی جگہ نوکر ہو جائے گا۔ اس تماشے میں مہاوتوں ہی کی جان نہیں جاتی، بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان غضب ناک جانوروں سے بچنے کے لیے ایسی سخت بھگدڑ پڑتی ہے اور پیدل اور سوار اس طرح بھاگتے ہیں کہ بعض آدمی گر گر لوگوں یا خود ہاتھیوں کے پاؤں سے کچل جاتے ہیں۔ چنانچہ جب دوسری بار مجھ کو اس تماشے کے دیکھنے کا اتفاق ہوا تو صرف اپنے گھوڑے کی خوبی اور دو خدمت گاروں کی کوشش کی بدولت میں بچ سکا۔

جامع مسجد دہلی

اب موقع ہے کہ میں قلعہ کا ذکر چھیڑوں اور پھر شہر کی طرف رجوع کروں۔ جس کی دو عمارتوں کا ذکر کرنا اب تک باقی ہے۔ چنانچہ ان میں سے ایک تو بڑی مسجد[1] ہے جو وسط شہر میں ایک مرتفع پہاڑی پر واقع ہونے کے سبب سے

---

[1] اس مسجد کی بنیاد ۱۰ شوال ۱۰۶۰ھ مطابق ۱۶۵۰ء شاہجہاں کے چوبیسویں سال جلوس میں رکھی گئی تھی اور ہر روز پانچ ہزار راج مزدور بیل دار اور سنگ تراش کام کرتے تھے اور باوجود اس اہتمام کے چھ برس میں دس لاکھ روپیہ کے خرچ سے تیار ہوئی، اس کے تین گنبد ہیں۔ نوّے گز طول اور تیس گز کے عرض میں اور اندر کو سات محرابیں ہیں، اور باہر صحن کی طرف گیارہ دروانے ہیں جن میں ایک تو بہت بلند ہے اور پانچ ادھر ادھر والے ذرا نیچے ہیں اور بڑے دروانے پر کلمہ "یا ہادی" بطور طغرا اور باقی دروازوں پر شاہ جہاں کے نام کا کتبہ اور تاریخ تعمیر اور زر مصارف جس کو نور اللہ خوشنویس نے بخط نسخ۔ لکھا تھا سنگِ موسیٰ کی پچی کاری سے بنا ہوا ہے اور دروانے کے دونوں طرف نہایت خوش نما اور بلند مینار ہیں جن میں اوپر جانے کے لیے زینے اور سروں پر بارہ دری کی برجیاں، بہت دل کشا بنی ہوتی ہیں۔ شمالی مینارہ بجلی کے صدمے سے گر پڑا تھا اور عمارت اور صحن کا فرش بھی جو تمام سنگِ سرخ کا ہے، جا بجا سے بگڑ گیا تھا، مگر سرکار عالیہ انگریزی نے ۱۲۳۲ھ مطابق

جاری۔ ص ۱۹۲

بہت دور سے نظر آتی ہے۔ اس کی بنیاد رکھنے سے پہلے پہاڑی کی سطح کو خوب ہموار کر دیا گیا اور چاروں طرف چوکور میدان کھول دیا گیا تھا، جہاں مسجد کی چاروں سمتوں سے چار بڑے بازار آکر ملتے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے ایک تو صدر دروازے کے سامنے ہے اور دوسرا عقب میں اور دو دونوں بغلی دروازے کے محاذی اور اندر جانے کے لیے تینوں ضلعوں میں کوئی پچیس پچیس یا تیس تیس پتھر کی خوبصورت سیڑھیاں بنتی چلی گئیں ہیں، اور پشت کی جانب پہاڑی کی اونچائی تک پتھر گڑھ کر اور خوبصورت صاف کر کے لگائے گئے ہیں جن سے پہاڑی کی ناہمواری چھپ کر عمارت خوبصورت ہو گئی ہے۔ اس کے تینوں دروازے سنگِ سرخ سے بنے ہیں اور نہایت عالی شان ہیں اور ان کے کواڑوں پر تانبے یا پیتل کی پتیاں جڑی ہوئی ہیں، صدر دروازہ جس پر سفید سنگِ مرمر کی چھوٹی چھوٹی برجیاں بنی ہوئی ہیں اور بہت خوشنما معلوم ہوتی ہیں، زیادہ شان دار ہے۔ مسجد کے پیچھے کے حصے میں تین بڑے بڑے گنبد ہیں، جن کے اندر اور باہر سفید سنگِ مرمر لگا ہوا ہے بیچ کا گنبد دوسروں کی بہ نسبت بہت بڑا اور اونچا ہے اور مسجد کا صرف یہی حصہ مسقّف ہے۔ باقی گنبدوں سے لے کر صدر دروازہ تک بالکل کھلا ہوا ہے، جو گرمی کی وجہ سے کھلا رکھنا ضروری ہے اور مسجد کے اندرونی حصہ میں سفید سنگِ مرمر کا (جس پر سنگِ موسی کی تحریر سے مصلے بنے ہوئے ہیں) اور بیرونی حصہ میں سنگِ سرخ کی سلوں کا فرش ہے۔

(حاشیہ بقیہ صفحہ ۱۹۱) ۱۸۱۷ء میں اس مینار کو بنوا دیا اور فرش بھی درست کرا دیا۔ اس مسجد میں چونکہ کوئی مکبر بنا ہوا نہ تھا اور اس وجہ سے امام کی آواز تکبیر سب نمازیوں کو نہیں پہنچ سکتی تھی، اس واسطے شاہزادہ مرزا سلیم ابن معین الدین محمد اکبر بادشاہ نے ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں بڑے دروازے کے بیچ میں ایک مکبر سنگِ باسی کا بہت خوش نما بنوا دیا ہے مسجد کے اندر تمام فرش سنگِ مرمر کا ہے اور اس میں سنگِ موسی کی پچی کاری سے مصلے بنا دیے ہیں۔ ممبر بھی سنگِ مرمر کا بہت خوش قطع بنا ہوا ہے۔

______ ؛ تینوں گنبدوں اور چھوٹی برجیوں کے سوا جو سنگِ مرمر کی ہیں، باقی
عمارت سنگِ سرخ سے بنی ہوئی ہے، جو سنگِ مرمر کی بہ نسبت ذرا نرم ہے اور استدادِ زمانہ
سے اس میں سے ورق جھڑنے لگ جاتے ہیں۔ ہندوستان کے لوگوں کا یہ قول ہے کہ جس
کان سے یہ پتھر نکلتا ہے، کچھ مدت بعد اس میں پھر پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر یہ بات سچ ہے
تو نہایت عجیب ہے اور غلط یا صحیح اس کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ برسات کے دنوں میں
کان میں پانی بھر جاتا ہے، مگر میں اس امر کی نسبت کوئی قطعی رائے نہیں دے سکتا۔

شمالی دالان میں کچھ تبرکات جنابِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے رکھے ہیں اور وہ
مقام درگاہ آثار شریف کہلاتا ہے۔ مسجد کا صحن ایک سو چھتیس گز کے عرض و طول کا ہے
اور اس کے بیچ میں پندرہ اور بارہ گز کا نرے سنگِ مرمر کا حوض ہے۔ جس میں فوارہ
لگا ہوا ہے۔ صحن کے چاروں طرف بڑے بڑے دالان اور حجرے بنے ہوئے ہیں، اور
مکانات بنے ہوئے ہیں اور چاروں کونوں پر بارہ دری کے چار برج ہیں۔ جنوبی اور شرقی
دالان کے سامنے دائرہ ہندی نماز کا وقت دیکھنے کو بنا ہوا ہے اور مسجد کے تینوں دروازوں
میں برنجی کواڑ چڑھے ہوئے ہیں۔ جنوبی دروازہ پر رہنے کے لائق حجرے بنے ہوئے ہیں اور
پینتیس سیڑھیاں ہیں، جن پر تیسرے پہر کو مجمع عام ہوتا ہے اور بساطی اور فالودہ والے
اور کبابی اور اصیل مرغ بیچنے والے اور شوقین جوان انڈے لڑانے والے آن کر جمع
ہوتے ہیں۔ شمالی دروازہ میں بھی رہنے کے حجرے بنے ہوئے ہیں اور اس طرف
انتالیس سیڑھیاں ہیں، اگرچہ اس طرف بھی کبابی بیٹھتے ہیں اور سودے والے دوکانیں
لگاتے ہیں، لیکن بڑا تماشا اس طرف مداریوں اور قصہ خوانوں کا ہوتا ہے۔ قصہ خوان
مونڈھا بچھا کر بیٹھتا ہے اور داستان امیر حمزہ یا قصہ حاتم طائی اور کہیں داستان بوستان
خیال سناتا ہے، جس کے سننے کو سینکڑوں آدمی جمع ہوتے ہیں۔ ایک طرف مداری
تماشا کرتا ہے اور بھان متی کا کھیل ہوتا ہے اور بوڑھے کو جوان اور جوان کو بوڑھا بناتا ہے
شرقی دروازے پر بھی مکانات بنے ہوئے ہیں اور اس کی سیڑھیاں پینتیس ہیں اور
جن پر ہر روز گزری لگتی ہے۔ جو گویا ہر روز کا میلا ہے۔

بادشاہ ہر جمعہ کو (جو مسلمان ملکوں میں ہمارے اتوار کی طرح مقدس سمجھا جاتا ہے) اس مسجد میں نماز پڑھنے کو جاتا ہے اور جس راستے سے اس کا گذر ہوتا ہے، اس میں پہلے سے گرمی اور گرد و غبار کے فرو ہو جانے کے لیے چھڑکاؤ کر دیا جاتا ہے اور قلعہ کے دروازے سے لے کر مسجد تک تین یا چار سو سپاہی دو رویہ صف باندھے کھڑے ہوتے ہیں، جن کے پاس چھوٹی چھوٹی مگر بہت خوبصورت بندوقیں ہوتی ہیں جن پر سرخ بانات کا غلاف ہوتا ہے اور اس کے سر پر ایک چھوٹا سا پھریرا۔ — پانچ یا چھ عمدہ سوار قلعہ کے دروازہ پر اس غرض سے موجود رہتے ہیں کہ سواری کے وقت راستہ کھلا اور صاف رکھیں اور وہ اتنے فاصلے سے آگے آگے چلتے ہیں کہ ان کی گرد سے بادشاہ کو تکلیف نہ پہنچے اور جب یہ ساری تیاری ہو جاتی ہے تو بادشاہ قلعہ سے کبھی تو ہاتھی پر (جو خوب سجایا ہوا اور جس پر سنہری اور منقش کام کی عماری کسی ہوئی ہوتی ہے) سوار ہوتا ہے۔ اور کبھی سنہری اور لاجوردی کام کے تختِ رواں پر جو کمخاب وغیرہ سے منڈھے ہوئے ڈنڈوں پر بندھا ہوا ہوتا ہے اور جس کو آٹھ چیدہ اور بھاری بھاری وردیوں والے کہار کاندھے پر اٹھاتے ہیں، سوار ہوتا ہے اور پیچھے پیچھے بہت سے امراء ہوتے ہیں جو بعض تو گھوڑوں پر اور بعضے پالکیوں میں سوار ہوتے ہیں، اور انہیں میں ملے جلے بہت سے منصب دار اور چاندی کی چھڑیوں والے چوب دار وغیرہ ہوتے ہیں۔ میں اس سواری کو سلطان روم کی باشان و شوکت سواری سے تشبیہ نہیں دے سکتا اور نہ بادشاہان یورپ کے جنگی طرز کے جلوس سے کیونکہ اس کا تجمل اور شان و شوکت کچھ اور ہی طرح کی ہے مگر کچھ کم شاہانہ نہیں ہے۔

کاروانسرا دوسری قابل الذکر عمارت وہ کاروان سرا ہے جو شاہجہاں کی بڑی بیٹی معروف بیگم صاحب نے (جس کا میں نے گذشتہ لڑائی کی تاریخ میں بہت کچھ ذکر کیا ہے) بنوائی تھی۔ نہ صرف اس شاہزادی نے بلکہ اور امراء نے بھی بادشاہ کے خوش کرنے کو شہر کی رونق بڑھانے میں بہت روپیہ صرف کیا ہے، ایک بڑی اور محراب دار مربع عمارت ہے، بڑے بڑے چوک اور باغوں کے

بہت کم ہونے کی وجہ سے پیرس مجھ کو آدمیوں کے ایک بن کی مانند معلوم ہوتا ہے اور اس وجہ سے مجھ کو یقین ہے کہ جیسے آدمی اس میں ہیں اتنے ہی دہلی میں بھی ہوں گے، مگر جب ہندوستان کے اس دارالسلطنت کی وسعت اور بے شمار دوکانوں اور اس بات پر خیال کرتا ہوں کہ امراء کے علاوہ پینتیس ہزار سوار سے اس میں بھی کم نہیں رہتے، جو قریباً سب کے سب عیال دار اور صاحب اولاد ہیں اور سب کے پاس بہت سے نوکر چاکر ہیں جو اپنے آقاؤں کی طرح علیحدہ علیحدہ مکانوں میں رہتے ہیں اور کوئی ایسا گھر نہیں جس میں عورتیں اور لڑکے بالے موجود نہ ہوں اور شام کو جب ذرا گرمی کم ہو جاتی ہے، اور لوگ باہر نکلتے ہیں تو تمام سڑکیں اور گلی کوچے باوجود اپنی وسعت کے خلقت سے بھرے ہوئے نظر آتے ہیں اور پہیہ دار گاڑیاں (جن سے جگہ رُک جاتی ہے) بہت ہی کم دکھائی دیتی ہیں۔

ٹھیک طرح سے بتانا میرے لیے مشکل ہے کہ دہلی اور پیرس کی آبادی میں کیا نسبت ہے، لیکن میرے قیاس میں اگر پیرس کے برابر یہاں آدمی نہ ہوں تو کچھ زیادہ کم بھی نہ ہوں گے۔ البتہ اگر آسودہ حال لوگوں پر نظر کی جائے تو بیشک پیرس میں اور اس میں ایک نمایاں تفاوت معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ پیرس میں دس میں سے سات یا آٹھ آدمی کپڑے لتے سے درست اور معقول صورت نظر آتے ہیں۔ لیکن دہلی میں صرف دو یا تین آدمی ایسے دکھائی دیتے ہیں تو بیچارے فوجی ملازمت کے لیے یہاں چلے آتے ہیں میں اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ مجھے اکثر ایسے لوگوں سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوا ہے جو اچھے وجیہہ اور عمدہ اور ستھرا لباس پہنے اور عمدہ گھوڑوں پر چڑھے ہوئے اور نفر خدمت گار ساتھ لیے ہوئے ہوتے ہیں۔

امراء کی سواری جس وقت امراء اور راجہ اور منصب دار لوگ چوکی دینے یا دربار میں حاضر ہونے کو آتے ہیں تو اس چوک سے جو قلعہ کے سامنے ہے کوئی زیادہ بارونق مقام نظر نہیں آتا۔ چنانچہ چاروں طرف سے بہت سے منصب دار ساز و سامان سے درست، عمدہ گھوڑوں پر چڑھے ہوئے اور چار خوش پوشاک خدمت گار ساتھ

لیے ہوئے، جن میں سے دو پیچھے اور دو راستہ کھلا رکھنے کے لیے آگے آگے رہتے ہیں۔

امرا اور راجہ بعضے تو گھوڑوں پر اور بعضے عمدہ ہاتھیوں پر اور اکثر ملکعب پالکیوں میں جس میں چھ چھ کہار لگے ہوئے ہوتے ہیں، زربفت کا تکیہ لگائے پان چباتے آتے ہیں جس سے مقصود ہوتا ہے کہ منھ خوشبودار اور ہونٹ سُرخ ہو جائیں اور پالکی کے ایک طرف تو ایک خدمت گار دانت خلال اور چاندی یا چینی کا اگالدان، جس کا حقہ کے ساتھ ہونا ضروری ہے لیے ہوئے ہوتا ہے اور دوسری جانب دو خدمت گار ہوتے ہیں، جو اپنے آسائش پسند مالک کو پنکھا جھلتے یا گرد و غبار اور مکھیاں اڑانے کو مورچھل ہلاتے ہیں اور تین چار پیادے راستہ کھلا رکھنے کے لیے آگے آگے دوڑتے اور کچھ منتخب اور وجیہ خوش لباس جوان گھوڑوں پر چڑھے ہوئے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔

مضافات شہر

دہلی کے نواح کی زمین نہایت زرخیز ہے اور اس میں ایکھ، گیہوں، جو، نیل، دھان، باجرہ، جوار، مونگ، ماش اور موٹھ وغیرہ جو عام لوگوں کی خوراک ہے بافراط پیدا ہوتے ہیں۔

دہلی سے چھ میل آگرہ کے راستہ پر ایک مقام ہے جس کو مسلمان "قطب صاحب" کہتے ہیں اور یہاں ایک بہت قدیم عمارت[1] ہے جو کبھی ہندوؤں کا دھرم استھان تھا۔

---

[1] مصنف کا مقصود غالباً مندر ہے جس کو ہندوستان کے مشہور راجہ پرتھی راج عرف رائے پتھورا نے سنہ ۱۲۰۰ بکرماجیتی مطابق ۱۱۴۳ء اور ۵۳۸ھ میں اپنے قلعہ کے ساتھ بنوایا تھا اور ۵۸۷ھ مطابق ۱۱۹۱ء اور موافق ۱۲۴۸ بکرماجیتی میں معزالدین بن سام عرف شہاب الدین غوری کے سپہ سالار قطب الدین ایبک نے جو آخر کار دہلی کا بادشاہ ہوا، اور سلطان قطب الدین کہلایا۔ دہلی کو فتح کیا تو اس کو مسجد بنا دیا اور شرقی دروازے پر فتح کی تاریخ اور اپنے نام کا کتبہ کھدوایا مگر کوئی ایسے حروف جن کی طرف مصنف نے اشارہ کیا ہے اس پر کہیں کندہ نہیں ہیں۔ البتہ اس کے صحن میں ایک لاٹھ ہے جو سر سے پاؤں تک لوہے کی ڈھلی ہوئی ہے اور جو زمین پر سے بائیس فٹ چھ انچ بلند ہے۔

عہد محمد شاہی میں

شاہجہاں آباد کی تہذیبی جھلکیاں

مغلوں کی جہاں داری کا دن بے نور ہوا تو اس کی شام زوال کے سائے کچھ دیر کے لیے شفق کے رنگا رنگ پھولوں کی طرح اس کی بساط تہذیب پر بکھرے ہوئے نظر آئے۔

شہر دہلی جو اس وقت شاہجہاں آباد ہی نہیں جہاں آباد تھا۔ مغلوں کی عظیم الشان سلطنت کا دار الریاست اور قسطنطنیہ سے لے کر کینٹون تک مشرق کا شاید سب سے زیادہ متموّل اور متمدّن شہر تھا اس کی مسجدوں کے بلند مینار، پرشکوہ گنبد، اس کے پر رونق بازار اور خم بہ خم گلیاں جن کو میر نے "اوراق مصور" کہا ہے اور جہاں نظر آنے والی ہر شکل تصویر بنی نظر آتی تھی۔ اس کے محلات، مقابر، خانقاہیں اور مدرسے، اسے سرزمین مشرق کی آبرو بنائے ہوئے تھے۔ سلطنت میں ضعف آگیا تھا لیکن تنعّم و تعیش کی سطح پر شہر کی رونق کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ شمشیر و سناں کی جگہ رفتہ رفتہ طاؤس و رباب کو مل گئی تھی اور دہلی کی فضا شعر و نغمہ سے گونج رہی تھی۔

عہد محمد شاہی کئی اعتبار سے مغلوں کے دور وسطی کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ عالمگیر کی وفات (۱۷۰۷ء) اور بہادر شاہ اوّل کے مختصر مگر پرامن دور حکمرانی کے بعد (۱۷۱۲ء) پہلی بار ایک بادشاہ کو باقاعدگی سے ایک طویل عرصہ تک حکومت کرنے کا موقع ملا تھا، معاربوں اور مہمات کے خاتمہ کے بعد تخت و تاج کے حصول کے لیے شہزادوں کی مسلسل بغاوتوں اور بادشاہ گروں کی سیاسی و عسکری بالادستی کا سلسلہ بھی ختم ہو چکا تھا جس میں جہاں دار شاہ کی بادشاہت سے لے کر محمد شاہ کی خود مختاری تک کے درمیانی وقفہ میں بہت سے مغل شہزادوں کے ماسوا بے شمار امیروں،

امیرزادوں، عمایدِ شہر اور جلیل القدر اراکین سے سلطنت کا قتل عمل میں آیا اور جس کے
یہ زمانہ دہلی کے لیئے "آسیب زدگی" کے دور سے کچھ کم نہ تھا۔ نادر شاہ درانی کا خون آشام حملہ ابھی نہ ہوا تھا اور دہلی اور اہل دہلی محمد شاہ رنگیلے کی چھتر چھایا میں کچھ اطمینان و سکون کا سانس لے رہے تھے۔

فنون لطیفہ اور بالخصوص موسیقی کا احیاء اس شان وآن سے عمل میں آیا تھا کہ موسیقاروں اور کلاونتوں کو بڑے بڑے شاہی عہدے مل گئے تھے۔ اور خود شاہی خاندان کے افراد "نشاطِ نغمہ دمے" کے بے طرح دلدادہ (ہو گئے) تھے۔ طوائفوں کے ادارہ کے اثر ورسوخ اور شہری وشاہی معاشرت کی طرف سے اس کی سرپرستی نے دہلی کی بساط زندگی کو "بساط رقص" بنا رکھا تھا۔ اہل ارادت کے جلسے ہوں یا ارباب دولت کی محفلیں، غرضیکہ ہر بزم سے تار وطنبور کی صدائیں بلند ہوتیں اور ہر انجمن سے سرود ونغمہ کی دل نشیں آوازیں آتی تھیں۔

غالب نے جو کچھ اپنے زمانے کی دہلی کے لیے کہا تھا وہ عہد محمد شاہی کی دہلی پر زیادہ بہتر طور سے صادق آتا ہے۔

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنّتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے
ساقی بجلوہ، دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین وہوش ہے

غرض کہ اس وقت دہلی کی بساط زیست کا ہر گوشہ دامان باغبان وکف گل فروش بنا ہوا نظر آتا تھا۔

محمد شاہ کی رنگیلی طبیعت، اہل شہر کی حسن پرستی اور امراء کی نازک مزاجیوں نے شہر کی دل کشی میں غیر معمولی اضافہ کر دیا تھا۔

سید ہاشمی فرید آبادی نے "تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت میں عہد محمد شاہی کی دہلی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"بادشاہ کا شوقِ تعمیر بھی عیش پرستی کی لذّت سے خالی نہ تھا۔ حیات بخش

اور مہتاب باغ اس لیے بنائے تھے کہ افکارِ سلطنت کی بو تک وہاں نہ آئے لیکن یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اس کی پیروی میں دس بارہ سال کے اندر دہلی کے باہر بیسیوں باغ تیار ہو گئے۔ باڑلی سے مہرولی تک مشجر کا حاشیہ لگ گیا اور یہ قیاس تاریخی شواہد پر مبنی ہے کہ نہ صرف مناظر و مذاق بلکہ شہر کا موسم تک بدل گیا تھا۔[۱]

اس عہد کی آرائشی تہذیب کا ایک پہلو اگر حسین و مہین لباس ہے جس کی تن زیبی کو بعض اہلِ خانقاہ تک پسند کرتے ہیں تو دوسری طرف ادا بیگم" جیسی بعض طوائفیں ہیں۔ جو حصہ زیریں جسم پر صرف خوب صورت اور نظر فریب آرائشی گل بوٹوں سے پردۂ نظر کا کام لیتی ہیں۔

عہد محمد شاہی کی دہلی ایک نئے لسانی اور ادبی مزاج کو اپنا رہی تھی۔ جس کا اندازہ ریختہ گوئی کی باقاعدہ تحریک سے بھی ہوتا ہے جس کے لیے سب سے قوی محرک وہ مذاق سخن ہے جسے ہندوؤں اور مسلمانوں کے "کلچرل اشتراک" نے نئے رسوم و آداب کے ساتھ دہلی کے ذہنی افق پر قوس قزح کی طرح اُبھار دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب دہلی کا دیوان دہلی پہنچا تو بقول مولانا محمد حسین آزاد ــــــ

"اشتیاق نے ادب کے ہاتھوں پر لیا، قدردانی نے غور کی آنکھوں سے دیکھا، لذت کی زبان سے پڑھا، گیت موقوف ہو گئے قوال معرفت کی محفلوں میں انھیں کی غزلیں گانے لگے ارباب نشاط یاروں کو سنانے لگے جو طبیعت موزوں رکھتے تھے انھیں دیوان بنانے کا شوق ہوا"۔[۲]

اب یہ دوسری بات ہے کہ یہ عمدہ جوہر انسانیت جو پسندیدہ لباس پہن کر ہماری زبان میں آیا تھا۔ وہ فنقرار کے شوق یا تفریح کی ہوا سے اڑ کر آ گیا تھا۔ شاہنامے کے

---

[۱] تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت: ۲۸

[۲] آب حیات: ۸۷

ڈھنگ سے نہ آیا تھا جو شاہی محمد عیش پرستی کا خون بہاتا اور اہل ملک کو پھر تیموری یا بابری میدانوں میں لا ڈالتا یا تہذیب و شائستگی کے اعتبار سے اکبری عہد کو پھر زندہ کرتا۔

اس وقت کی دہلی کو عیش امروز کا تصور عزیز ہے اس کے سامنے، بڑے زمین و آسمان نہیں۔ لیکن پھر بھی یہ دہلی غیر معمولی شخصیتوں سے خالی نہیں اس میں شاہ ولی اللہ جیسا مدبر اور معلّم بھی موجود ہے جس کا ہاتھ زمانہ کی نبض پر ہے اور جس کی نظر سرمئی افق پر ستارۂ شام کے طلوع کی منتظر ہے۔ حضرت شاہ کلیم اللہ جیسے فقرار بھی ہیں جو اصلاح و تربیت کا ایک باقاعدہ نظام قائم کرنے کی مبارک کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ ارباب فقر کی خانقاہیں جگہ جگہ موجود ہیں اور اس بھیلتی ہوئی شام کے دھندلکے میں جن کا وجود "قندیل رہبانی" کا کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

نواب درگاہ قلی خاں، سالار جنگ اوّل نے، عہد محمد شاہی کی دہلی کو ان تاریخی لمحات میں دیکھا تھا جب نادر شاہ درّانی کا حملہ (۱۷۳۸ء) ہونے والا تھا۔ وہ آصف جاہ اوّل کے ہمرکاب تھے اور اہل دہلی کے ساتھ خود بھی اس "موج خون" کے شناور ہوئے جو نادر شاہ کی خوں آشام یورش کے ساتھ، دہلی اور اہل دہلی کے سر سے گزری تھی۔ ان کی یادگار زمانہ یادداشتیں اس عہد کی دہلی کی تہذیبی بساط پر رقص کرتی ہوئی پرچھائیوں کے مطالعہ کے لیے، ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جسے آج "مرقع دہلی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

پروفیسر محمد مجیب نے "مرقع دہلی" کے مشتملات کے سلسلہ میں جو لکھا ہے وہ نہ صرف اس مرقع بلکہ تاریخ و تہذیب کی نقش گری اور اس کے مطالعہ کے لیے ایک رہنما اصول کی سی حیثیت رکھتا ہے۔

"مرقع دہلی میں نہ کچھ الف لیلیٰ کی شان ہے نہ کچھ محتسب کی رپورٹ کا شائبہ۔ دراصل وہ ایسے شخص کا بیان ہے، جس نے آنکھ کی دیکھی بات قلم سے لکھ دی بغیر اس بحث کو چھیڑے ہوئے کہ لوگ کیا کرتے ہیں اور مذہب کا تقاضہ کیا ہے۔ مرقع اخلاقی نقطۂ نظر سے لکھا گیا ہوتا تو اس میں حالات کا ایسا صاف عکس نہ ہوتا۔ اور پڑھنے والے کے دل میں یہ شبہہ پیدا ہوتا کہ کسی

ناصح نے اپنا غصہ اُتارنے کے لیے بے گناہوں کو خواہ مخواہ بدنام نہیں کیا ہے تو کم از کم ایسی باتوں کو جن میں کوئی خاص عیب نہیں ہے، بداخلاقی کی مثال بنالیا ہے اپنی موجودہ صورت میں مرقع حقیقت نگاری کی کوشش ہے جسے اعلیٰ اور پست اخلاقی کے مقامات اور مراتب سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ نتیجہ پڑھنے والا خود نکال سکتا ہے۔"

(جامعہ بابت ماہ جولائی ۱۹۶۳ء: ۳)

قدم شریف

"بر زمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بوَد
سالہا سجدۂ صاحب نظراں، خواہد بود

پنجشنبہ کے دن یہاں زائروں کے ہجوم کے باعث وہ بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے کہ ایک متنفس بھی طواف گاہ تک مشکل سے پہنچ سکتا ہے۔ ویسے یہاں رات دن مجمع رہتا ہے۔ فقراء اور زائرین دور دراز علاقوں اور شہروں سے یہاں زیارت کے لیے آتے ہیں اور عرس سراپا قدس کے ایام میں تو طائفوں کی کثرت کی وجہ سے وہ کیفیت ہوتی ہے کہ تل دھرنے کی جگہ نہیں رہتی جب تک آدمی صبح سویرے سے وہاں نہ پہنچ جائے بیٹھنے کے لیے جگہ نہیں ملتی۔ ان دنوں میں صاحبان دولت جو کھانے پینے کی چیزیں وہاں بھیجتے ہیں وہ فقراو مساکین میں تقسیم کرنے کے باوجود بچ جاتی ہیں۔

قدم گاہِ امام

قلعہ باد شاہی سے تین کوس پر واقع ہے۔ اہلِ زیارت سعادت آخرذی کے حصول کے لیے شبینہ کے روز وہاں حاضر ہوتے ہیں اور مجرا و تسلیم کے پھول اپنے خلوصِ عقیدت کے گوشۂ دستار میں سجاتے ہیں۔ اکثر اپنی دلی مرادوں کے حصول کے لیے وہاں نذریں پیش کرتے ہیں اور ان کی آرزوئیں بر آتی ہیں۔ محرّم کی بارھویں تاریخ کو جو خامس آلِ عبا کی زیارت کا دن ہے، اربابِ عزا دلِ محزوں اور چشمِ گریاں کے ساتھ عزا پرسی و ماتم داری کے لیے اس مکانِ خُلد آشیاں میں جمع ہوتے ہیں اور شرائطِ زیارت بجا لاتے ہیں۔

اس روز، سب وضیع و شریف، وہاں حاضری دیتے ہیں۔ اور سواریوں کی کثرت کے باعث، راستے اور سڑکیں چیونٹی کی آنکھ کی طرح، تنگ نظر آتی ہیں۔ اہلِ حرفہ وہاں اپنی اپنی دُکانیں لگاتے ہیں اور خوب نفع کماتے ہیں۔ اور چوکی خانہ میں کہ مومنین کے لیے مکان معیّن ہے منقبت خوانی کرنے والے بلند آہنگی کے ساتھ قصاید عزا پڑھتے ہیں اور اس بارگاہ معجز پناہ سے منشورِ نجات حاصل کرتے ہیں۔

درگاہ قطب الاقطاب

اربابِ تمنا فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد اس مرقدِ عالی کے طواف کے لیے حاضر ہوتے ہیں اور گلہائے مراد سے اپنا دامن بھرتے ہیں۔ یہاں زیارت کرنے والے صبح و شام آتے ہی رہتے ہیں۔ خاص طور پر پنجشنبہ کے روز عجیب مجمع ہوتا ہے۔ صاحبانِ استعداد رات دن دہلی سے زیارت کے ارادے سے یہاں آتے ۔ ۔ ۔ ۔ اور اس سعادت کے حصول کے بعد یہاں کے سبزہ زاروں کی سیر کرتے ہیں۔ آپ کے مبارک قدموں کی برکت سے یہاں ہر طرف ہریالی ہی ہریالی ہے اور چشمے کٹورہ بنے رہتے ہیں۔ بالخصوص حوضِ شمسی کا جھروکہ، جو یہاں کے متبرک چشموں میں سے ہے۔ اور اہلِ عقیدت اس سے گوناگوں تمتعات حاصل کرتے ہیں۔

ربیع الاوّل کی ۱۶ر تاریخ کو عرس ہوتا ہے اور ایک دنیا زیارت کی نیت سے بے اختیار یہاں کھنچی چلی آتی ہے۔ لوگ دو روز تک یہاں کی سیر سے لطف اٹھاتے ہیں۔ قوال ہمیشہ دور سے قبر مبارک کے سامنے ایستادہ ہوکر اور کبھی بیٹھ کر مجرا پیش کرتے ہیں۔

مرقد مبارک سلطان المشائخ حضرت محبوب الٰہی

اس مرقد فردوس آئین سے کچھ عجیب کیفیات محسوس ہوتی ہیں، جن کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ہر چہار شنبہ کو خواص و عوام احرام زیارت باندھ کر یہاں پہنچتے ہیں اور قوال بڑے ادب کے ساتھ کھڑے ہوکر مجرے کی رسومات بجالاتے ہیں۔ خاص طور پر ماہ صفر کے آخری چہار شنبہ کو زائرین کا طرفہ ہجوم، اور عجب کثرت ہوتی ہے۔ دلی والے بہت بن سنور کر وہاں پہنچتے ہیں اور مراسم زیارت کی ادائیگی کے بعد ان باغیچوں اور چمن زاروں کی سیر کرتے ہیں جو اس روضۂ مبارک کے پاس کثرت سے موجود ہیں۔ اہل حرفہ بہت ترتیب و تزئین کے ساتھ یہاں جگہ جگہ اپنے ڈیرے جماتے ہیں اور تماشائیوں کو ان کی مرغوب چیزیں پیش کرتے ہیں۔ مطربوں کے نغمات کی کثرت کے باعث کوئی اور آواز گوش آشنا نہیں ہوتی۔ ہر گوشہ میں نقّال اور رقص کرنے والے خوش ادائی کی داد دیتے ہیں۔

چہاردہم ربیع الثانی عرس مبارک کا دن ہے جب یہاں کے آس پاس کا علاقہ خیموں اور ڈیروں کی کثرت کے سبب بالکل گھر جاتا ہے۔ تمام رات نوبت بہ نوبت قوال مجرا پیش کرتے ہیں۔ صوفیا اور اہل حال پر وجد طاری ہوتا ہے اور "یا ہیر" کی مجلسیں تو بہت بہت دیر تک چلتی اور بہت شور و شغب برپا ہوتا ہے اس فرقہ کے لوگ اور دوسرے اہل زیارت تمام رات جاگتے رہتے ہیں اور بیشتر اس قدم مرقد منوّر کے اطراف میں مراقبے میں مصروف رہتے ہیں اور بعض تلاوت قرآن پاک میں صبح کرلے ہیں۔

حضرت نصیر الدین چراغ دہلی

"آپ درحقیقت چراغِ دہلی بلکہ تمام ہندوستان کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کے مزار

پُرانوار کی زیارت کے لیئے یکشنبہ کا دن ہے۔ خاص طور پر جس ماہ میں دیوالی کا تہوار آتا ہے۔ وہاں طرفہ ہجوم ہوتا ہے۔ اس ماہ دہلی کے رہنے والے حضرت کے مزار پُرانوار کی زیارت کے لیے دہاں جاتے اور درگاہ کے قریب چشمے کے کنارے خیمے اور سراپردے ایستادہ کرتے ہیں، چشمہ میں غسل کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں بہت سے پرانے مریض شفا پا جاتے ہیں۔ رسوم زیارت کی بجاآوری میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر کے شریک رہتے ہیں۔

طلوع صبح سے لے کر غروب آفتاب تک زائرین قافلہ در قافلہ وہاں پہنچتے ہیں اور دیواروں کے سایے اور درختوں کے نیچے فرش فروش بچھا ئے جاتے ہیں۔ محفلیں جمتی ہیں اور من چلے لوگوں کی ٹولیاں خوش دلی کی داد دیتی ہیں۔ عجیب سیر اور طرفہ تمشا ہوتا ہے۔ ہر طرف راگ رنگ کے جلسے اور ہر گوشہ میں پکھاوج اور مورچنگ کی آوازیں......"

مزار مرزا بیدل رحمتہ اللہ علیہ

ان کا مزار مبارک ایک خاص موزونیت کے ساتھ بنا ہے۔ پرانی دہلی میں یہ ایک مختصر سے احاطے میں واقع ہے۔ جیسے مرزا بیدل کے اپنے کلام میں الفاظ کے رنگین حلقے ہیں" ایجازِ معنے" ماہ صفر کی تیسری تاریخ کو عرس شریف ہوتا ہے جس میں مرزا کے تمام تلامذہ اور موزونانِ شہر ان کی روح سے استفادہ کے لیے حاضر ہوتے ہیں اور مرزا بیدل کے قریب حلقہ مجلس ترتیب دیتے ہیں اور نہایت ہی نفیس خط میں لکھا ہوا ان کا کلیات' درمیان میں رکھ لیا جاتا ہے۔ ان کے اشعار سے اس بزم سخن کا افتتاح ہوتا ہے۔ بعدازاں دوسرے شعراء اپنے اپنے مرتبے کے مطابق کلام سناتے اور اپنے نتائج افکار سے سامعین کو محفوظ کرتے ہیں۔ ایک طرفہ انبساط اور عجیب لطف والی محفل ہوتی ہے۔

بزرگان دین کے عرس آئے دن ہوتے ہیں۔ ماہ رجب کی تیسویں تاریخ کو حضرت

شاہ ترکمان کا عرس مقدس ہوتا ہے۔ روشنی کی رات میں چراغوں اور قندیلوں کی روشنیوں سے آسمان کا آنگن نور سے بھر جاتا ہے اور پھولوں کی کثرت سے دامن صبا معطر ہو جاتا ہے۔ حضرت شاہ حسن رسول نما کے عرسِ سراپا قدس کی رسوم ماہ شعبان کی اکیسویں تاریخ کو ادا کی جاتی ہیں۔ مزار شریف کو سجایا جاتا ہے۔ صبح سے شام تک قوالوں کی ٹولیاں آتی اور مجرا پیش کرتی رہتی ہیں۔ شاہ عزیز اللہ کے عرس میں بوڑھے بچے سبھی، خوشی خوشی، شریک ہوتے اور جھومتے جھامتے وہاں تک پہنچتے ہیں۔ حضرت باقی باللہ کے مزار پُر انوار پر کچھ اس طرح اللہ کی رحمت برستی ہے کہ سخت گرمیوں کے موسم میں جب دھوپ کی تمازت اور لو کی شدت کے باعث آسمان سے آگ برستی اور زمین سے لپٹیں اُٹھتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں، حضرت کے مزارِ کرامت آثار کے گرد ٹھنڈک رہتی ہے۔ جو دل کو سکوں اور دماغ کو تازگی بخشتی ہے۔

جشن ولادت حضور پُر نور

عرب کی سرائے میں حضورؐ پُر نورؐ کی ولادت کا جشن مقدس دوازدہم ربیع الاوّل کو اس انداز سے منایا جاتا ہے۔

دو ہزار اعرابی اس مسجد کے صحن میں، جو عرب سرائے کے وسط میں واقع ہے۔ جمع ہوتے ہیں۔ تمام شب اس محفل میلاد میں زمزمہ سنجی کرتے ہیں اور آنحضرتؐ کی شان میں شعرائے عرب نے جو نعتیہ اشعار اور قصائد موزوں کیے ہیں انھیں پُر اثر لہجوں کے ساتھ پڑھتے ہیں جس سے اہل تحقیق (صوفیا) پر حالت وجد طاری ہو جاتی ہے ہر طرف سے صدائے درود سلام اور ہر سمت سے تسبیح و تھلیل کی آواز کانوں میں آتی ہے۔ اور جیسے ہی صبح کے آثار نمودار ہوتے ہیں ختم قرآن پاک میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

اہل شہر خصوصاً صوفیا اور صُلحا تقاضائے دِلی کے زیر اثر اس صومعۂ مقدس میں

آتے ہیں اور ثوابات اخروی کے حصول اور مقاصد معنوی کے اکتساب میں کامیاب ہوتے ہیں۔ جو اور اگ معنی میں تفاوت کے قایل ہیں وہ اس حال و قال کی مجلس میں سیر ظاہر اور تماشائے باطن میں مصروف رہتے ہیں۔ اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو عرب کے صبیح و ملیح لڑکوں کے دیدار کے لیے اس طرف رخ کرتے ہیں۔

اس وقت کی دہلی میں صرف بزرگان دین اور اہل اللہ ہی کے مزارات پر عرس نہیں ہوتے اہل دول کے مقابر بھی تقاریب عرس منائی جاتی ہیں۔ راگ رنگ کی محفلیں جمتی ہیں اور مئے و معشوق سے بے محابا دل چسپیوں کے مناظر سامنے آتے ہیں۔ "خلد منزل" کے عرس کے موقع پر جو رنگ رلیاں ہوتی ہیں ان کی تصویر صاحبِ "مرقع" نے اس رنگ میں پیش کی ہے۔

عُرس خُلد منزل

ماہ محرم کی تیئسویں تاریخ کو عرس مذکور کی تقریب عمل میں آتی ہے۔ خُلد منزل کی قبر حضرت قطب الاقطاب کے روضہ شریف کے جوار میں واقع ہے۔ مہر پرور جو مرنے والے کی ملکہ ہے ایک ماہ پیشتر سے حیات خاں ناظر کے توسّل سے اس کے اہتمام میں لگ جاتی ہے۔ عجیب عجیب طریقوں سے اس مقام کی تزئین کی جاتی اور طرح طرح سے اس کو سجایا جاتا ہے۔ دربار شاہی کے چابک دست صناع اور ہنرمند دست کار طرفہ طرفہ کاری گری دکھلاتے ہیں۔

شب چراغاں میں چمکتے دمکتے ہوئے چراغ اور برج روشنیوں کا پیغام لے کر آسمانوں کی طرف جاتے اور تجلّیوں سے بھرے ہوئے فانوس چپہ چپہ کو گوشۂ وادیٔ ایمن بناتے ہیں

من چلے سیلانی اپنے معشوقوں کے ساتھ ہم آغوشی کے انداز میں سیر گشت کرتے ہوئے پھرتے ہیں۔ اور ... جذبات میں ڈوبے ہوئے لوگ کوچہ و برزن میں "رقص جمل" کا منظر پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شراب خانہ خراب کے متوالے

محتسب کے اندیشہ سے بے پروا شیشہ و جام سے دل بہلاتے ہیں اور رندان شاہد باز بے محابا شاہد پرستی کرتے ہوئے دیکھے جاتے ہیں۔ حسین امردوں اور نوخطوں کا وہ ہجوم کہ اسے دیکھیں تو زہاد کے تقوے ٹوٹ جائیں اور غزالوں جیسی آنکھوں والوں کی وہ ٹولیاں کہ اہلِ تقوے کو زندگی بھر توبہ یاد نہ آئے۔ نگاہ اٹھتی ہے تو حسین چہرے نظر کے سامنے ہوتے ہیں اور قدم اٹھتا ہے تو زلف گرہ گیر کے حلقۂ فتراک میں پھنس کر رہ جاتا ہے:

اسباب تعیش کی وہ فراوانی کہ دنیا جہان کے عیش پسند یہاں اپنی دلی مراد کو پہنچتے ہیں اور رنگ رلیاں منانے والے زندگی کی ان بھول بھلیوں میں کھو جاتے ہیں کسی کی ہوش کی آنکھیں کھلتی ہیں تو وہ دیکھتا ہے کہ کوئی امرد اسے لنکھیوں سے اشارہ کر رہا ہے اور اس سے بیشتر کہ کسی کی نظر ادھر جائے کوئی کسبی اُسے پیام عیش دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ہر گوشۂ بساط امرار و خواتین سے آراستہ رہتا ہے اور ہر گلی و کوچہ میں فقیروں اور دریوزہ گروں کے جمگھٹ دکھائی دیتے ہیں۔ وہ شور و غل ہوتا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ سازندے اور قوّال اتنے کہ کوئی گننا چاہے تو گن نہ سکے اور تماشائیوں کی وہ کثرت کہ خدا کی پناہ۔

مختصر یہ کہ وضیع و شریف سبھی یہاں آکر دادِ عیش دیتے ہیں اور جسمانی لذتوں سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ ایسے ہنگامے میں آنکھیں بند کر لینا عین مصلحت ہے اور نظر اٹھا کر کسی کی طرف نہ دیکھنا سرتا سر بھلائی۔

سچ یہ ہے کہ عرس کی تقریبات کے ایسے مواقع اہل شہر اور عیش پرست لوگوں کے لیے جشن ہائے بے تکلف کا درجہ رکھتے ہیں، جن میں شریک ہونے والے دل کھول کر دادِ عیش دیتے اور لطف اٹھاتے ہیں۔ شراب و کباب کا دور چلتا ہے، پُر تکلف ضیافتیں ہوتی ہیں اور رقص و سرود کی محفلیں جمتی ہیں۔ مرقع میں بعض دوسرے عرسوں کے علاوہ میر شرف کے عرس کا ذکر بھی اسی انداز کی ایک لفظی تصویر ہے۔

ذکرِ میر شریف

اس شمع روزگار کی قبر حضرت محبوب الٰہی کے مزار فائض الانوار کے قریب ایک

نزہت کدہ میں واقع ہے جس کی ہوا میں نسیم بہشت کی سی تازگی اور طراوت ہے۔ اس باغ کے احاطہ میں پانی کی ایک نہر نہایت دیدہ زیبی اور دل فریبی کے ساتھ بہتی ہوئی گذرتی ہے۔ گل و ریاحین کی کثرت کے باعث اس کی ہوائیں دل و دماغ کے لیے بڑی فرحت بخش اور سرور افزا ہیں۔ شہر کے رہنے والے خوش معاش اور عیش پسند لوگ برسات کی ہواؤں سے لطف اندوزی کے لیے آتے ہیں۔

شبنمی ہوائیں اس کی طراوت و تازگی مے نوشی کا تقاضا کرتیں اور اس پر فضا مقام کی سیر کو دل بے اختیار تار و طنبور کی صداؤں کی طرف کھینچتی ہے۔ میر کلّو یہاں طرفہ و زک و احتشام کے ساتھ تقریب عرس مناتا اور بڑے طمطراق کے ساتھ جشن چراغاں کا اہتمام کرتا ہے۔ روشوں کی تقطیع اور خیابانوں کی تختہ بندی کی جاتی ہے۔ تابدانوں کو بسایا جاتا ہے اور نہر کے کنارے جو کافی وسیع ہے، خوب صورت بنگلے، اور برج بنائے جاتے ہیں۔

عمدہ ہائے شاہی اور ارباب نشاط کو دعوت دی جاتی ہے۔ میر کلّو خود جوان العمر ہے اور تمام امیرزادوں سے آشنائی و شناسائی رکھتا ہے۔ اس لیے یہ لوگ اس کی رعایت خاطر کے باعث نشاط و انبساط کے ساز و سامان کے ساتھ یہاں آتے ہیں اور اپنے معشوقوں کو اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ ہرے بھرے درختوں کے نیچے خوب صورت گُل بوٹوں کے سائے اور تختہ ہائے چمن کے پہلو میں پھولوں جیسے حسین اور زرنگار خیمے لگائے جاتے ہیں اور راگ رنگ کی محفلیں جمتی ہیں۔ تمام رات رقص و سرور کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ عطر و پان اور نقل و میوہ سے تواضع کی جاتی ہے۔ طرح طرح کے خوش ذائقہ اور خوشبودار کھانے پکائے جاتے ہیں۔ ہر شخص کے مرتبہ کے مطابق مہمانی کی رسمیں ادا ہوتی ہیں۔ رات اگر شب برات کی طرح مطلع انوار ہوتی ہے تو صبح، صبح عید کی طرح پر بہار۔ بازگشت سے پہلے سیر تماشے کا عجیب عالم ہوتا ہے۔ مہمان خانے کے خیمے جو "خیمۂ دل بادل" سے مشابہ ہوتے ہیں، پانی کے کنارے ایستادہ کیے جاتے ہیں اور نئے عنوان سے محفل نشاط جو آراستہ کی جاتی ہے۔

ہے۔ ہر طرف فرش فروش لگائے اور مسندیں بچھائی جاتی ہیں اور لوازم ضیافت مہیا کیے جاتے ہیں۔ ارباب نشاط بلا کسی امتیاز کے سرگرم رقص ہوتے ہیں، اور قوال مہمان اور میزبان میں فرق نہ کرتے ہوئے نغمہ پردازیاں کرتے ہیں۔ فقراء اور مشائخ کو ان نغمات پر وجد آتا ہے اور امیرزادے ان سے لطف اٹھاتے ہیں۔ غرض عجیب صحبت اور عجیب بزم بے تکلف ہوتی ہے۔ مشتہیات اور مرغوبات میں جو کچھ چاہیے، وہاں مہیا ہوتا ہے۔

یہ مزامیر اور لذائذ و لطائف تو خیر خاص خاص مواقع سے تعلق رکھتے ہیں، جہاں زندگی کی ان مدہوشانہ رنگ رلیوں اور ناعاقبت اندیشانہ عیش کوشیوں سے دلچسپی لینے والوں کے یہاں ہر روز، روزِ عید اور ہر رات شبِ برات ہوتی ہے۔ دہلی کے اس مرقع میں اس کوئے ملامت کے طواف کا بھی ذکر ہے۔ جسے کسل پورہ کہا جاتا ہے۔ جہاں یہ رنگ رلیاں سال کے بارہ مہینے اور مہینے کے تیس دن رہتی ہیں۔

کسل پورہ

کسل سنگھ امرائے بادشاہی میں سے ہے اور دولت و ثروت کے اعتبار سے اپنے ہم چشموں میں ممتاز ہے۔ اس نے ایک ایسی بستی بسائی ہے۔ اس میں ہر قسم کی ناپسندیدہ عورتیں اور کسبیوں (رال زادیوں)، کو لا کر آباد کیا ہے۔ بُرے لوگوں کو جو ہر قسم کے مُسکرات کے عادی ہوتے ہیں، اس کی چھتر چھایا میں یہاں عیش اڑانے کی دعوت عام ہے۔ اس جماعت کی کثرت کے باعث یہاں محتسب کا پائے نگاہ بھی نہیں پہنچ سکتا اور اس کے احتساب کی قدرت سلب ہو جاتی ہے۔ اس کے راستہ پر پیشہ ور عورتیں شوخ اور بھڑکیلے رنگوں کے کپڑوں میں ملبوس گھومتی پھرتی اور گلی کوچوں کے موڑ پر اپنے بدنصیب عاشقوں کو ہم آغوشیوں کی دعوت دیتی نظر آتی ہیں۔

مختصر یہ کہ یہاں کی ہوا جنسی جذبات میں ہیجان پیدا کرنے اور یہاں کی فضا لذائذ نفسانی کو بے طرح برانگیختہ کرنے والی ہے۔ خصوصاً شام کے وقت یہاں بڑا ہنگامہ

رہتاہے۔ ہر مکان سے ناچنے والوں کے گھنگھروؤں کی آوازیں آتی ہیں اور ہر جگہ ایک بزم نشاط سجی ہوتی ہے، لہوو لعب میں زندگی گذارنے والے بے روک ولوک آتے جاتے ہیں اور ...... بیماریوں سے اپنی عیش کوشیوں کے دامن کو آلودہ کرتے ہیں۔ غرض یہ جگہ بھی ایک طرفہ تماشہ اور ایک عجیب کارگاہ ہے۔

ذکر کیفیتِ ناگل

ہر ماہ کی ، رتاریخ کو دہلی کی آزاد مزاج عورتیں اور عیش پسند خواتین خوب سنگار پٹار کرکے زیارت کی نیت سے یہاں آتی ہیں، مگر مدّعا کچھ اور ہوتاہے۔ دراصل وہ یہاں اپنے چاہنے والوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے آتی ہیں۔ بہت سے کنوارے اور غربت پیشہ لوگ اس امید پر کہ کسی کی نگاہِ انتخاب ان پر ضرور پڑے گی، بن سنور کر یہاں پہنچتے اور عشق بازی اور ہوس کاری کے اس کھیل میں اپنا اپنا مقدر آزماتے ہیں۔

اس جگہ کی یہ خاصیت ہے کہ اگر کوئی سات جنموں کا کنوارا بھی یہاں پہنچ جاتاہے تو اس کی دلی آرزو پوری ہو جاتی ہے اور اس کی جوڑی مل جاتی ہے۔ لوگ صبح سویرے وہاں پہنچتے ہیں اور تمام دن عیش کی چھان کر سر شام وہاں سے واپس لوٹتے ہیں اور واپسی میں ان باغوں اور بستانوں کی سیر کرتے ہوئے آتے ہیں جو راستے میں پڑتے ہیں۔

ہم مغلوں کی شام زوال کے ان بڑھتے ہوئے سایوں کو ان مقامات کے جھیلوں اور میلوں ٹھیلوں ہی میں نہیں دیکھتے، بلکہ خاندانی امراء کی نجی زندگیوں میں بھی مشاہدہ کرتے ہیں۔ اعظم خاں ایسے ہی عیش پسند امراء میں سے ہے، (جس کی حویلی کے نام سے آج تک ایک محلہ آباد چلا آتاہے۔)

ذکر اعظم خاں پسر فدوی خاں برادر زادہ خاں جہاں عالمگیری ----

ذی شان امیرزادوں میں سے ہے۔ رنگین مزاجی کے اقتضار اور راگ رنگ سے غیر معمولی دل چسپیوں کے باعث ہندوستان کے مطربوں کا ممدوح ہے۔ اس کی طبیعت امرد پرست واقع ہوئی ہے۔ اس کا دل سادہ رویوں کے عشق میں گرفتار ہے

اور اس کی جاگیر کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ اس طبقہ کی مزاج داریوں میں صرف ہوجاتا ہے، جیسے ہی اُسے کسی حسین امرد کا حال معلوم ہوتا ہے، ہر طرح اس کی رعایت کرکے وہ اُسے اپنی رفاقت کے پھندے میں پھنسا لیتا ہے۔

اس طبقہ کے بہت سے لوگ اس کے حُسنِ طبیعت کے باعث مناسب منصبوں پر فائز ہوگئے اور اس کے ہر وقت کے ساتھی ہیں۔ یہ لوگ صبا رفتار گھوڑوں پر سوار ہوکر اس کے جلو میں چلتے ہیں اور آج یہ حالت ہے کہ جہاں کوئی سبزہ رنگ ملتا ہے وہ اعظم خاں کے نام سے منسوب ہے اور جہاں کوئی نوخط نظر آتا ہے، اسے اس کی بساطِ عیش کا مُہرہ تصوّر کیا جاتا ہے

دن تازہ ردیوں کے خیال سے اپنی صبحِ پیری کو خضاب آلود کرتا ہے اور اس واہمہ میں کہ فرصت زندگی بہت کم ہے۔ اپنی زندگی کے ایک ایک لمحہ کو عیش کوشیوں میں بسر کرتا ہے۔

ذکرِ لطیف خاں

یہ بھی شہر کے امیرزادوں میں سے ہے۔ ہمیشہ اس کی ہمت بزم آرائیوں میں مصروف رہتی ہے۔ وہ راگ راگنیوں کا اس قدر شائق ہے اور اس میں اس درجہ مشاق ہے کہ نعمت خاں بھی اکثر اس کے گھر پر آتا ہے اور اس کے انداز نغمہ سرائی کی تعریف کرتا ہے۔ اس کے طرزِ نغمہ کی خوبیوں کی وجہ سے امرار دربار اس کی باریابی کے متمنی رہتے ہیں اور اس کے کمالِ فن سے محظوظ ہوتے ہیں۔

وہ چشم مست کی طرح علی الدوام نشہ میں چور رہتا ہے اور ساغر مے کی طرح ہمیشہ مینائے شراب کی پرستش میں محو نظر آتا ہے۔ وہ اپنی صحبتوں میں رنگین اشعار پڑھتا اور بیچ بیچ میں دلچسپ لطائف کو نقل مجلس بناتا رہتا ہے۔ وہ اہل محفل کی دل جوئی اور خاطر داری میں اتنا اہتمام برتتا ہے کہ جو شخص ایک بار اس کی محفل میں شریک ہوجاتا ہے وہ اسے اپنا ہم دم دیرینہ خیال کرنے لگتا ہے۔

اس کی بزمِ بے تکلف میں جو بھی شریک ہوتا ہے، وہ مینا و جام سے اس کی تواضع کرتا ہے اور ہر ایک کے سامنے الگ الگ شیشہ ہائے شراب اور نقل و گزک رکھے جاتے ہیں تاکہ ہر شخص بے شائبہ شرکت، شغل مینا و جام سے مسرور و محظوظ ہو سکے۔

یارانِ نغمہ سنج اپنے اپنے مواقع پر خوش نوائی اور خوش ادائی کی داد دیتے ہیں۔ بلحاظ مراتب نغمہ سرائی کرتے ہیں۔ اس نہج میں دلچسپ لطیفوں سے مجلس کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے اور بدیہہ گوئی اور بذلہ سنجی سے محفل چمک اٹھتی ہے۔

دو گھڑی دن سے ایک پہر رات تک یہ صحبت چلتی ہے۔ نور بائی اور دوسری طوائفیں اپنے سازندوں اور نوازندوں کے ساتھ اس محفل میں شریک ہوتی ہیں۔

اب کہ اس کی زندگی میں دولت و ثروت کی وہ ریل پیل نہیں رہی۔ اس کی محفلوں میں وہ گہما گہمی تو دیکھنے میں نہیں آتی۔ پھر بھی کچھ خاص خاص لوگ جمع ہوتے ہیں اور بہت سے اچھے دنوں کی یاد تازہ کرتے ہیں ___ اکثر اس کی زبان پر یہ شعر آتا ہے ؎

در حریمِ بزمِ مستاں، دورِ صبح و شام نیست
گردشِ جام است ایں جا گردشِ ایام نیست

مئے و معشوق اور ساز و آواز سے غیر معمولی دلچسپی لینے والے ان امیرزادوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو سحر و طلسم سے شغف رکھتے ہیں۔ میر منو اس کی ایک مثال ہے۔ یہ امیرزادہ سحر کاری کے فن میں یگانۂ روزگار ہے۔ اکثر امیرزادے اس علم کے ضروری احکام اس سے سیکھتے ہیں اور اس کی شاگردی پر فخر کرتے ہیں۔ اس کا گھر شدّاد کی بہشت ہے اور اس کا کاشانہ پری زادوں کے لیے ایک شاخِ نشیمن، اس کی مجلس شاہدوں کا "دار العیار" ہے اور اس کی ہم نشینی گلرخوں کے لیے وجہِ اعتبار۔

انہیں اصحابِ فن میں کچھ اہلِ سخن بھی ہیں۔ "مرزا عبد الخالق دارستہ" کا یہ ذکر ملاحظہ ہو:۔

"آمدنی کے معتدبہ وسائل اور ایک اچھے منصب کے ساتھ ساتھ ایک پُربہار

طبیعت اور آزادانہ مزاج رکھتا ہے۔ اس نے ایک بہت خوب صورت محل بنایا ہے۔ اس کے در و دالان کو مکلّف فرش فروش اور رنگین پردوں سے آراستہ کیا ہے اور شیشہ کے ظروف و آلات بڑے سلیقہ سے اس کے طاق و محراب میں سجائے گئے ہیں۔ اس سجاوٹ کے باعث یہ مکان ارباب نظر کے لیے وجہ تماشا اور سبب کشش بن گیا ہے۔ شعرائے رنگین خیال پری زادانِ معنی کی طرح اس شیش محل میں وارد ہوتے ہیں اور دل چسپ اشعار اور پُر لطف لطیفوں سے محل کو گل و گلزار بناتے ہیں۔ مرزائے مذکور کی جانب سے حقے، قہوے، معجون اور عطر و پان سے اُن کی تواضع کی جاتی ہے قدما اور زمانہ موجود کے شعراء کی بیاضیں اور دیوان کھولے جاتے ہیں۔ شعر خوانی ہوتی ہے اور ارباب فن کو ان کی خوش گوئی و خوش ذوقی کی داد ملتی ہے۔

عہد محمد شاہی کی دہلی کے یہ رنگین جلسے اور پُر لطف صحبتیں اس کی مقتضی ہیں کہ یہاں ارباب فن کا اجتماع ہو۔ "مرقع دہلی" میں بہت سے فنکاروں کا تعارف موجود ہے جن میں نعمت خاں بین نواز، جیسے صاحب فن افراد بھی ہیں۔ جن کا ذکر "ارباب طرب" کے تذکرے میں آیا ہے۔

ذکرِ نعمت خاں بین نواز

ہندوستان (دہلی) میں اس کا وجود بہت بڑی نعمت ہے۔ نغموں کی ایجاد اور شعبوں کے اختراع میں "ید بیضا" رکھتا ہے اور بڑے بڑے نائکوں کے ساتھ پہلو زنی کرتا ہے۔ کئی راگوں کا موجد اور کئی زبانوں میں صاحبِ تصنیف ہے۔ ہندوستان بھر کے مغنیوں کا سرتاج ہے۔ بادشاہ جم جاہ کے سوا کسی دوسرے امیر کی محفل میں نغمہ سرائی نہیں کرتا۔ بزرگانِ دین کے مزارات پر ہونے والے عرسوں میں عقیدت کے ساتھ شریک ہوتا ہے اور خود بھی ہر مہینہ کی گیارہویں کو مجلس کرتا ہے۔ اس کی محفل میں اعیان شہر اور امرائے دولت بڑے ذوق و شوق کے ساتھ شریک ہوتے ہیں اور شائقین کا وہ ہجوم ہوتا ہے کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں رہتی۔

اس کا بھائی بھی ساز بجانے میں بڑی دست گاہ رکھتا ہے اور چار چار گھنٹے تک نئے نئے رنگ اور آہنگ پیدا کر کے اپنے فن کا مظاہرہ کرتا ہے اور کسی موقع پر بھی خارج از آہنگ نہیں ہوتا۔ یہ خوبیٔ استعداد اور استادانہ فن کاری ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اس کا بھتیجہ ستار نوازی میں بڑی مہارت رکھتا ہے۔ طرز تازہ کا موجد ہے۔ وہ نغمے جو دوسرے عمدہ عمدہ سازوں سے وجود میں آتے ہیں وہ انھیں ستار کے تاروں سے پیدا کر دیتا ہے۔ غرض کہ عجائب روزگار سے ہے۔

ان اہلِ فن میں بیشتر لوگ ایسے بھی ہیں جو اہلِ فقر سے نسبت وارادت رکھتے ہیں۔

تاج خاں قوّال

شہر کے ممتاز گویوں میں سے ہے۔ اس کے نغمات کی دل آویزی بلبل کی داستان سرائیوں سے زیادہ رنگین ہے اور اس کی آواز برگِ گُل سے سوا نازک ــــ اس کا مذاق نغمہ سنجی فقر و درویشی کی چاشنی سے آشنا ہے۔ اس کا ایک اثر یہ بھی ہے کہ عین بزم میں اس پر گریہ بے اختیار طاری ہو جاتا ہے۔ ہر ماہ کی ۲، تاریخ کو اس کے ہاں اجتماع ہوتا ہے اور اکثر فقراء و مشائخ جو سماع کے عاشق ہیں، ان مجلسوں میں شریک ہوتے ہیں۔ شہر کے بہت سے معتبر قوّال اس کی بزم میں حاضر ہو کر اپنی نغمہ سنجیوں کی داد دیتے ہیں اور یکے بعد دیگرے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں اپنی اس درویش مزاجی اور فقیرانہ طبیعت کی وجہ سے تمام حاضرین میں وجہ ترجیح سمجھا جاتا ہے۔

ایسا ہی ایک دوسرا فن کار "غلام محمد سارنگی نواز" ہے۔ اس فن کے جاننے والے اُسے منتشیات میں شمار کرتے ہیں اور بہت عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اہل اللہ اور فقراء سے نسبت ارادت رکھتا ہے اور اپنے خیال میں نشۂ فقر سے بہرہ ور ہے۔

فن موسیقی کے ممتاز ماہرین میں "رحیم تانسین" کا ذکر صاحب مرقع نے بڑی

دل چسپی کے ساتھ کیا ہے۔" تانسین" کے بنیروں میں سے ہے اور اس کی مہارتِ فن اور رسائیٔ طبع اس کی نسبت کی سچائی پر گواہی دیتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ وہ تمام مغنّیوں کا مخدوم زادہ ہے۔ اس کے نغموں کا جادو ہوا کو باندھ دیتا ہے۔ اس کی آواز اتنی سدھی ہوئی ہے اور اس کا گلا اتنا منجھا ہوا ہے کہ وہ چاہے جتنی دیر گائے اس کی صدا کا طلسم نہیں ٹوٹتا اور وہ کبھی غلط آہنگ نہیں ہوتا۔ کبت خوانی میں وہ عجائبات روزگار سے ہے اور دھرپد میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔

ایک مرتبہ حسنِ اتفاق سے استاد رحیم خاں و حسین خاں ڈھولک نواز کہ وہ بھی اپنے فن میں نادر العصر ہے اور حسن خاں ربابی اور گھاسی پکھاوجی ہر ایک اپنے اپنے فن میں بے مثال ہے، ایک ساتھ جمع تھے، خوب مجلس گرم ہوئی اور لطف آگیا۔

گھاسی رام پکھاوجی

اس کا تعارف کراتے ہوئے لکھا گیا ہے" اس کا ساز چمڑے کے بجائے اگر برگ گل سے تیار کیا جائے تو مناسب ہے۔ اس کے ہاتھ کی جنبش اور پوروؤں کی حرکت کچھ ایسی ہوتی ہے جیسے پھولوں کی پتیاں ہوا میں لہرا رہی ہوں۔"

حُسین خاں ڈھولک نواز

اپنے فن میں عجیب و غریب شخص ہے اور ڈھولک نوازی کے فن کو اس نے معیار کمال تک پہنچا دیا ہے، جس کے آگے آدمی کا خیال بھی نہیں جا سکتا۔ اہل ہند اس پر متفق ہیں کہ سرزمین ہند میں اس سے بہتر ڈھولک نواز پیدا نہیں ہوا۔

شہباز دہمدھمی نواز

اس کا باپ اعظم شاہ کی سرکار میں نوکر تھا اور یہی ساز بجاتا تھا۔ اس وقت وہ اپنے فن میں اپنی خطیر نہیں رکھتا، اور ایسے ایسے کمال دکھلاتا ہے جو پکھاوجی

اور ڈھولک نواز کے لیے بھی ممکن نہیں۔ جس راگ کا جو وقت ہوتا ہے، اس وقت میں وہی راگ اپنے اس ساز پر پیش کرتا ہے۔

شاہ درویش سبوچہ نواز

اس فن میں یدطولیٰ رکھتا ہے اور اس شان سے سبوچہ نوازی کرتا ہے، کہ ڈھولک نوازوں اور پکھاوجیوں کو اس کے آگے پسینہ آجاتا ہے۔ قدردان جب اسے اپنی محفل میں بلاتے ہیں تو تکیہ دار سواری بھیجتے ہیں اور اس کی فن کاری پر جھوم اٹھتے ہیں۔ اس نے ایک ایسا ساز ایجاد کیا ہے۔ جو کئی سازوں کا جامع ہے، جس سے ڈھولک کی آواز بھی آتی ہے اور پکھاوج کی صدا بھی نکلتی ہے اور جس کے درمیان سے طنبور کی آواز بھی بلند ہوتی ہے۔

ایک نابینا فنکار اپنے پیٹ کو ڈھولک کی طرح بجاتا ہے اور اس کی ضربیں موسیقی کے دستور وضوابط کے مطابق ہوتی ہیں۔ اکثر طوائفیں اس کے سازِ شکم کی گمک پر رقص کرتی ہیں۔

باقر طنبورچی، قاسم علی خاں، معین الدین قوال، رہانی قوال، رہانی امیر خاں، رحیم خاں خیالی اور شجاعت خاں وغیرہ کے نام بھی فن کاروں کے ضمن میں آتے ہیں۔ موخرالذکر کبت خوانی میں بڑا دعویٰ رکھتا ہے۔ پگڑی اور اس پر پیچ بڑی تزئین و تقطیع کے ساتھ باندھتا ہے۔ اس کی پلکیں ہمیشہ سرمہ سے سیاہ رہتی ہیں۔

ارباب فن کے ساتھ اہل سخن سے بھی اس بساط تہذیب کے بعض گوشے سجے ہوئے ہیں۔ ان میں سراج الدین خاں آرزو اور مرزا جان جاناں جیسے اکابر بھی موجود ہیں۔ اول الذکر کے تعارف میں "ذکر اہل ادب،" کے تحت لکھا ہے۔

سراج الدین خاں آرزو

وہ موزونان شہر کی انجمن کی رونق ہیں اور نکتہ سنجوں کی محفل کے چشم و چراغ ہیں،

تمام سخنوران دہلی ان کے شیفتہ صحبت ہیں اور تمام امرائے بادشاہی ان کی ملاقات کے آرزو مند رہتے ہیں۔ اہل دولت کے ساتھ ان کی صحبت گرم رہتی ہے اور تمام مجمعوں میں ہلال کی طرح ان کی طرف (لوگوں کی) انگلیاں اٹھتی ہیں۔ جس محفل میں وہ رونق افروز ہوتے ہیں "مرحبا مرحبا" کی آوازیں آتی ہیں اور جس بزم میں ان کا ورود مسعود ہوتا ہے تحسین و آفریں کی صدائیں بے اختیار بلند ہوتی ہیں۔ اہل اشتیاق کے لیے ان کی صحبت ایک حُسنِ اتفاق ہے۔ مرزا بیدل کے عرس کے دن جس سے وہ نسبت شاگردی رکھتے ہیں، ان کے یہاں بزم سخن منعقد ہوتی ہے اور وہ اہلِ سخن اور ارباب فن کو اپنے افکار گوہر نثار سے ذلہ باری و گل چینی کا موقع دیتے ہیں۔

مرزا جان جاناں (مظہر)

نشۂ عشق کی چاشنی ان کے ضمیر میں داخل ہے اور آتش شوق کی سوزناکی ان کا مزاج ہے۔ عُلومِ متداولہ کی تحصیل کے بعد ایما غیبی اور تائید لاریبی کے اشارے پر راہ تحقیق (تصوف) میں گامزن ہو گئے۔ اب ان کی ذات بابرکات، "مرزائی و درویشی" کی جامع ہے۔ ایک دنیا ان کی محفل میں باریابی کی متمنی رہتی ہے (جس کو بھی حسنِ اتفاق سے یہ سعادت نصیب ہو جائے) اور بے شمار لوگ اپنے دل میں یہ آرزو لیے رہتے ہیں، جس کی بھی قسمت یاوری کر جائے۔ وہ بڑے پرلُطف اور بامزہ شعر کہتے ہیں اور ان کے کلام کا نازک نشتر رگِ جاں کو چھوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ امرائے عالی شان ان کی خدمت میں رسائی کے لیے کوشاں رہتے ہیں، اس پر بھی ان کی صحبت میسّر نہیں آتی۔ ان کی متبرک رہائش گاہ دہلی کہنہ میں ہے، لیکن اپنی طبعی نازک مزاجی کے باعث وہ خوشبو کی طرح سیر و سفر میں رہتے ہیں۔ ان کا قیام کبھی یہاں رہتا ہے اور کبھی وہاں، اس لیے ان سے ملاقات کا اتفاق بہت کم ہوتا ہے۔

(بعض اہلِ سخن تو آج تاریخ ادب کے لیے بالکل غیر معروف شخصیتیں ہیں۔)

معنیٰ یاب خاں

بادشاہ کے منتخب امرا میں سے ہے۔ غزالانِ افکار کو صید کرنے میں قدرت تمام رکھتا ہے اور لطف سخن کی ادائیگی میں اس کی طبیعت بہت رسا واقع ہوئی ہے ۔ غزل نگاری میں اُسے ید بیضا حاصل ہے اور ایسی طرفگی کے ساتھ غزل پڑھتا ہے کہ سننے والے وجد کرنے لگتے ہیں۔

ماہ صفر کی تیسری تاریخ کو جو مرزا عبدالقادر بیدل کے عُرس کا دن ہے، تمام شعرائے دہلی ان کے مزار پر جمع ہوتے ہیں اور اُن کے دیوان کو درمیان رکھ کر شعر خوانی کا آغاز ان کے اشعار سے کرتے ہیں اور حاضرینِ مجلس سے دادِ تحسین کے طلب گار ہوتے ہیں۔ معنی یاب خاں وہ شخص ہے جو سب سے پہلے غزل پڑھتا ہے۔ اس کی پیش کش کا انداز ارباب معنی کے نزدیک بہت مُستحسن (ہوتا) ہے۔ اس کے اشعار ابتدا سے انتہا تک ناخن بدل زن ہوتے ہیں اور نکتہ گیروں کے اندیشہ سے آزاد۔

میر محمد افضل ثابت

یہ ان کی طبعی نیکی اور نجابت کا تقاضہ ہے کہ اہلِ دنیا کی طرف ان کو بالکل رغبت نہیں، وہ بزم توکل کے مسند نشین ہیں اور اپنی بلند ہمتی کے سہارے انہوں نے اپنی پائے استقامت کو درویشی کے دامن میں سمیٹ لیا ہے اور اپنی فطری بے نیازی اور اعلیٰ طبعی کے باعث ہر طرح کی مبتذل باتوں سے خود کو الگ کر کے فکرِ شعر اور صوفیانہ مشاغل میں لگ گئے ہیں اور دوسرے کاموں کی طرف توجہ فرما نہیں ہوتے۔ انہوں نے مختلف کتابوں سے انتخاب کر کے علم تصوف میں ایک نسخہ عالیہ ترتیب دیا ہے اور اپنا کلام ردیف وار ترتیب دیکر اہلِ زمانہ کو اپنا ممنون بنالیا ہے۔

ابراہیم علی خاں راقمؔ

اس کا دادا عالمگیری امراء میں سے تھا۔۔۔ اس کی شاعری کی شہرت عالمگیر ہے اور تمام اہل سخن سے خراج تحسین وصول کرتی ہے۔ وہ اپنی بدیہہ گوئی کی وجہ سے دوسرے اہل سخن پر فوقیت رکھتا ہے اور لطف سخن میں ان سے گوئے سبقت لے گیا ہے۔ کم نصاعتی اور اسباب معاش کی تنگی کے باوجود اس کے گھر پر اہل استحقاق کا ہجوم رہتا ہے اور اس زمانہ ساز گار کا شکوہ جس سے ہزاروں کا دل خون ہو رہا ہے، اس کی زبان پر کبھی نہیں آتا، بلکہ منعم حقیقی کی بخششوں اور عنایتوں کے شکر میں وہ ہمیشہ تر زبان رہتا ہے اور اپنے بے تکلف دوستوں کے ساتھ دل جمعی اور خوش اختلاطی کے ساتھ وقت گذارتا ہے اور اپنے خوبصورت خیالوں اور رنگین خوابوں کے سہارے اپنی "بزم بے کسی" کو بساط عیش کی سی رنگینیاں بخشتا ہے۔

میر شمس الدین مفتوںؔ

ناقدر شناس زمانہ نے جو کچھ اُسے دیا ہے، اسی پر قناعت کرتا ہے اور اپنی احتیاج کے مطابق اہل دولت سے بس ضروری واسطہ رکھتا ہے۔ بزرگانِ سلف کے طریقہ پر مشق سخن کرتا ہے۔ اسی لیے اس کے اشعار قدیمانہ رنگ لیے ہوئے ہوتے ہیں۔

گرامیؔ کشمیری

خطۂ کشمیر بہشت نظیر کے شعراء میں سے ہے، مولویت کے باوصف چاشنی سخن کا ذوق رکھتا ہے۔ اپنے اشعار کا پشتارہ اپنی بغل میں دبائے پھرتا ہے اور سخن فہموں کے سامنے کشمیر کے گانے والوں کی طرح بڑے زور و شور سے پڑھتا ہے اور اپنی تازہ گوئی کا اس قدر دعویٰ رکھتا ہے کہ بزم مشاعرہ کو مجلسِ مناظرہ میں بدل دیتا ہے۔

مرزا ابوالحسن آگاہ

بہت رنگین طبع آدمی ہے۔ تمام شعرائے دہلی سے اختلاط رکھتا ہے اور ان کا ہمنوا رہتا ہے۔ مرزا بیدل کے عرس میں ان کے دیوان سے انتخاب کی جانے والی غزل یہی شخص پڑھتا ہے اور خود بھی ہمیشہ فکر سخن میں مشغول رہتا ہے۔

حلیما

عرب زادوں میں سے ہے۔ اس کا کلام اسحٰق اطعمہ کے کلام سے بہت مشابہت رکھتا ہے۔ نان وفیرنی کے مضامین بڑی آب وتاب سے باندھتا ہے اور ہمہ وقت اس کی طبیعت کے آتش خانے میں کباب وقلیہ کا تمام سامان مہیا رہتا ہے۔ متقدمین اور متاخرین کے پچاس ہزار شعر اس کو یاد ہیں

اہل سخن میں وہ مرثیہ خواں اور مرثیہ گو بھی شامل ہیں، جنھوں نے اپنے زمانے کے اعتبار سے اس فن کو درجۂ کمال تک پہنچایا ہے۔ جن کا تذکرہ صاحب مرقع نے "ذکر مرثیہ خوانان" کے عنوان سے کیا ہے۔

پسر لطف علی خاں (دیوانِ جاوید خاں)

منقبت اور مرثیہ کے اشعار وہ اس شان وآن سے کہتا ہے کہ اُسے مختتم وقت کہنا چاہیے۔ ریختہ میں بھی اس کی منقبت گوئی کا انداز بہت خوب ہے۔ مرثیہ عجیب سوز وگداز سے کہتا ہے۔ جاوید خاں کے عاشور خانے کا منتظم ہے۔ زائرین کے ساتھ مراعات سے پیش آتا ہے اور بڑی عقیدت سے تعزیہ داری کرتا ہے۔

مسکین وحزیں وغمگین

یہ تینوں بھائی ہیں اور بڑے حسرت خیز اور درد انگیز لہجہ میں زبانِ ریختہ میں مرثیہ

لکھتے ہیں، تمام شہر میں ان کے کلام کی شہرت ہے، اور سچ یہ ہے کہ تینوں صاحبان بہت اچھا مرثیہ پڑھتے ہیں۔ لوگ ان کی طرف بہت رجوع رکھتے ہیں۔ ان کے اشعار کی نقلیں اور مسودے بڑی کوشش و کاوش سے حاصل کرتے ہیں اور ان کو اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھتے ہیں۔ درحقیقت ان عزیزوں کی فرمارروائی کا ایک عجیب انداز ہے۔ اور ان میں طرفہ تلاش ملتی ہے۔

مختلف امراء کے یہاں سے ان کی کاوشوں کا اتنا صلہ مل جاتا ہے جو ان کی مدد معاش کے لیے کافی ہوتا ہے۔ مرثیہ و منقبت کے علاوہ کسی دوسرے موضوع پر فکر نہیں کرتے۔ ان کے مراثی کو سن کر عزاداروں پر گریہ طاری ہوتا ہے۔ جو روضۃ الشہداؔ اور "واقعات بلامقبل" کے اشعار سے بھی ممکن نہیں۔ مراتب غم کے قدرداں اس کو جانتے اور فوائد ماتم کے رمز شناس اس سے واقف ہیں۔

میر عبداللہ

ابا عبداللہ حضرت امام حسین کے تعزیہ داروں میں سے ہے۔ ندیم و حزیں۔ کے مراثی کو اس قدر حیرت انگیز اور گریہ خیز لہجہ میں پڑھتا ہے کہ سننے والوں پر بے اختیار رقت طاری ہو جاتی ہے اور شور ماتم بلند ہوتا ہے۔ نوحہ و فریاد کا خروش آسمان تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کی زبان سے ادا ہونے والا مصرعہ ابھی پوری طرح سے ادا بھی نہیں ہوتا کہ گریہ خلائق فقرہ مستزاد کی طرح اس کے ساتھ موزوں ہو جاتا ہے۔ اور ابھی اس کے لب پر آیا ہوا شعر اختتام کو نہیں پہنچتا کہ نوحہ کا ترجیع بند باوجود تکرار کے مضمونِ تازہ کی طرح سامنے آتا ہے۔

استادان موسیقی اس پر متفق ہیں کہ اتنے اچھے کسی مرثیہ خواں نے ابھی تک عالم ایجاد میں قدم نہیں رکھا۔ محرّم کے مقدّس و متبرک مہینے میں یہ صاحب جو اپنے کمال فن کی وجہ سے ایک واجب الاحترام شخص سمجھے جاتے ہیں۔ جن عزا خانوں میں نوحہ گری کے لیے پہنچتے ہیں، ان مکانات موعود کی طرف لوگ بے اختیار کھنچے چلے آتے ہیں۔

ہیں اور ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرتے ہیں۔ یہ جہاں جاتے ہیں، ان کے ساتھ ان کے اعوان و انصار اور خوش جمال لڑکوں کا ایک جمِ غفیر ہوتا ہے۔ ماہ محرّم کے علاوہ ان کے گھر پر امردوں کا مجمع رہتا ہے۔ ان میں بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں جو ان سے مرثیہ خوانی کے آداب سیکھنے آتے ہیں۔ آداب شاگردانہ کے ساتھ آنے والوں میں کلاونت اور قوال بھی شامل ہوتے ہیں۔

شیخ سلطان

اس کے باوصف کہ وہ اصلاً تورانی ہیں۔ ادائے تلفظ میں فصحائے ہندوستان کے ساتھ برابری کرتے ہیں۔ بڑی آب و تاب کے ساتھ مرثیہ پڑھتے ہیں۔ عامیانہ طرز میں اختیار کرنے کے باوجود ان کے اشعار دلوں پہ اثر کرتے ہیں۔ ان کی آواز اور گریہ خلائق نے جیسے آپس میں عہد باندھ رکھا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے جُدا نہ ہوں گے۔

میر ابو تراب

اس کی مرثیہ خوانی کا انداز بے حد گریہ خیز اور ادائیگی مطالب کا ڈھنگ انتہائی دردانگیز ہے، چونکہ فنِ موسیقی میں مہارت حاصل ہے، اس لیے بھی اس کے مرثیہ پڑھنے کا اسلوب بہت پیارا اور دلوں پر اثر کرنے والا ہے، جس کو سُن کر عزاداری کرنے والے بے اختیار و بے قرار ہو جاتے ہیں۔ عزاخانوں اور ماتم داروں کی مجلسوں میں میر ابو تراب کو بہت متبرک اور واجب التعظیم سمجھا جاتا ہے۔

میر درویش حسین

خامس آلِ صبا حضرت امام حسین کے عزاداروں میں سے ہے۔ اس کے مرثیہ کو سن کر اہلِ عزا پر بے اختیار رقت اور گریہ کا عالم طاری ہوتا ہے اور مجلس میں شور و شین ہوتا ہے۔ جاوید خاں کے وابستگانِ دولت میں سے ہے۔

محمد نعیم

رقت انگیز الفاظ موزوں کرنے اور غم انگیز استعارے کام میں لانے کی بڑی مہارت رکھتا ہے۔ جن کو سن کر عزاداروں کے سینے چاک ہو جاتے ہیں۔ مرثیہ کے اشعار میں عجیب و غریب انداز سے تضمین کرتا ہے۔ خصوصاً وحشی یزدی کے مدس کو تضمین کرنے میں اُسے ید بیضا حاصل ہے۔

انہیں مرثیہ خوانوں میں "جانی حجام" بھی ہے جس کی درد آلود صدا (صاحب مرقع کے بیان کے مطابق) دلوں میں نشتر شکنی کرتی ہے۔ یہ پہلے کسی امیر کا منظور نظر تھا، طرفہ حسن و جمال رکھتا تھا اور بڑی آن بان سے زندگی گزارتا تھا۔ آدمی بن گیا تھا۔ لیکن ناؤ نوش کے شغل میں یہ دولت اڑا دی۔ اب آسمان سے درپئے انتقام ہے، لیکن خوش صحبت اور رنگین طبع آدمی ہے۔ امیر زادے اس کے ساتھ مراعات سے پیش آتے ہیں، اور رقص و سرور کی محفلوں میں اسے بلاتے ہیں۔ خیال اور جنگلہ خوب گاتا ہے۔ فی الجملہ اب بھی خوش اوقات ہے۔

ان بیانات اور تعارفات سے اندازہ ہوتا ہے کہ عزاداری کی رسمیں اور اس کے ساتھ مرثیہ خوانی کا سلسلہ اس عہد کی تہذیبی روایت میں داخل ہیں اور مرثیہ کہنے اور پڑھنے والے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

تشیّع پسندی کے اثرات اور حب اہل بیت کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ دہلی والوں کو ارباب فقر و تصوّف سے بھی گہری دلچسپی ہے اور بزرگان دین کے مزارات پر عرس کی تقریبات کے علاوہ خانقاہی آدب و رسوم بھی انہیں عزیز ہیں۔ مرشدین طریقت کو بہت احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور ان کی خانقاہوں میں اہلِ ارادت کا ہجوم رہتا ہے۔ مرقّع میں ایسے بہت سے خانقاہ نشین بزرگوں کا تعارف اور ان کی تعریف ملتی ہے۔

ذکرِ شاہ غلام داول پورہ

اہل ارادت کی ایک کثیر جماعت آپ کے دائرہ توکل سے وابستہ ہے۔ ظاہری سطح پر اسباب راحت کے فقدان اور فقر و درویشی کے اس ماحول کے باوجود کہ ہمیشہ آپ کی خانقاہ میں ملتا ہے۔ یہ آپ کے ثبات قدم کی برکت اور استقلال وضع کا ثمرہ ہے کہ ضعیفوں اور محتاجوں کی ایک بڑی تعداد جو آپ کی خانقاہ کے پاس "توکل بر خدا" پڑی رہتی ہے، اس کا رزق برابر پہنچتا ہے۔ جو اہل حاجت صبح سے لے کر شام تک یہاں آتے رہتے ہیں، نذر و فتوح کے فوائد میں برابر کے شریک رہتے ہیں۔ خانقاہ میں جو چیزیں آتی اور پیش کی جاتی ہیں، ان میں سب کا حصہ مساوی ہوتا ہے اور کسی کو بھی محروم نہیں رکھا جاتا۔

ایک پہر رات گزارنے کے بعد خانقاہ سے توسّل رکھنے والے تمام افراد کو کھچڑی تقسیم کی جاتی ہے اور سب لوگ بغیر کسی امتیاز کے یہ کھچڑی تناول کرتے ہیں۔ اہلِ خانہ کے لیے بھی یہی کھچڑی بھیجی جاتی ہے۔ قوّال بھی اس آستانہ کے فیض و بخشش میں برابر کے شریک رہتے ہیں، بلکہ شریکِ غالب رہتے ہیں۔ جس طرح سایہ شخص سے جدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ بھی خانقاہ کے ہمہ وقت کے ساتھی ہیں۔ ان کی وجہ سے یہاں ہنگامہ وجد و حال برپا رہتا ہے۔ غرض یہ کہ یہاں وضیع و شریف اور امیر و غریب سب ہی آتے ہیں اور سب کے ساتھ مساوی سلوک کیا جاتا ہے۔ دربار شاہی، اور امرائے شہر کی طرف سے بڑے مبالغہ کے ساتھ نذر و فتوح کی پیش کش ہوتی ہے، لیکن قبول نہیں ہوتی۔

ذکرِ حافظ شاہ سعد اللہ

لوگوں کے نزدیک وہ بہت ہی پہنچے ہوئے بزرگ ہیں اور بعض کے نزدیک تو قطبیت کے درجہ پر فائز ہیں۔ اکثر راہِ قعر تمنا میں گامزن ہونے والے ان کے آستانہ

ولایت کی طرف راغب اور ذکر و شغل کے وسیلہ سے "تزکیۂ نفس" اور "تصفیۂ باطن" کی منزلوں سے گزرتے ہیں اور کسب کمال کے بلند درجوں تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ سے ارتباط رکھنے کے باعث سماع سے رغبت نہیں فرماتے۔

ذکرِ شاہ محمد میر

آپ کی متبرک زندگی کی برکت والی ساعتیں کمالات روحانی کے کسب میں گزرتی ہیں۔ اور آپ کا مزاج مقدس وجد و حال کی کیفیات میں ڈوبا رہتا ہے۔ ابتداء سے صبح تمیز سے آپ ہمیشہ روزہ دار رہتے ہیں اور تمام زوقت عبادت و ریاضت الٰہی میں گذارتے ہیں۔ ان کے اوقات عزیز نیکیوں سے معمور رہتے ہیں اور ان کی مبارک پیشانی تجلیات نور سے روشن رہتی ہے۔

شاہ پانصد منی

توران کے رہنے والے ہیں۔ بہت گراں ڈیل اور صاحب وجاہت شخص ہیں۔ مغلوں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اکثر فقراء ان کے ساتھ رہتے ہیں اور تورانی امراء کی طرف سے بڑی بڑی رقمیں اور بیش قیمت نذریں ان کے دیگ جوش اور خانقاہ کے مصارف کے لیے پیش کی جاتی ہیں۔ آج رات اگر وہ یہاں ہیں تو کل کسی دوسری انجمن میں رونق افروز ملیں گے۔ ان کے ہمرائیوں میں صلواۃ خوانی درویش اپنے عمامہ کی بزرگی کے لیے مشہور ہیں۔ یہ عجیب و غریب طریقے سے صافہ باندھتے ہیں۔ چونکہ ان کا صافہ عجائبات روزگار سے ہے۔ اس لیے عمدہ ہائے شاہی اپنے اس عمامہ کو زنان خانوں میں لے جاتے ہیں اور اس کو وسیلہ تفریح خیال کرتے ہیں۔ خیال ہے کہ اس کا وزن بیس سیر سے کم نہ ہوگا۔

ذکر میر سیّد محمد

ان کی شخصیت کا جلال و جبروت ان کی مجلس حالی رکھائے ہوئے رعب داب

سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان کی زندگی میں داخل کمالِ فقر و قناعت کا اظہار ان کی خانقاہ کے در و دیوار سے نمایاں رہتا ہے۔ جن پر روحانیت کا نور برستا رہتا ہے۔ اپنی استقامت میں بے مثال شخص ہیں اور سلاطین و امرار کے سامنے حرفِ حق کے لحاظ سے اپنی بے باکی کے لحاظ سے زبان زد خلائق ہیں۔

اہل دول کی طرف سے خانقاہ کی ضروریات جائداد و جاگیر کی پیش کش کی جاتی ہے، لیکن منصب فقر کی بے نیازی ان کی طرف نظر بھر کر بھی نہیں دیکھتی۔ نذر و فتوح کو بھی بہت کم شرف قبولیت عطا ہوتا ہے۔ آپ کا محاورہ بہت شیریں اور آپ کی گفت گو بے حد دل نشیں ہوتی ہے

ذکرِ شاہ کمال

عالم فقر و درویشی میں بہت رنگین طبع اور مرزا منش واقع ہوئے ہیں اور اپنے ملبوس کی سج دھج اور خرقہ پوشی کے مخصوص انداز کے اعتبار سے اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ ان کا لباس بہت نفیس اور مہین کپڑے سے تیار کیا جاتا ہے۔ غذا کے معاملہ میں بھی طرفہ تکلف اور صفائی کا خیال رکھتے ہیں۔ سماع و مزامیر اور وجد و حال کے لیے بے حد شائق ہیں۔ صوفیار کی اصطلاحات اور مشائخ کے استعاروں کو رنگین عبارتوں اور دل نشین اشاروں میں ادا کرنے کا ایک خاص ملکہ رکھتے ہیں۔ عرس کی محفلوں میں ذوق و شوق کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ ان کی صوفیانہ حرکات اور وجد و حال کے انداز سے اہل محفل بہت محظوظ ہوتے ہیں اور ریختہ کے مناسب حال اشعار سے لطف اٹھاتے ہیں۔

ذکرِ شاہ غلام محمدؒ

ہر سہ شنبہ کو آپ کے یہاں مجلس سماع منعقد ہوتی ہے اور شہر کے تمام قوال اور دیگر ارباب ذوق حاضر ہوتے ہیں۔ آپ کا بیشتر وقت سیر و سلوک کے مراحل کی سیر

ہیں صرف ہوتا ہے اور اکثر آپ پر حالت مراقبہ طاری رہتی ہے۔ وجد و سماع سے خاص ذوق رکھتے ہیں۔ تاج خاں قوّال کے گھر پر ہر مہینے کی نویں تاریخ کو جو مجلس سماع منعقد ہوتی ہے، اس میں آپ بھی رونق افروز ہوتے ہیں۔

ذکرِ شاہ رحمت اللہ

شہر کے امراء اور ذی عزت لوگ بیشتر اُن سے عقیدت وارادت رکھتے ہیں اور ان کے سلسلہ عالیہ سے مربوط ہیں۔ ان کا حلقہ ذکر ہمیشہ معمور رہتا ہے۔ یہ ان کی محفل کرامت منزل کا ایک لازمی جزو ہے۔ ہر چند کیفیتِ معنیٰ سے بہرہ ور رہتے ہیں، لیکن ساغر کشی سے شوق رکھتے ہیں۔ غالباً یہ کسی مصلحت کے باعث ہو گا۔ ورنہ ظاہرہ طور پر اس میں کوئی حکمت ہونی چاہیے۔

ذکرِ مجنونِ نانک شاہی

یہ شخص بے حد کمزور اور نحیف الجثہ ہونے کی وجہ سے اپنے نام کا صحیح مصداق ہے اور اپنی ایک خاص وضع کے اعتبار سے بہت مشہور ہے۔ اس کا آستانہ دریائے جمنا کے کنارے ہے اور اپنی وضع قطع میں بہت خوبصورت ہے۔ یہ نانک شاہی فقیر ایک خاص وقت میں اپنی خلوت گاہ سے برآمد ہوتا ہے اور طالبانِ دیدار کو باریابی کا موقع ملتا ہے۔ اکثر ہندو اور مسلمان اس کے درشن کرنے کے لیے اس پرفضا مقام تک پہنچتے ہیں اور بہت تعظیم و تکریم کے ساتھ اس سے ملتے ہیں۔

وہ اپنی مسند پر براجمان ہوتا ہے تو ایک خاص جگہ پر ایستادہ دو آدمی اُسے مورچھل جھلتے رہتے ہیں۔ قسم قسم کی مٹھائیاں پھول اور پھل اس کو نذر کیے جاتے ہیں۔ وہ ان میں سے تبرک کے طور پر سب کو بانٹ دیتا ہے۔ یہ فقیر اس انداز تمکنت سے بیٹھتا ہے کہ کسی کو اس کے سامنے لب کشائی کی جرأت نہیں ہوتی اور یہ خود بھی بہت کم بولتا ہے، لیکن قوالوں کی آمد و رفت کا یہاں تانتا بندھا رہتا ہے، اور

نغمہ سرود کے نذرانے پیش ہوتے رہتے ہیں۔ شہر کے متمول لوگ اسے گرانقدر تحائف اور نذرانے پیش کرتے رہتے ہیں اور بہت لوگ ہیں جو اس کی صلہ بخشیوں کے باعث آرام سے گذاران کرتے ہیں۔

ضرورت مند اور اہلِ احتیاج بھی یہاں آتے رہتے ہیں اور اس کی عطا اور بخشش سے اپنے اپنے مقدر کے مطابق کامیاب ہوتے ہیں۔ لیلی کی طرح محمل میں رہنے والی پردہ نشین عورتیں بھی میانوں میں سوار ہو کر یہاں آتی ہیں اور اپنی سواریوں کو سایہ دار درختوں کے نیچے ٹھہرا کر یہاں کے کنجوں اور چمن بندیوں کی سیر کرتی ہیں۔ وہ تنہائی میں اس درویش سے ملاقات کرتی ہیں اور اپنے دل میں چھپے ہوئے بھیدوں اور آرزوؤں کو اس کے سامنے ظاہر کرتی ہیں اور اس سے دعا اور توجہ کی طلب گار ہوتی ہیں۔

شاید یہ شعر اسی شخص کے لیے کہا گیا ہوگا:

شبے مجنوں بہ لیلےٰ گفت اے معشوق بے پردا
ترا عاشق شود پیدا ولے مجنوں نہ خواہد شد

بہار کے موسم میں اس تکیہ گاہ کی فضا اور بھی پُر کیف ہو جاتی ہے اور سیر و تماشے کے لیے یہاں آنے والوں کو عجیب لطف و انبساط کا ماحول میسر آتا ہے۔

ماہ محرم کی دسویں تاریخ کو خامسِ آل عبا کے علموں کی غسل دہی کا دن ہوتا ہے اور اس روز زائرین کا طرفہ ہجوم دیکھنے میں آتا ہے۔

مختصر یہ کہ مشربِ صلحِ کل کے اعتبار سے یہ جگہ قابلِ سیر ہے اور یہ نانک شاہی فقیر اس لائق ہے کہ اس کی صحبت میں کچھ وقت گذارا جائے۔

ذکرِ ریتی

فنِ کشتی سے دلچسپی رکھنے والے بھلے رنگیلے جوان جوق در جوق یہاں آتے ہیں، اور اظہارِ قوت کے کرشمے اور پہلوانی کے کرتب دکھاتے ہیں۔ ہر ایک جوان زور و قوت میں

اپنے سطابق کسی دوسرے پہلوان سے زور کرتا ہے اور عجیب عجیب داؤ پیچ اور طرفہ طرفہ کرتب دکھائے جاتے ہیں، جس سے تماشائی محظوظ ہوتے اور ان کے فن کی داد دیتے ہیں۔ یہاں ہر گوشہ میں ایک مجمع رہتا ہے اور ہر سمت خوش مزاجوں کی ٹولیاں بیٹھی ہوئی خوش گپیاں کرتیں اور یاران بے تکلف کی صحبت کا لطف اٹھاتی ہیں۔ یہاں شہر کے طرحدار لوگ آتے اور نظر بازان کے دیدار سے دامان نگاہ کو حسن کے پھولوں سے بھرتے ہیں۔

چوک سعد اللہ خاں

یہ چوک قلعہ معلے کے محاذ میں واقع ہے اور جلوخانہ شاہی کے سامنے کی فضا اس کے پُرشور ہنگاموں کی آماجگاہ ہے۔ سبحان اللہ یہاں مجمعوں اور اُن کے تماشائیوں کی وہ کثرت ہوتی ہے کہ نظر ان کے ہجوم میں کھو جاتی ہے اور اس قدر گوناگوں مناظر دیکھنے میں آتے ہیں کہ تمنائے دید آئینہ خانۂ حیرت میں گم ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔

خوش ادا امردوں کا رقص اس کی فضا کو قیامت آباد بنائے رکھتا ہے۔ اور ہر سمت افسانہ خانوں کے شور کے باعث یہ میدان محشرستان صوت وصدا دکھائی دیتا ہے۔ زادیان معتبر اصحاب جبہ وعمامہ کی طرح لکڑی کی منبر نما کرسیاں بچھائے ہوئے ہر مہینے اور ہر دن کی مناسبت سے تقاریر ومواعظ میں مشغول نظر آتے ہیں۔ مثلاً ماہ رمضان المبارک میں وہ روزہ داری کے فضائل بیان کرتے ہیں۔ ذی الحجہ کے مہینہ میں حج وعمرہ کے مناسک ومراسم کا بیان ہوتا ہے اور محرم کے ماہ مقدس میں روضۃ الشہداء کے مختلف مقامات و بیانات اپنی فصیح وبلیغ تقریروں کی صورت میں پیش کرکے عوام کے دلوں پر گریہ طاری کرتے ہیں اور ایک اچھی خاصی رقم ان سے بطورِ نذر وپیش کش وصول کرتے ہیں۔ بے چارے ادھر اُدھر کے لوگ بڑی عقیدت وارادت کے ساتھ ان مجمعوں میں شریک ہوتے ہیں اور سادہ طبیعت عوام ان واعظین کرام کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھتے ہیں اور بہت ذوق وشوق سے انکی باتیں

سنتے ہیں اور دو گھڑی رات تک ذکر و وعظ کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

نجومی و رمال جو اپنے فن میں کمال رکھتے ہیں۔ وہ الگ قرعہ اندازیوں، اور پیلہ سازیوں کا ہنگامہ گرم رکھتے ہیں۔ یہ لوگ عالم غیب کی مخفی باتیں بتاتے ہیں، اور اس طرح دوسروں کو مخفی قوف بناتے ہیں۔ لوگ ان کے پاس آکر اپنی قسموں کا حال پوچھتے ہیں اور ان کی جھوٹ موٹ کی باتوں پر خوش ہوکر انہیں کچھ نہ کچھ دے جاتے

انہیں مجمع لگانے والوں میں کچھ حکمت پیشہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو جگہ جگہ چھڑکاؤ کرکے فرش اور جاجم بچھاتے ہیں اور ان پر رنگ برنگے خریطوں میں بھری ہوئی قسم قسم کی دوائیوں کو بڑے سلیقہ سے رکھتے ہیں۔ سچ پوچھو تو ان کی تھیلیوں میں خاک کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، مگر یہ بڑے ٹھاٹھ باٹ کے ساتھ دکان لگاکر بیٹھتے ہیں اور بعض بعض تو پگڑی سرپیچ سے اپنے سروں کو آراستہ کیے رہتے ہیں۔ اپنی ان دواؤں کے بارے میں ایسی لچھے دار تقریریں کرتے ہیں کہ لوگ بیوقوف بن جاتے ہیں اور ان دواؤں کی خریداری میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے ہیں اور اس طرح ان کی دکانوں کے خاک بھی اٹھا کر لے جاتے ہیں۔

ہر طرح کے سفوف، قرص، معجون، حبوب اور ضماد وغیرہ ان کے پاس موجود رہتے ہیں۔ مانگنے والا جس نوع کی دوائی کا طالب ہوتا ہے، وہ اسے دی جاتی ہے۔ جہاں جنسی امراض کے علاج معالجہ کے ماہر دعویدار بیٹھے نظر آتے ہیں، وہاں پاجیوں اور رذالوں کا بڑا مجمع ہوتا ہے۔ یہاں جگہ جگہ معدنیات کے 'کشتے' بناکر بیچے جاتے ہیں اور ان سات دھاتوں کا کشتہ بناکر بیچنے والوں کی کٹھالیوں سے جو دھواں اٹھتا ہے، وہ تو آسمانوں کو بادلوں کی طرح گھیر لیتا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اپنے مقصدِ دلی کو پالے۔ کیکڑے اور اسی قبیل کے بعض دوسرے ایسے ہی جانوروں کے تیل کو ان دواؤں کا جزو اعظم کہنا چاہیے۔ یہاں اور وہاں جائیے تو ان جانوروں کی برشتہ لاشیں ان دوا فروشوں کے پاس آپ کو ملیں گی اور یہ کاروبار کرنے والے لوگ خواہشمندوں کی خدمت کرنے کے لیے وہاں موجود ہوں گے۔

اسلحہ فروش ہر قسم کے ہتھیار یہاں لا کر بے پردہ و نیام رکھتے اور خریدار کے جوہر احتیاج کو پرکھتے ہیں۔ پارچہ فروش وضع وضع کے رنگین کپڑوں کے تھان اس طرح ہاتھوں میں لیے اور کاندھوں پر ڈالے پھرتے ہیں کہ ان کی وجہ سے یہاں کی فضا شفق کے پھولوں کی طرح رنگ برنگ ہو جاتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ خریدنے والے کی نگاہ انتخاب کس پر پڑتی ہے۔

وحوش وطیور کا بازار دیکھ کر تو طائر ہوش وحشت آباد کی طرف پرواز کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اتنی رنگ برنگ کی چڑیاں، جرہ باز، کبوتر، بلبل اور دوسرے پرندے یہاں بکنے آتے ہیں کہ ان میں انتخاب کرنا مشکل ہوتا ہے، بجز اس کے کہ کسی نے منطق الطیر پڑھی ہو اور وہ شخص حضرت سلیمانؑ اور آصف برقیا کی صحبت میں رہا ہو۔ دشت و کوہ کی دنیا کو ویران کر کے ہر روز ان گنت چڑیاں یہاں پکڑ کر لائی جاتی ہیں، جنہیں ان کے شیدائی خریدتے ہیں۔ خاص طور پر تو خیر امردوں اور بے پروا نوجوانوں کا یہاں بڑا مجمع ہوتا ہے۔ تجربے کار صیّاد ان بھولے بھالے شکاریوں کی گھات میں بیٹھے رہتے ہیں اور قفس عنصری سے زیادہ خوش نما پنجروں میں ان کو پیش کر کے منہ مانگے دام وصول کرتے ہیں۔

قصّہ مختصر تمام انسانی ضرورتوں اور نفسانی خواہشوں کی تکمیل کا سامان یہاں مہیا رہتا ہے۔ چونکہ یہ جگہ قلعہ کے بالکل سامنے ہے اور امرائے شاہی کا یہاں سے گذر ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں ہر روز قیامت کا سا ہنگامہ بپا رہتا ہے۔

چاندنی چوک

یہ شہرِ شاہ جہاں آباد کا سب سے زیادہ حسین و رنگین چوک ہے اور اس کا ماحول شہر کی سب سے زیادہ ساری گذرگاہوں سے زیادہ پُر کشش ہے۔ "یہ موروثانِ شہر کی تماشا گاہ ہے۔

دہلی کے نازک مزاج اور مرزا منش لوگ، سیر و تفریح کی غرض سے یہاں آتے

ہیں۔ اس کے راستوں پر لگی اور سجی ہوئی دکانوں میں طرح طرح کے عمدہ کپڑے سجے ہوئے نظر آتے ہیں اور ہر نوع کا بیش قیمت سامان یہاں چشم خریدار کا منتظر رہتا ہے۔ دنیا جہان کی نفیس و نادر چیزیں خریدنے والوں کے درِ دل پر دستک دیتی ہیں۔ اس کا راستہ نیک بخت لوگوں کی پیشانی کی طرح کشادہ پُر نور ہے اور اس کے درمیان سے گذرتی ہوئی نہر کا پانی موتی کی سی آب رکھتا ہے۔

یہاں ہر دوکان پر بدخشاں کی طرح لعل و جواہر کے ڈھیر نظر آتے ہیں اور ہر کارگاہ میں بحرِ عمان کے دامن کی طرح موتیوں کا انبار ملتا ہے۔ ایک طرف جوہری ہیں کہ بڑی شان بے نیازی کے ساتھ تکیہ لگائے بیٹھے رہتے ہیں، اور ان کے دلال اپنی چرب زبانی سے خریداروں کے دامنِ دل کو کھینچتے ہیں اور ترغیب و تحریص کا باعث بنتے ہیں۔ دوسری طرف پارچہ فروش اور دوسری اشیاء کے تاجر ہیں، جو اپنی سجی سجائی دکانوں میں خریداروں کو بار بار بلاتے ہیں اور وہ عالم ہوتا ہے۔

بشنود یا نشنود ما گفتگوئے می کنیم

طرح طرح کے عطریات اور خوشبودار چیزوں سے اڑتی ہوئی دکانداروں اور دلالوں کے کچھ کہے بغیر اربابِ خواہش کے مشامِ جاں کو معطر کرتی ہیں۔ اسی طرح دوسری نفیس اشیاء کی موجِ شوخی بنا کسی بیع و شرا کی تمہید کے آرزوئے حصول کی سلسلہ جنبانی کرتی ہے۔ ایسی ایسی خوشنما تلواریں جن کو دیکھے تو معشوقوں کی ابروئے خمدار جھونک کھا جائے اور غفلت کے ساتھ ان کے قبضہ پر ہاتھ پڑ جائے تو مصلحت سے دست، کشی کے لیے "برہان قاطع" بن جائے۔ نئی نئی وضع کے کٹار جو زبان یار کی طرح حریف کے جویا نظر آتے ہیں۔ ان سے نگاہ بچا کر گذرنا ہی بڑی دانائی ہے۔ چینی کے برتن ایسے ہی حسین و خوش وضع کہ ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا حوصلہ کے شیشہ خانے میں پتھر پھینکنے کے برابر ہے۔ شیشے کے حقے، سونے چاندی کے نازک کام کے ایسے پیچوان کہ فلکِ حقہ باز کی آنکھوں نے بھی ان کی نظیر نہ دیکھی ہوگی۔

ادھر دیکھیے تو جام جہاں نما شراب کے پیالے اس خوش وضعی کے ساتھ دوکانوں میں آراستہ نظر آئیں گے کہ ان کی طرف نگاہ اٹھائے تو زاہد صد سالہ کا تقویٰ لوٹ جائے۔ یہاں لوگ بیچنے کے لیے ایسے ایسے قیمتی کپڑے ہاتھوں میں لیے پھرتے ہیں کہ ایسے خوبی و لطافت والے پارچہ جات۔ بڑے بڑے امیروں کے یہاں کم ہی ملیں گے، مگر انہیں یہاں کے دوکاندار اپنی دوکانوں پر سجانا اور بیچنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔

ان باتوں سے قطع نظر شام کے وقت یہاں رنگارنگ جلوؤں کی وہ کثرت ہوتی ہے کہ ان کو دیکھ کر شفق شام بھی جوشِ رشک سے موج خون میں نہا جائے، اور دیکھنے والی آنکھوں کے سامنے وہ بہار آفریں نظارے ہوتے ہیں کہ ان کی نیرنگیاں چمن کدوں کی سیر میں بھی کہاں میسّر آتی ہیں۔

یہاں کے قہوہ خانوں میں جو عین فضائے چوک میں واقع ہیں۔ شعر و سخن کے رسیا، ہر روز جمع ہوتے ہیں اور بذلہ سنجی و سخن دری کی داد دیتے ہیں۔ عالی مرتبت امرار اپنے علوئے جاہ کے باوصف یہاں سیر سپاٹے کی غرض سے آتے ہیں۔۔۔ یہاں ہر روز ایسی ایسی نفیس و نادر چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں کہ اگر کسی کے پاس قارون کا خزانہ ہو تب بھی وہ ان سب کو خریدنے اور حاصل کرنے کی آرزو نہیں کر سکتا۔ ایک نوعمر امیرزادہ اس چوک کی سیر کی ہوس اپنے دل میں رکھتا تھا۔ اس کی ماں نے اُسے بہت کچھ سمجھا بجھا کر اُسکے باپ کی چھوڑی ہوئی دولت میں سے ایک لاکھ روپیہ دیا اور کہا جانِ مادر! ہمارا پہلے جیسا زمانہ اب نہیں رہا، اس رقم میں سے جو ضرورت کی چیزیں تمہیں اچھی لگیں، خرید لینا۔

ذکرِ کیفیتِ بسنت

جس ماہ میں بسنت کا جشن ہوتا ہے، اس ماہ کی چاند رات کو قدم شریف (قدم گاہ جناب رسالت مآب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) میں عجیب مجمع دیکھنے میں

آتا ہے اور طرفہ ہنگامہ ہوتا ہے۔ اس روز صبح سویرے اہلِ شہر بہت بن سنور کر آتے ہیں اور اس بہارستان فیض کے راستوں میں دو طرفہ رنگا رنگ فرش فروش بچھاتے اور مکانوں کو طرح طرح سے آراستہ کرتے ہیں۔ بالخصوص اس بہشت کدہ کے صحن میں اور اس کے آس پاس خوشیوں اور مسرتوں کی بساط سجانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں اور قوّالوں، مجرائیوں اور زیارت کے واسطے آنے والوں کے لیے چشم براہ رہتے ہیں۔

اسی اثنا میں قوالوں اور نغمہ سرائی کرنے والوں کے طوائفے بڑی تزئین اور آرائش کے ساتھ قسم قسم کے پھولوں کے گلدستے لیے اور گل دریاجین کو خوب صورتی کے ساتھ کوزوں میں سجائے ہوئے کمال جوش عقیدت کے ساتھ نغمہ سنجی اور زمزمہ سرائی کرتے ہوئے اس مقدس و مطہر جگہ کی طرف قدم بڑھاتے ہیں۔ انہیں کے ساتھ زیارت کے لیے اس سعادت گاہ کی سمت بصد خلوص و عقیدت آنے والوں کی جماعت، ہوتی آنے والوں پر عرق گلاب اور عطر بید مشک چھڑکا جاتا ہے،

رنگین و حسین شیشوں میں بھرے ہوئے عطریات اور خوشبودار اشیاء سے لوگ ایک دوسرے کی تواضع کرتے ہیں۔ عطر بیزی و گلاب پاشی کے اس ماحول میں خوشبوؤں سے بھری اس فضا میں پری جمال حسیناؤں اور حور شمائل نازنینوں کے ہاتھوں میں بید مشک و گلاب اور بہار آفریں خوشبوؤں کے حسین و نازک شیشے دیکھ کر تماشائیوں کے حوصلوں کے شیشہ خانے سنگِ بلائے عشق سے چور چور ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور نگاہِ دور بیں اور عقلِ مصلحت اندیش کا تو جیسے یہاں گذر ہی نہیں ہوتا۔

ان لمحوں میں مشک و گلاب میں بسی ہوئی اس بارگاہ قدسی کی فضا بے حد جنوں انگیز ہو جاتی ہے، اس ہوش ربا حالت کو دیکھ کر طبیعت بے اختیار مائل بہ فریاد ہوتی ہے اور جہان آباد کے حسینوں کے جلوے تماشائیوں کے اجزائے حواس کو خاکِ گرد و باد کی طرح بکھیر دیتے ہیں۔ ایک سمت نوخیز نغمہ نواز اور شیریں ادا مطرب

اپنی مسحور کر دینے والی خوش ادائی کے ساتھ صفیں باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں، اور ساز و آواز کے ساتھ اس شفاعت گاہ میں رسم مجرا بجالاتے ہیں۔ تو دوسری طرف معمر قوالوں کے طائفے سرِ عقیدت خم کیے ہوئے نذرِ نغمہ پیش کرتے ہیں اور نغمہ و سرود کے نذرانے کو اپنی دانست میں عبادت کا درجہ دیتے ہیں۔ انہیں میں وہ سنجیدہ زائرین اور ثقہ حضرات بھی ہوتے ہیں جو خضوع و خشوع کے ساتھ سر جھکائے ہوئے درود و سلام کی ڈالیاں پیش کرتے ہیں۔

طلوعِ صبح سے لے کر عصر کی نماز کے وقت نواسنجوں اور نغمہ طرازوں کی ٹولیاں نوبت بہ نوبت حاضری کی سعادت حاصل کرتی اور مراسم مجرا بجالاتی ہیں۔ بڑی آداب شناسی کرتی ہیں۔ قریب شام کو یہ لوگ اپنے دامنِ مراد کو قبولیت کے پھولوں سے بھر کر اپنے اپنے گھروں کی طرف واپس لوٹتے ہیں۔

دہلی کی زندگی کے جشنوں، جلوسوں، میلوں جھمیلوں کی رونق ان کے سوا کچھ اور ارباب محفل بھی ہیں جو قوال ہیں، نقال ہیں، بھگت باز ہیں، رقص و سرود کی محفلوں اور عیش و نشاط کی مجلسوں کو جیتے جاگتے کردار عطا کرنے والی طوائفیں اور ڈومنیاں ہیں۔

اربابِ نشاط

اس کے حسین روپ دل آویزاں اداؤں کے مشاہدہ سے چشمِ تمنا روشن ہوتی ہے اور اس کے جمال دل آرا کے پرتو سے افسردہ خاطر رشک چمن بن جاتے ہیں۔ اس کی آواز کی ہمت آفرینی نسیم صبا کی طرح بہار آفریں ہے اور اس کے نغموں کی صدا غنچوں کے چٹکنے کی آواز کی طرح مشام جاں کو عطر آگیں کرتی ہے۔ اس کے رقص کی شیریں حرکات سے رنگ بکھرتے ہیں اور اس کے معشوقانہ ناز و غمزے دیکھنے والوں کو اپنے خوبصورت جال میں گرفتار کر لیتے ہیں۔ وہ اصحاب وجد و حال کی محفلوں کی شمع حسین اور ارباب جاہ و جلال کی مجلسوں کی فانوسِ رنگین ہے۔ اس کے حسن کی کرنیں دیکھنے والی نگاہوں کو خیرہ کرتی ہیں اور اس کے جلوؤں کے نورانی آنچل

عقل کی آنکھوں پر طلسمی پردے ڈال دیتے ہیں۔

بغیر کسی وسیلے کے اس تک رسائی کی صورت نہیں اور اس کی ملاقات کی صورت کا حصول بغیر مناسب تحائف اور تواضعات کے بہت مشکل ہے۔ خدا کرے جیسا میرا دل چاہتا ہے، اس کے مطابق اس کے حسن کی جلوہ گاہ کی سیر ممکن ہو سکے اور دست شوق اس کے دامنِ تمنا تک پہنچ سکے۔

نور بائی

نازو ادا کے چمن کی حسین کلی، اور دل عشق منزل کی قندیل آرزو کی روشنی جس کا نام نور بائی ہے۔ دہلی کی مشہور ڈومنی، رقاصہ و مغنیہ ہے۔ اس کی شان و آن کا کیا ٹھکانہ ہے کہ بڑے بڑے امراء اس کے دیدار و ملاقات کی تمنا اپنے دل میں رکھتے ں اور کچھ اُس کے دولت کدہ پر جاتے بھی ہیں۔ اس کا گھر اہلِ دولت کے محلات کی رح ہزار ساز و سامان سے آراستہ رہتا ہے۔ در و دیوار سے رنگینیاں برستی ہیں۔ اس کا رنگ تجمل اور اس کی سواری کی آن بان کا کیا کہنا۔ چاوش و چوبدار اس سواری کے آگے چلتے ہیں۔ بیشتر وہ ہاتھی پر سوار ہو کر گزرتی ہے اور امراء کے یہاں ، اس کی سواری آتی ہے تو ایک رقم جواہر سے اس کی تواضع کی جاتی ہے۔ — بیش قیمت سامان اور نقد روپیہ اس کے گھر بھیجا جاتا ہے، جو دراصل قبولِ ت، کی خوشی میں ہوتا ہے۔ رخصت کے وقت کی پیش کش کو بھی اس سے قیاس جا سکتا ہے۔ اس کی محبت کا مزا تو خانہ خرابی ہے۔ جو بھی اس کا ذوق رکھتا اور اس کی آشنائی کا نشہ جس کے سر پر سوار ہوتا ہے، وہ بے تابانہ اپنی دولت زو غبار کی طرح اڑا دیتا ہے۔ نہ جانے کتنے لوگوں نے اپنی ثروت کو اس کے ہیں نچھاور کر دیا ہے اور کتنوں کے صبر و قرار کو اس ستمگر نے لوٹ لیا ہے۔ ی شخص کی جیب روپوں سے بھری ہے وہ اس کی صحبت سے لطف اٹھا سکتا ر جب تک کہ کسی کے پاس زر و نقد موجود ہے، اس کا نخرہ گوہر تمکین کے ساتھ

ہم ترازو ہے اور اس کا رنگ و روپ پھولوں اور کلیوں کے حسن و رنگ کو شرماتا ہے۔ وہ اپنی سخن فہمی کے اعتبار سے بے نظیر ہے اور خوش گفتاری کے لحاظ سے بے مثال۔ اس کے روز مرہ کی لطافت سامع کو کوثر و نسیم کی موجوں میں ڈبو دیتی ہے اور ادائے محاورہ میں کیا کہوں کہ اس کی زبان کیا گل کرتی ہے۔

ایسا رنگین طبع معشوق اگر مل جائے تو سب، دیکھ بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ مفت ہاتھ آیا اور ایسے شوخ مزاج کی ہمدمی اگر میسر آجائے تو گویا ساری دنیا کی راحتیں مل گئیں۔ اس کی مجلس کے آداب رسوم ایسے ہیں کہ بڑے بڑے ادیب اس سے سبق لیں اور تمام حاضرین بزم نشاط کے لیے اس کی خاطر داریاں کچھ ایسی ہیں کہ بڑے بڑے دعویدار ان تہذیب و اخلاق اس سے شائستگی کے اطوار سیکھیں۔ اس کی نغمہ سنجیاں بھی لطف و انبساط سے خالی نہیں۔ ارباب موسیقی اسے پسند کرتے اور اہل نغمہ اسے دوست رکھتے ہیں۔

غزل اور ٹھمری جو اس وقت دہلی میں بے حد مقبول ہے، اس نے خوب مشق اس کی بہم پہنچائی ہے۔ وہ اپنے طائفہ کے ساتھ کہ ان میں سے ہر ایک بیگم اور خانم کہلاتی ہے شریک بزم نشاط اور محفل آرائے انبساط ہوتی ہے اور ہر ایک کی طبیعت کی مناسبت سے سفارش کرتی ہے۔ چوں کہ ہر محفل میں اس کی خاطر داریوں کو عزیز رکھا جاتا ہے، اس کے لیے جو کچھ وہ گاتی ہے، اس پر قبولیت کے زر و گوہر نثار کیے جاتے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ نور بائی جو کچھ ہے، وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، سننے سے نہیں۔ فقیر کو بھی ایک بار اس کی صحبت سے لطف اٹھانے کا موقع ملا ہے۔

چمنی

دہلی کی مشہور طوائف اور ایسی گائن ہے جس کی رسائی بادشاہ تک ہے، اور فن موسیقی میں کمال حاصل کرنے کے باعث اس کا شمار اس دور کے بہت ممتاز اہل فن میں ہوتا ہے۔ ہر جگہ اس کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، مگر اس کی

محبت بغیر کافی روپیہ خرچ کیے میسر آجائے، یہ ممکن نہیں۔ اس کی موجودگی لطفِ محفل کو بڑھا دیتی ہے۔ اس کا روزمرہ سن کر طبیعت کھل اٹھتی ہے۔ اس کے کلام میں بڑی پختگی ہے۔ چوں کہ اس کی جوانی کی رات اب بھیگ چلی ہے اور صبح پیری کے آثار نمودار ہو چکے ہیں۔ اس لیے اب اس کی صحبت کے وہی لوگ متمنی رہتے ہیں جو ذوق نغمہ رکھتے ہیں اور صدائے حسین سے محظوظ ہوتے ہیں۔ بادشاہ سلامت بھی کبھی کبھی یاد کرتے اور اس کی طرف التفات فرماتے ہیں۔ اس کے دل آویز نغمے طائرِ ہوش کو پرِ مل پرواز کرتے ہیں اور اس کی آواز کا سحر بہتی ہوئی ندی کو روک دیتا ہے اور اس کی ترانہ سنجیوں نے جیسے دوسرے موسیقاروں کے منہ میں زبان نہیں چھوڑی۔ ایک بار میں نے بھی اس کی محفل میں صبح کی ہے۔

ادا بیگم

دہلی میں ان کے بارے میں مشہور ہے کہ پاجامہ نہیں پہنتیں اور جسم کے زیریں حصہ کو قلمِ نقاش کی رنگ آمیزیوں سے اس طرح سجاتی ہیں کہ معلوم ہو پائے، جامہ پہنے ہوئے ہیں اور حقیقت یہ کہ وہی تمام گل بوٹے جو رومی کمخواب میں ہوتے ہیں، قلم سے انہیں کمال زیبائی کے ساتھ جسم پر منقش کر دیا جاتا ہے۔ وہ امراء کی محفلوں میں جاتی ہیں اور یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انھوں نے پائے جامہ نہیں پہنا یہ سب موقلم کی رنگ آمیزیاں ہیں۔ اس پردہ دری کے ساتھ بھی کبھی ان کی بے پردگی نہیں ہوئی اور کوئی شخص اس صناعی کی تہہ تک نہیں پہنچتا۔ چونکہ نظر کے یہ دھوکے ندرت سے خالی نہیں، اس لیے دلوں کو بہت مرغوب ہیں۔

بھینائے فیل سوار

(چوں کہ یہ ہاتھی پر بیٹھ کر کوچہ و بازار سے گذرتی ہے، اس لیے فیل سوار کہلاتی ہے) دہلی کی مشہور رقاصاؤں میں سے ہے اور ڈیرہ دار طوائفوں میں بڑا درجہ رکھتی ہے۔

چوب دار اس کے گھر پر نوکر ہیں۔ امراء کے ساتھ اس کے تعلقات برابری اور ہم چشمی کے ہیں۔ ان کو سفارشی رقعے لکھتی ہے اور وہ اسے قبول کر کے گویا احسان مند ہوتے ہیں۔ اس سے پیشتر اعتماد الدولہ سے اس کا خاص تعلق تھا۔ وہ اس کے گھر جاتے تھے۔ ایک مرتبہ رسمِ تواضع کے طور پر، بادہ نوشی کے ظروف و آلات جس سے مراد پیالے اور گلابی وغیرہ ہیں، اس کے یہاں بھیجے گئے۔ چوں کہ وہ سب کے سب مرصع تھے اور ان بیش قیمت ظروف کا مول ستر ہزار روپے تھا۔ اسی سے اس کے تمول کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔

خوش حال رام جنی

اعتماد الدولہ کی سرکار سے وابستہ ہے۔ عجیب آن بان کی طوائف اور کھٹّے کی مغنیہ ہے۔ جس محفل میں رقص کرنے کے لیے جاتی ہے۔ وہاں اعیان شہر اور امرائے دربار اکٹھا ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کے ناز نخرے کا یہ عالم ہے کہ یہ کسی کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتی اور کسی سے بات نہیں کرتی۔ اس کی نغمہ سرائی کا انداز بے حد دل کش ہے اور اس کی ادائیں بہت ہی بھلی لگتی ہیں۔

اس کمال شہرت کے ساتھ ساتھ محفلہائے نشاط میں اُسے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور خود ارباب نشاط اور اہلِ موسیقی میں اس کی بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے۔ کبت خوانی میں اس کا انداز قدیم کلاونتوں جیسا ہے اور اس میں بڑا رچاؤ ہے اور اس کی آواز کا اتار چڑھاؤ داستان فن کی طرح بہت مربوط اور باضابطہ ہے۔ اس کے نغمے ہر جگہ مرغوب ہیں اور اس کا رنگ و آہنگ ہر محفل میں دلوں پر سحر کرتا ہے۔ چونکہ اس کی عمر پختہ ہو چکی ہے۔ اس لیے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کے دلوں پر اس کے حسن کی پرچھائیاں دھندلی پڑتی جا رہی ہیں، لیکن جو فن کے قدردان ہیں وہ آج بھی اس پر جان دیتے ہیں اور سچ یہ ہے کہ وہ شائستہ عزت ہے بھی۔

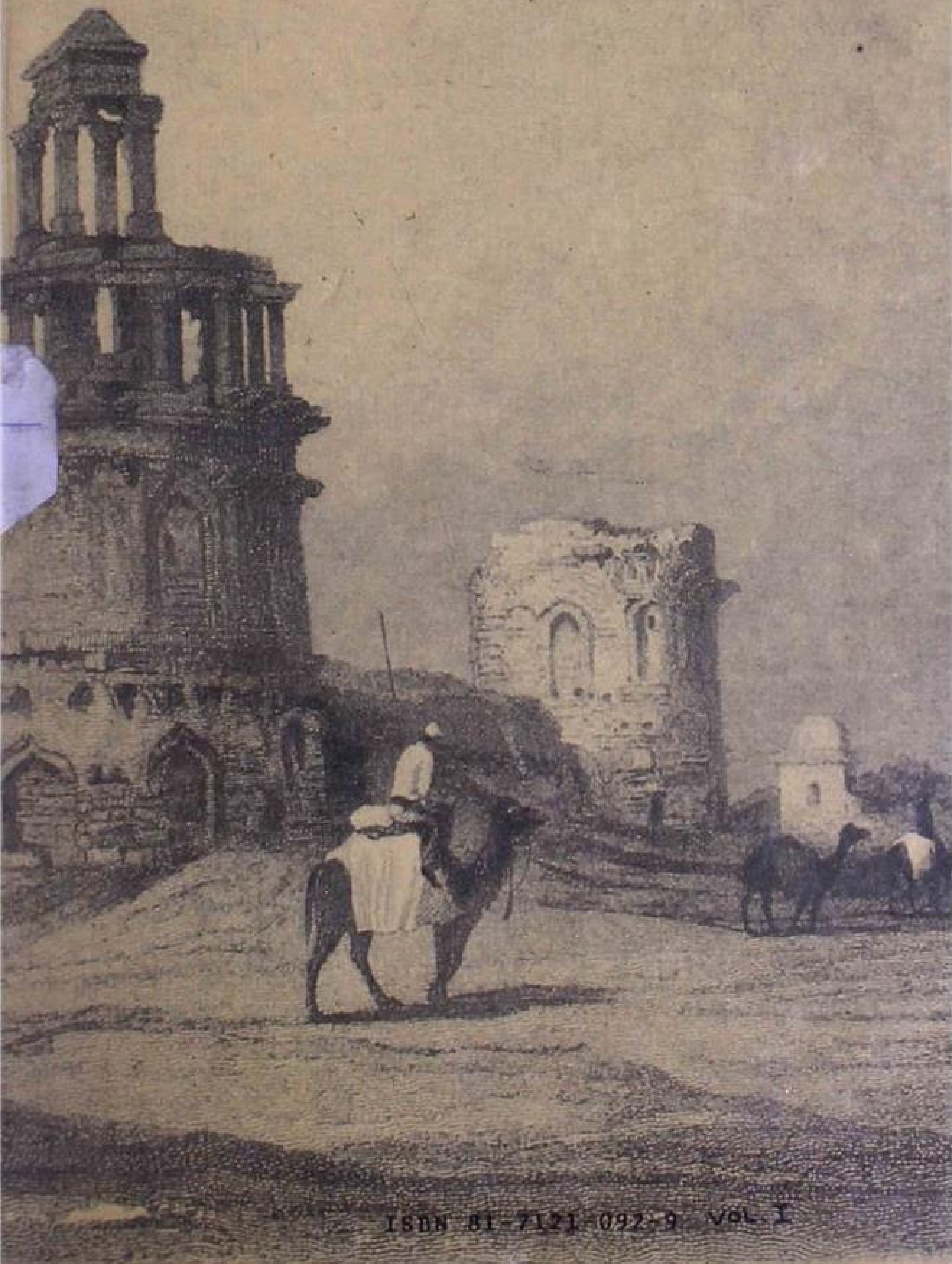
چک مک دمانی

اپنی جوانی کی بہاروں کے دنوں میں بھی بڑی شوخ طبع تھی اور چاہنے والے اس کی ایک ایک آواز پر جان دیتے تھے. خود بادشاہ جم جاہ بھی اس پر فریفتہ تھے. اور چک مک دمانی کا خطاب انہیں کا بخشا ہوا ہے. اب اس کے شباب کا سورج نشیب کی وادی کی طرف ڈھل گیا ہے۔ اب وہ بات تو باقی نہیں رہی تاہم اس کے نغموں کا گداز ہنوز سامع نواز ہے۔ اور اس کی آواز کا جادو اب بھی دلوں پر چلتا ہے۔ کبھی تو یہ دور تھا کہ ہزاروں اس کی تواضع پر صرف کیے جاتے تھے، تب وہ شب مراد آتی تھی کہ اس کی صحبت سے کوئی لطف اندوز ہو۔ اور زر و گوہر اس پر نچھاور کرے۔ لیکن اب بھی کافی رقم صرف کیے بغیر اس کے نغموں سے لطف اندوزی مشکل ہے اور اس سے آشنائی پیدا کرنا بڑی منتوں کے بعد ہی ممکن ہو سکتا ہے۔

بھگت بازوں میں تقی شعبدہ طرازانِ ہندوستان کا سرخیل ہے۔ شاہ دانیالی نقالی اور لطیفہ بازی میں بے مثال شخص ہے۔ قوالوں کے زمرہ میں رحیم خاں، دولت خاں، گیا خاں اور جٹا قوال اربابِ وجد و حال کے مجموعوں کی زینت ہیں۔

غرض کہ محمد شاہی عہد کا یہ مرقع اس دہلی کا فانوس خیال ہے، جس کے بارے میں میرؔ نے کہا تھا،

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراق مصوّر تھے
جو شکل نظر آئی ، تصویر نظر آئی !



ISBN 81-7121-092-9 VOL I